قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2019 قیمت ₹15

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

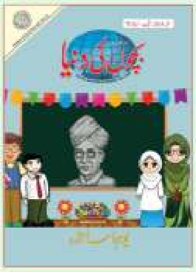

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

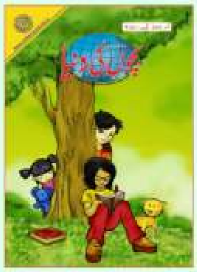

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

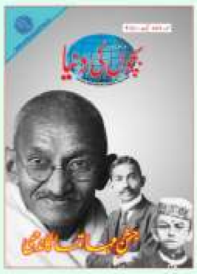

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ **اردو دنیا** دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21،شمارہ:02،فروری 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:**100**

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPULاور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhiکے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

نوجوان نسل اردو رسم الخط سے ناواقف ہوتی جارہی ہے: مرزا خلیل احمد بیگ عبدالحی 8

زبان و تعلیم

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط اکتساب شازلی حسن خان 12

نقد و نگاہ

عبدالرحمٰن بجنوری: ایک نابغۂ روزگار آفاق حسین صدیقی 14

پطرس کی مزاح نگاری مسعود جامی 19

بسنت: خسرو کی شاعری کے حوالے سے شریف احمد قریشی 22

اردو کے معاصر غیرمسلم شعرا و ادبا خان حسنین عاقب 24

جگر کی شاعری اور ان کا رنگِ تغزل سعود عالم 26

جائزہ

2018 کا فکشن: فکشن تنقید اسلم جمشید پوری 28

خراجِ عقیدت

خطوط غالب کے مختلف پہلو شبنم اسد 36

مولانا ابوالکلام آزاد اور بہار سید محمد نیر رضوی 42

مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیقی خدمات محمد راشد اقبال 48

بابِ تجزیہ

اجتبیٰ رضوی اور مرد فقیر فرحت نادر رضوی 51

غالب کی ایک غزل ابوظہیر ربانی 54

سلسلۂ صحافت

اردو زبان میں سائنسی صحافت غلام نبی کمار 56

گمنام فنکار

غلام محمد یحییٰ: اپنی ذات میں ایک انجمن قسیم اختر 59

سائنس / ٹیکنالوجی

اردو اوسی آر بصری حرف شناس مکرم نیاز 62

کمپیوٹر

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا 66

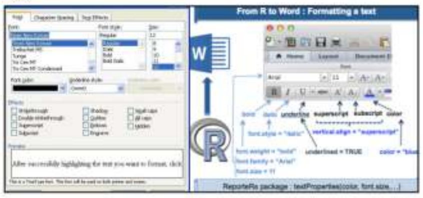

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 70

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ ادارہ 82

خبر نامہ

ہماری بات

عہد بدلتا ہے تو معاشرے کی ترجیحات اور تقاضے بھی تبدیل ہوجاتے ہیں۔ معاشرے میں دو سطحوں پر تبدیلیاں آتی ہیں۔ مثبت اور منفی۔ مثبت تبدیلیوں سے معاشرہ ترقی کرتا ہے اور منفی تبدیلیاں سماج کو مضمحل کردیتی ہیں۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے جس طرح کی تبدیلیاں ہمارے معاشرے میں آرہی ہیں ان کو بہت سے افراد جہاں مثبت زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں تو وہیں بہت سے لوگوں کے ذہن میں گلوبلائزیشن کے تعلق سے منفی تصورات بھی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے تعلق سے ایک منفی تصور یہ ہے کہ یہ ایک استعماری سازش ہے۔ جبکہ گلوبلائزیشن کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سی سطحوں پر فاصلے کم ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے ثقافتی، سیاسی اور سماجی معاملات کو سمجھنے میں آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اس وقت ہمیں ایک معروضی نقطۂ نظر سے تمام تبدیلیوں اور تغیرات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ اگر انسانی ذہن ایک ہی نقطے پر منجمد ہوکر رہ جائے تو ترقی کی ساری راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ تبدیلیاں ہی ہمیں نئی راہیں اور نئی سمتیں دکھلاتی ہیں۔

سائنسی ترقیات اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے اب ہمیں بہت سی سہولیات میسر ہیں۔ ٹیکنالوجی نے ہمارے طرز فکر اور طرز حیات کو بھی بہت حد تک بدلا ہے۔ سائنسی ترقیات سے بہت سے ذہنوں پر منفی اثرات تو پڑے ہوں گے مگر مجموعی طور پر سائنس و ٹیکنالوجی نے ہمارے لیے ارتقائی بہت سی راہیں بھی ہموار کی ہیں، دنیا کے فاصلے کم کیے ہیں، انسانوں کے درمیان رابطے کی ایک بہتر صورت پیدا کی ہے۔ خاص طور پر انٹرنیٹ نے دنیا کو اس طرح سے مربوط کردیا ہے کہ ایک ہی لمحے میں دور دراز کی خبریں بھی ہم تک پہنچ جاتی ہیں اور ہم ایک دوسرے کے احوال و کوائف سے واقف ہوجاتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جس طرح کی سہولیات پیدا کی ہیں پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

انٹرنیٹ کی وجہ سے ہمارے لیے علم و آگہی کے نئے راستے بھی کھل گئے ہیں۔ اب ہمیں معلومات یا مواد کے حصول کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر نہیں کرنا پڑتا۔ ایک کلک پر مطلوبہ معلومات تک ہماری رسائی ہوجاتی ہے۔ پہلے زمانے میں ایک کتاب کے لیے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا لیکن اب نادر و نایاب کتابوں تک رسائی بھی آسان ہوگئی ہے۔ ڈیجیٹلائزیشن نے ہماری بہت سی مشکلات کو دور کردیا ہے۔ بہت سے ادارے اور افراد اہم اور نادر کتابوں کو PDF اور دیگر شکلوں میں اپ لوڈ کررہے ہیں جس کی وجہ سے ہم معلومات کے بیش بہا خزانے تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ اس ذیل میں عالمی سطح پر بہت سے ادارے کام کررہے ہیں اور یقینی طور پر ان اداروں کی ستائش کی جانی چاہیے کہ ان کی کوششوں کی وجہ سے اب مطلوبہ کتابیں آسانی سے دستیاب ہیں۔

قومی اردو کونسل نے بھی اس سمت میں ایک اہم پیش رفت کی ہے۔ ای کتاب اور ای لائبریری کے ذریعے اب اہم کتابوں کے آن لائن مطالعے کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے یقینی طور پر اردو عوام کو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ زیادہ تر لوگ انٹرنیٹ سے جڑے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ہمارا نوجوان طبقہ اس میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ 4G نے ان کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ گاؤں دیہات میں بھی اس طرح کی سہولیات کی وجہ سے اب عام لوگوں کے لیے مطالعے کی آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کتاب گھر سے آسانی سے جڑسکتے ہیں اور اپنے ذوق کے لحاظ سے کتابوں کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے آج کے عہد میں کتابوں کے ڈیجیٹلائزیشن پر زیادہ زور دیا جارہا ہے کیونکہ کتابوں کے محفوظ رکھنے کا بھی ایک بہتر طریقہ ہے اور انسانی وراثت کے تحفظ کے لیے ایک بہتر وسیلہ بھی ہے۔

اردو زبان بھی عصری ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے اس کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے لیکن دنیا اور ہندوستان کی کچھ زبانوں نے جس طرح ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے اتنی ترقی اردو نہیں کرپائی ہے۔ بہت سی تکنیکی دشواریاں ہیں جنھیں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر دیگر زبانوں میں او سی آر کی سہولت ہے مگر اردو زبان میں ابھی کوئی بہتر صورت پیدا نہیں ہوسکی ہے اس لیے ٹیکنالوجی کی نئی ترقیات سے اردو کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کے ماہرین سے مدد لینے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اس سمت میں سنجیدہ کوشش کی جائے تو یقینی طور پر اس کے بہت مثبت اور مفید نتائج سامنے آئیں گے۔

شیخ عقیل احمد

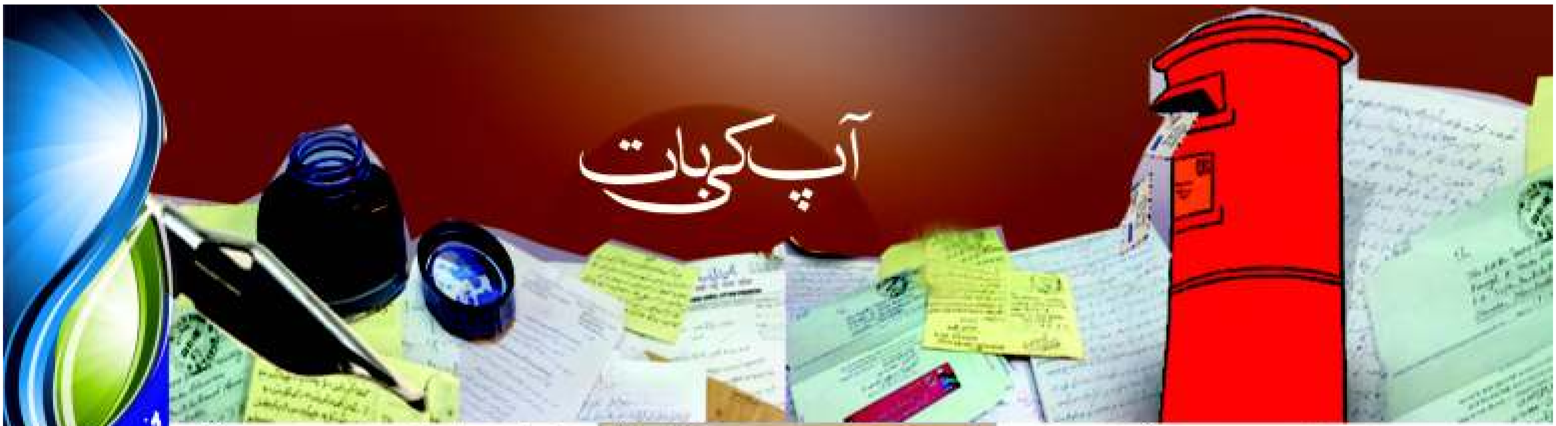

آپ کی بات

دسمبر کا شمارہ دو لاجواب مضامین کی اشاعت کے سبب یاد کیا جائے گا۔ بالخصوص گورو نانک دیو جی پر مبنی ریحان حسن صاحب کا مقالہ لائقِ صد ستائش ٹھہرتا ہے۔ اس میں تقریباً 24 شعرا کے گورو جی کی سوانح حیات سے متعلق اشعار ہیں۔ زبان و املا کے معدودے چند اغلاط ہیں۔ مثلاً اول پیرا کی تیسری چوتھی سطر میں 'لفظ اردو کے الفاظ ہی' کی بجائے 'اردو لفظ کے معنی ہی' چاہیے تھا۔ دوئم پیرا کے تحت 'نظام الدین اولیا' کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ قومی کونسل سے ہی شائع موقر کتاب 'صحتِ الفاظ' میں مصنف جناب سید بدرالحسن نے یہ صحیح درج کیا ہے کہ صوفی مذہب کے ان رہنما '' کا لقب سلطان الاولیا (جو کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں) تھا۔ ان کو صرف 'نظام الدین اولیا' کہنا غلط ہے۔' (صفحہ 142)۔ اسی مضمون میں یہ بات بھی درج کرنی درکار تھی کہ بالخصوص سکھ صاحبان یہ متبرک نعرہ لگایا کرتے ہیں ''واہِ گورو جی کا کھالسہ (خالصہ)، واہِ گورو جی کی فتح۔'' اس میں پنجابی زبان کے 'دا' اور 'دی' الفاظ کے بجائے 'کا' اور 'کی' ہندی اور اردو الفاظ کا استعمال بھی قومی یکجہتی کی علامت ہے۔

شاعر و مضمون نگار جناب اسد رضا نے بقول علامہ اقبال امام الہند شری رامچندر جی کی بابت شعرا و شاعرات کے تقریباً 14 ناموں کا شمار کرتے ہوئے ڈاکٹر بانو سرتاج کے 16 صفحات پر محیط مضمون 'اردو شاعری میں شری رام' (کتاب 'قومی یکجہتی اور اردو شاعری') کو فراموش کر دیا ہے۔ اسی طرح اس مقالے میں شری رام کی بابت بلند پایہ نظموں کی تخلیق کرنے والے ان شعرا مثلاً سلام مچھلی شہری، ظفر علی خان، حسین اچل پوری، سلام سندیلوی، سید افضل جعفری، سرور جہان آبادی، ڈاکٹر شباب للت، منور لکھنوی، جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ آخری شاعر کا یہ شعر ''نہ وہ رام کی تمکنت اور وقار، نہ لکشمن کی الفت، نہ سیتا کا پیار۔'' طنز ہے۔ اسی مضمون میں گوسوامی تلسی داس جی کے شہرۂ آفاق صحیفے کا صحیح نام ہے 'شری رام چرت مانس'، درج نام میں 'چرتر' (ص 17) 'لفظ کا غلط استعمال ہو گیا ہے۔ اسی صفحے پر 'تصویر کشی' لکھنے کے بعد 'کھینچی ہے الفاظ کی جگہ 'کی ہے' صحیح ہوتا۔

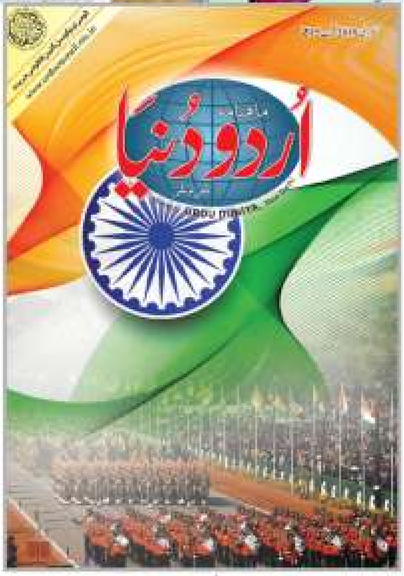

ندا فاضلی صاحب کی شاعری پر مبنی محترمہ معصوم زہرا کا تحقیقی مضمون از حد موقر، اعلیٰ و ارفع ہے اور اس میں درج کردہ تمام تر حقائق صد فی صد درست ہیں۔ ص 65 پر ہندی فلم 'آپ تو ایسے نہ تھے' کا نام تو لیا گیا ہے، لیکن موصوفہ دلکش نغمے کے بول لکھنا فراموش کر گئی ہیں۔

کرشن بھاؤک: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک، پٹیالہ، پنجاب

اردو دنیا کا تازہ شمارہ ملا شکریہ۔ اردو دنیا ایک ایسا رسالہ ہے جو آج گھر گھر میں مقبول ہے اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان سبھی رسائل میں نئے لکھنے والوں کو بھی چھاپا جاتا ہے۔ اس شمارے میں آپ کا اداریہ بہت خوب ہے۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ آج بھاشائیں دن بہ دن ختم ہوتی جا رہی ہیں صرف اردو ہی نہیں بلکہ سبھی بھاشاؤں کا یہی حال ہے۔ آج ہر صوبے میں انگریزی بھاشا پھیلی ہوئی ہے جبکہ ہم یہ تو بھول ہی گئے کہ انگریزی والوں نے سارے آئیڈیاز اردو سے ہی لیے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب پر ایک سے بڑھ کر ایک مضامین ہیں۔ ویسے تو ایوان اردو اور بہت سے رسائل نے ان پر نمبر شائع کیے، لیکن اردو دنیا کا بھی جواب نہیں۔ منظور وقار صاحب کا مضمون 'طنز و مزاح کا عہد زریں' بہت اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ غضنفر اقبال کا مضمون بھی بہت پسند آیا۔ محمد شارب کا قاضی عبدالستار صاحب پر اچھا مضمون ہے۔ قاضی عبدالستار تو ایسے کامیاب ناول نگار تھے جس کی مثال دیکھنے کو ہی بہت مشکل سے ملتی ہے۔ تبصروں میں سید منصور آغا، لئیق رضوی اور ڈاکٹر شمیمہ اختر کی کتابوں پر تبصرے بہت خوب ہیں۔

استوتی اگروال: اگروال جیولرز، سرونج مدھیہ پردیش

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی اپنی عمر کے 20 سال مکمل کر رہا ہے۔ جس دن سے اس کا اجرا عمل میں آیا اس میں ہر سال نئی تبدیلیاں آتی گئیں اور ڈائرکٹرس کی تبدیلی نے بھی اسے خوب سے خوب تر بنا دیا کیونکہ یہ رسالہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم حکومت ہند کے زیر نگرانی شائع ہوتا ہے۔ جس کے ناشر طابع ڈائرکٹر ہیں اور وہی مدیر بھی ہوتے ہیں۔

نومبر 2018 کا شمارہ نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی ادارت میں پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہ ان کی ادارت میں پہلا شمارہ ہے۔ ہماری بات کے تحت انہوں نے بہت سی باتیں کہیں وہ لکھتے ہیں کہ: ''بہت سے ایسے امکانی علاقے ہیں جہاں اردو کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ اب کوشش کی جائے گی کہ اردو ان علاقوں تک بھی پہنچے۔ اور وہاں اردو کی تعلیم و تدریس کا بہتر انتظام ہوگا۔''

ساتھ ہی انھوں نے اردو دنیا میں شخصی نوعیت کے انٹرویو میں فروغ اردو کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اگر یہی جذبہ کارفرما رہا تو اردو کے لیے نئے راستے وا ہوں گے۔

محبوب خاں اصغر نے قطب سرشار سے جو انٹرویو لیا ہے وہ معلوماتی ہے۔ انھوں نے نئے گوشوں پر اپنے سوالات کے ذریعے ان کی شخصیت اور ادبی دنیا میں ان کی تخلیقات کے حوالے سے نئے نئے انکشافات کیے ہیں۔ یقیناً ترجمہ کے فن میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ ترجمہ ایک وجدانی عمل ہے۔ سوال کی اہمیت پروجیتا پرویز کا مضمون اساتذہ کے لیے لمحہ فکریہ ہے اور انھوں نے طلبہ میں حصول تعلیم کے دوران سوالات

پوچھنے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پر انجم پروین نے عمدہ لکھا ہے۔ صفی لکھنوی اپنے دور کا ایک ممتاز شاعر معلوماتی مضمون ہے حکیم عبدالناصر فاروقی نے اچھا تجزیہ کیا۔ یہ شعر بھی صفی کا ہی ہے۔

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

دکن میں صفی اور تنگ آبادی بھی پرگو شاعر تھے۔ شمال کی طرح جنوب کے شعرا پر بھی تحریریں شائع ہوں تو دکن کے بے شمار شعرا کا تعارف ہو جائے گا۔

ناموران نومبر کے تحت اس میں نیر مسعود کی افسانہ نگاری، اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنزیہ مزاحیہ عناصر، اسماعیل میرٹھی کی نظم بارش کا پہلا قطرہ کی نئی قرأت بچوں کے ناول نگار کرشن چندر، ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار مولانا ابوالکلام آزاد اور اقبال کی نثر ہے۔ اس ماہ میں اور بھی نامور موجود ہیں ان کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ نقد و نگاہ کے عنوان سے 6 مضامین لالہ مادھورام جوہر، ہندو ذولسانی شعر پر ایک نظر (محمد یحییٰ جمیل) جاں نثار اختر کی طویل نظمیں (صدیق محی الدین) صفی لکھنوی وعبدالناصر فاروقی) ڈپٹی نذیر احمد کے مکتب میں سائنس کی تعلیم وارشادات نسیم) خراج عقیدت کے تحت علامہ شبلی اور ملا واحدی (محمد الیاس الاعظمی) تاریخ و ثقافت میں منیر شریف کی چھوٹی بڑی درگاہوں کی تاریخی اہمیت چراغ ولی: اورنگ آباد کے صوفیائے عظام (قاضی نوید احمد صدیقی) ہم نے جنھیں بھلا دیا۔ اختر ظہیری ایک گمنام ادبی شخصیت (سید ابوذر علی) زاہر حیدری احمد یوسف رضا۔ عالمی ادبیات: کیٹس کا شاہکار (منظر نیاز) ماحولیات: ماحول اور موسمی تبدیلی (رفیع الدین ناصر) فنون لطیفہ: ہندوستانی موسیقی میں پرانے فلمی نغموں کا مقام (نثار راہی) سلسلہ صحافت: پختون رہنما خان بخاری کابلی (اوم پرکاش سونی) کمپیوٹر۔ ایم ایس آفس کتابوں کی دنیا تعارف وتبصرہ عالمی اردو نامہ خبر نامہ اردو دنیا کی خبریں 100 صفحات میں ہر ذوق کے فرد کے لیے وہ مواد موجود ہے۔ جو وہ چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پرچہ ہر خاص و عام میں مقبول ہے۔ مگر اس کی رسائی صرف خریداروں اور چندہ کنندوں تک ہے۔ اس کو ریلوے اسٹیشنوں، بس اڈوں کے علاوہ ہر شہر کے کتب فروشوں کو فراہم کرنا چاہیے۔ کیونکہ حیدرآباد میں اس کا آفس اتنی اندر ہے کہ ایک کمزور آدمی کی وہاں تک رسائی ہونے کے باوجود نفی میں جواب ملتا ہے۔ اس کا ایک مرکز عام شاہراہ پر ہوتا کہ اس کے ساتھ اردو کتابوں تک عام قاری پہنچ سکے۔ یہ رسالہ صرف -/15 روپے سالانہ -/100 روپے میں فروغ اردو بھون نئی دہلی یا پھر شعبہ فروخت نئی دہلی 011-26109746 سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد کے لیے 040-20915194 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

❖ **ڈاکٹر م ق سلیم**: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

سال 2018 کے آخری ماہ کا اردو دنیا ملا۔ ہماری بات کے تحت اردو زبان کے فروغ و بقا کے تعلق سے اداریہ اطمینان بخش ہے۔ بالخصوص ہماری بات کا دوسرا پیراگراف انتہائی قابل غور ہے۔ جس کے دل میں اردو کی بے پناہ محبت ہوگی وہی اردو سے متعلق اتنی کارآمد گفتگو کرے گا۔ مدیر محترم کا یہ جملہ خوب ہے ملاحظہ فرمائیں ''اگر ہماری زبان کسی اور غالب زبان کا حصہ بن گئی تو پھر ہمارا تاریخی، تہذیبی سرمایہ ختم ہو جائے گا۔''

ہم اپنی ریاست بہار کے اردو روزناموں میں عقیل صاحب کے حوالے سے خبریں اکثر پڑھتے رہتے ہیں جن کو پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔

❖ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ، بہار

ماہ نومبر کے اداریہ میں مختلف گوشوں پر اردو کے تعلق سے مفید اور کارآمد باتیں رقم کی گئی ہیں اور بہت سارے نکات پر لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے محبان اردو سے مشورے طلب کیے گئے ہیں جو ایک اچھی کوشش ہے۔ دور اندیش اور تعلیم سے خصوصی شغف رکھنے والا ذمے دار شخص کئی جہات پر اپنا دائرہ کار بڑھاتا ہے اور باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے تاکہ اردو زبان کے مزید نکھرنے کے امکانات پیدا ہو سکیں۔ اپنے ادارے میں ڈائرکٹر صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ ''آج ہندی اور دوسری زبانوں کے بہت سے ایسے شعرا و ادبا ہیں جو صرف شاعری کے وسیلے سے اردو زبان سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ اردو میں غزل کہنے کے لیے نہ صرف اردو زبان سیکھ رہے ہیں بلکہ بحور اور اوزان کی بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔''

اردو کے مایہ ناز ناول نگار جن کا آج تک کوئی ثانی پیدا نہ ہوا، کا ذکر کر کے میرے دل کو باغ باغ کر دیا۔ رقم کرتے ہیں ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں نے بہت سے لوگوں کو اردو زبان سیکھنے پر مجبور کیا تھا اسی طرح آج اردو شاعری بھی دوسری زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کو اردو سیکھنے کے لیے مہمیز کر رہی ہے۔ ایک خوش آئند بات ہے کہ جو فنکار دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی رسائی مرکز تک نہیں ہو پاتی اور اندیکھی کی وجہ سے حقیقی انعام واکرام کے مستحق ہونے کے باوجود محروم رہ جاتے ہیں۔ ہر اچھے اور صحیح کام کی شناخت ہونا چاہیے۔ ہم دعا گو ہیں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد صاحب اپنی ذمے داریوں کو بحسن وخوبی نبھاتے ہوئے اردو کی ترویج وترقی میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں گے۔

❖ **محمد فیاض**: معاون ایڈیٹر، سالنامہ صدف، اینگلو انڈیا جوٹ مل لائن جگتدل 24 پرگنہ (شمال) مغربی بنگال

اکتوبر 2018 کا شمارہ بروقت ملا۔ یہ شمارہ بہت سارے مضامین کا حسین امتزاج ہے۔ سرسید کے پنجاب کے پانچ سفر، مہاتما گاندھی کا تصور امن و آشتی، سلیمان اطہر جاوید کو خراج عقیدت اور محترم قدوس جاوید کا مضمون شاعر کشمیر مجہور اور اردو غزل بہت ہی پسند آئے۔ سب سے بڑی بات بی ایڈ پروگرام میں میرے استاد مکرم ڈاکٹر ریاض صاحب کا زبان وتعلیم کے عنوان تلے ادب اطفال کے درسی مسائل۔ موصوف نے اس مضمون میں اردو نثر و نظم اور ادب اطفال پر تجزیاتی حقائق بیان کیے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر غالب تک بچوں کے حوالے سے ان کی نظموں کا تعارف پیش کیا۔ جدید تعلیمی پالیسی کا گہوارہ مشترکہ پنجاب کو قرار دیا۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی خدمات کا ذکر فرمایا۔ شاید استاد محترم کی نظر میں ہندوستان کے وسیع ترین اشاعتی ادارے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی کا نام آنے سے چوک گیا جو اردو زبان کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دے رہا ہے۔ ادب اطفال میں ادارے کے سابق روح رواں افضل حسین اور اشفاق صاحب کے اسمائے گرامی آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ درجہ ہشتم تک مدون یہ نصاب اردو زبان میں سماجی علوم، تاریخ، جغرافیہ عربی ریاضی اور اسلامیات کا احاطہ کرتا ہے۔ نہایت ہی دلچسپ اور بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے۔ مرحوم افضل صاحب اس ادارے میں آنے سے قبل بی ایڈ کالج میں پرنسپل تھے۔ وہاں سے اسلامی درسگاہ رامپور آئے اور نصاب کی تدوین کا کام انجام دیا۔ اساتذہ کے لیے ان کی کتاب فن تعلیم وتربیت کافی پسند کی گئی ہے۔ اردو میں ہماری کتاب، اخلاقی کہانیاں، عام معلومات اور سجاد ین کی زبان اس قدر شیریں ہے کہ انسان آج بھی اس حلاوت کے لیے ترستا ہے۔

❖ **عبدالرشید ٹھاکر**: حاسیڈار، ورینگ، رحمت ناگ، جموں وکشمیر

انٹرویو

عبدالحی

نوجوان نسل اردو رسم الخط سے ناواقف ہوتی جارہی ہے

مرزا خلیل احمد بیگ

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں بطور صدر شعبہ اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ مسعود حسین خاں جیسے دانشور اور ماہر لسانیات کی شاگردی میں انھوں نے لسانیات اور اردو زبان کی تاریخ جیسے موضوعات پر کافی دسترس حاصل کی۔ ان کی کتابیں 'ایک بھاشا' جو مسترد کردی گئی، 'لسانی مطالعے' وغیرہ کافی مقبول ہوئی ہیں۔ انھوں نے اے ایم یو سے لسانیات میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد دکن کالج پونے اور امریکہ کی یونیورسٹی آف ناکس ول سے بھی لسانیات اور اس سے متعلق دیگر نکات کی ٹریننگ حاصل کی۔ اردو زبان کے حوالے سے انھوں نے بہت ہی اہم نکات پر گفتگو کی ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات قارئین کی نذر ہیں:

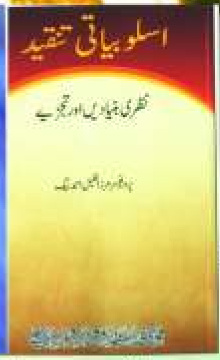

عبدالحی: لسانیات جیسے خشک موضوع کی طرف آنے کا خیال کیسے آیا؟

مرزا خلیل احمد بیگ: ایم اے (انگلش) میں میرا اختیاری پرچہ انگریزی زبان ولسانیات تھا۔ اس پرچے میں میرے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ یہ پرچہ انگلش کے ایک لائق استاد پروفیسر منیر احمد نے ہمیں پڑھایا تھا جو کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور ماڈرن لنگوسٹکس کے بھی ماہر تھے۔ ان کا تعلق بھی گورکھپور سے تھا۔ چنانچہ انھیں کی تحریک پر میں نے لسانیات میں ایم اے کرنے کا ارادہ کرلیا۔ لسانیات کا شعبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نیا نیا قائم ہوا تھا اور اس کے بانی صدر (Founder Chairman) پروفیسر مسعود حسین خاں تھے جو بنیادی طور پر تو اردو کے استاد تھے، لیکن انھوں نے انگلستان اور فرانس میں رہ کر جدید لسانیات (Modern Linguistics) کی تربیت حاصل کی تھی اور پیرس یونیورسٹی سے 1953 میں لسانیات میں ڈی لٹ (D.Lit) کی ڈگری لی تھی۔ میرا ایم اے (لسانیات) کا جب نتیجہ نکلا تو میری فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن تھی۔ مجھے فوراً ریسرچ میں داخلہ مل گیا اور مسعود حسین خاں ہی میرے پی ایچ ڈی (Ph.D) کے مقالے کے نگراں مقرر ہوئے۔ مجھے 1976 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ شعبۂ لسانیات کی پہلی پی ایچ ڈی تھی۔

ع ح: آپ مسعود حسین خاں کی علمی ولسانیاتی روایات کو زندہ رکھنے میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں اور لسانیات کے میدان میں آپ کی کیا خدمات ہیں؟

مرزا خلیل احمد بیگ: لسانیات بالخصوص اردو لسانیات کو فروغ دینے میں مسعود حسین خاں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کا سب سے بڑا لسانیاتی کارنامہ ان کی تحقیقی تصنیف 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' ہے جس میں انھوں نے اردو زبان کی پیدائش اور اس کے عہد بعہد ارتقا کا تاریخی وتقابلی لسانیات کی روشنی میں مفصل جائزہ پیش کیا ہے اور آغاز اردو کے ایک ایسے نظریے کی تشکیل کی ہے جو سب سے قابل قبول نظریہ (Most acceptable theory) ہے اور جسے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی چیلنج نہیں کیا جاسکا ہے۔ میں نے اسی موضوع پر ایک کتاب 'اردو کی لسانی تشکیل' شائع کی اور ان کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس کتاب کے اب تک چار ایڈیشن اور متعدد ری پرنٹس نکل چکے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے دوسرا قابل قدر کارنامہ لسانیات کی ایک شاخ صوتیات کے ضمن میں انجام دیا ہے۔ انھوں نے برطانوی ماہر لسانیات جے آر فرتھ (J.R. Firth) کے پیش کردہ نظریۂ عروضی صوتیات (Prosodic Phonology) کی روشنی میں پہلی بار اردو لفظ کا صوتیاتی و تجزصوتیاتی مطالعہ پیش کیا جو A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu کے نام سے شائع ہوا اور جس کا میں نے اردو میں ترجمہ کیا۔ مسعود صاحب کی اس روایت کو زندہ رکھتے ہوئے میں نے صوتیات اور لفظ سے آگے کی منزل نحو اور قواعد کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اردو زبان کی تاریخی قواعد لکھی جو اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھی تھی۔ مسعود حسین کو اسلوبیات (Stylistics) سے، جو اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics) کی ایک شاخ ہے، بیحد دلچسپی رہی ہے، چنانچہ اس ضمن میں بھی انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ اسلوبیات کو اردو میں متعارف کرانے کا سہرا مسعود حسین خاں ہی کے سر ہے۔ اسی لیے انھیں اردو میں اسلوبیاتی تنقید کا بنیاد گزار کہا گیا

ہے۔ میں نے مسعود صاحب سے تحریک پاکر 1970 کی دہائی سے اسلوبیاتی موضوع پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ گذشتہ 40 سال کے دوران میں اس موضوع پر لکھے ہوئے میرے مضامین کا مجموعہ 'اسلوبیاتی تنقید : نظری بنیادیں اور تجزیے' کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) کی جانب سے 2014 میں شائع ہوا۔ مسعود صاحب اردو تحریک کے بھی فعال قلم کار رہے ہیں۔ انھوں نے ہفت روزہ 'ہماری زبان' (نئی دہلی) اور بعض دیگر رسائل میں اردو تحریک اور اردو کے لسانی مسائل سے متعلق وقتاً فوقتاً بے شمار مضامین لکھے۔ جب وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری تھے تو انھوں نے انجمن کے ترجمان 'ہماری زبان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کے اداریے قلم بند کیے جن میں اردو کی لسانی صورت حال اور اس کے فروغ میں درپیش مسائل کا نہایت بے باکی کے ساتھ ذکر کیا۔ میں نے ان مضامین اور اداریوں کو مرتب کر کے کتابی صورت میں 'اردو کا المیہ' کے نام سے 1973 میں شائع کیا۔ مسعود صاحب نے 1961 اور 1971 کی ہندوستان کی مردم شماری کی لسانی رپورٹ کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی اردو آبادی کے اعداد وشمار مرتب کیے جس کی رو سے اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان (Major Language) قرار پائی۔ انھوں نے صوبائی سطح پر اور بعض صوبوں کے اضلاع کی سطح پر بھی اردو آبادی کے اعداد وشمار پیش کیے اور اردو کے سب سے آباد اضلاع (بہ لحاظ تناسب آبادی) کی نشان دہی کی جس سے ہندوستان میں اردو کی اس وقت کی لسانی صورت حال کی تصویر بالکل واضح ہوگئی۔ اردو کے یہ تمام اعداد وشمار انھوں نے 'ہماری زبان' میں شائع کر دیے۔ میں نے مسعود صاحب کے اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے 1981 کی ہندوستان کی مردم شماری کی لسانی رپورٹ پر اردو کے حوالے سے کام کیا، لیکن اس کام کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے میں نے اس میں ہندی کو بھی شامل کر لیا۔ میرے اس مطالعے سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ اگر چہ 1981 کی مردم شماری میں بھی اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان قرار دی گئی ہے، لیکن اس کے بولنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور یہ تعداد جو 1971 میں دو کروڑ چھیاسی لاکھ تھی، 1981 میں بڑھ کر 3 کروڑ 49 لاکھ ہوگئی۔ علاوہ ازیں مردم شماری کی رو سے اردو اتر پردیش، بہار، کرناٹک، آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور مغربی بنگال میں متعلقہ علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کے تناسب کے لحاظ سے دوسری علاقائی زبان کے طور پر ابھری۔ مردم

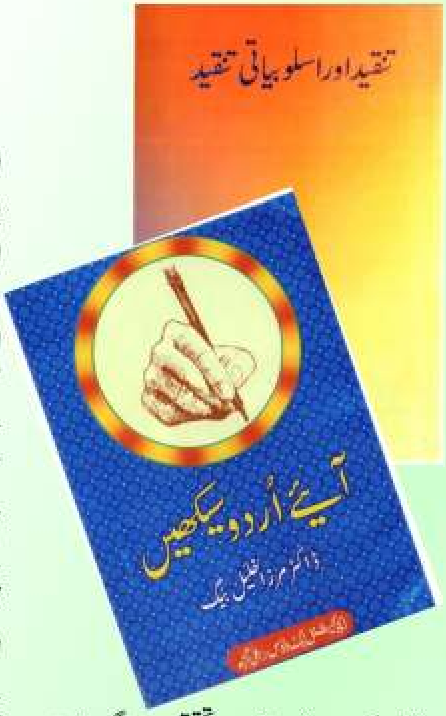

شماری کے اعداد وشمار پر مبنی میرا یہ تحقیقی مطالعہ انگریزی میں کتابی صورت میں 1996 میں شائع ہوا، لیکن اس کی تلخیص میں نے ایک سال بعد اردو میں بھی بہ عنوان ''اردو اور ہندی کا سماجی لسانیاتی تناظر'' شائع کی۔ مسعود حسین خاں نے حیدر آباد میں اپنے قیام کے دوران میں کئی قدیم متون (بشمول دکنی متون) کی تدوین کا کام بھی انجام دیا تھا اور دکنی اردو کی ایک لغت بھی ترتیب دی تھی، لیکن ان دونوں علمی کاموں کی جانب میں بوجوہ توجہ نہ دے سکا۔ اگر چہ میری عمر اب 70 سال سے تجاوز کر چکی ہے، لیکن مجھ میں حوصلۂ قلم ورقم ابھی باقی ہے اور اگر مجھے موقع ملا تو مسعود صاحب کی ان علمی روایات کو بھی میں آگے بڑھانا چاہوں گا۔

جہاں تک کہ میری لسانیاتی خدمات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس شعبۂ علم سے متعلق میری اب تک 12 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے تین کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے تین مرتبات، دو مونوگراف اور ایک ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ لسانی موضوعات پر اردو اور انگریزی میں لکھے ہوئے میرے مضامین کی تعداد 100 کے قریب ہے۔ میں نے لسانیات کے جن پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے ان میں تاریخی لسانیات، توضیحی لسانیات، سماجی لسانیات، نفسیاتی لسانیات اور اسلوبیات خاص ہیں۔ تاریخی لسانیات کے ضمن میں اردو کے آغاز وارتقا پر لکھی ہوئی میری کتاب 'اردو کی لسانی تشکیل' کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب پہلی بار آج سے 30 سال قبل 1985 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کے دو اور ایڈیشن نکلے۔ اس کا چوتھا ایڈیشن 2008 میں شائع ہوا جس میں کافی ترمیمات اور اضافے کیے گئے۔ اس کے بعد سے اس کے کئی ری پرنٹس شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے ایم اے (اردو) کے نصاب میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں سول سروسز امتحانات میں شریک ہونے والے وہ طلبہ بھی جو اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں، اس کتاب سے ہر سال خاطر خواہ استفادہ کرتے ہیں۔

تاریخی لسانیات (Historical Linguistics) سے متعلق میری دوسری کتاب اردو زبان کی تاریخی قواعد ہے جو Urdu Grammar : History and Structure کے نام سے 1988 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اردو کے قواعدی ڈھانچے میں عہد بہ عہد جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کا یہ مفصل تحقیقی مطالعہ ہے۔ اس میں سنہ 1200 سے لے کر میر تقی میر کی وفات (1810) تک کے تحریری مواد کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ سماجی لسانیات (Sociolinguistics) سے متعلق میری کتاب انگریزی میں Sociolinguistic Perspective of Hindi and Urdu in India کے نام سے 1996 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب سماجی لسانیاتی تناظر کے حوالے سے ہندوستان میں اردو اور ہندی کی لسانی صورت حال کا مکمل جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس میں پیش کردہ اردو اور ہندی کے اعداد وشمار 1981 کی مردم شماری کی لسانی رپورٹ پر مبنی ہیں۔ لسانیات کی ایک دوسری جہت جس سے مجھے دل چسپی رہی ہے نفسیاتی لسانیات (Psycholinguistics) ہے۔ اس موضوع پر میری کتاب Psycholinguistics and Language Acquisition ہے جو 1991 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ اردو کے حوالے سے اکتسابِ زبان کے تدریجی عمل پر غالباً پہلی کتاب ہے۔ یہ مطالعہ حقیقی مواد (Real data) پر مبنی ہے جو ایک ایسی بچی سے حاصل کیا گیا ہے جس نے ابھی اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا، جسے اصطلاحاً 'Pre-school going child' کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ اطلاقی لسانیات کی شاخ 'اسلوبیات' جسے 'اسلوبیاتی تنقید' بھی کہتے ہیں، میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق میری تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں: 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' (1983، دوسرا ایڈیشن 2011)، 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' (2005)، اور 'اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے' (2014)۔ اسلوبیاتی تنقید درحقیقت لسانیاتی مطالعۂ ادب ہے جس کا بنیادی تصور 'اسلوب' ہے، اور اسلوب ادب میں زبان کے مخصوص ومنفرد استعمال سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اسلوبیاتی نقاد ادبی فن پارے کا

لسانیات کی مختلف سطحوں (صوتی، صرفی، نحوی معنیاتی، قواعدی) پر تجزیہ کرتا ہے اور ہر سطح پر اس کے اسلوبی خصائص (Style - features) کو نشان زد کرتا ہے۔ اس مطالعے اور تجزیے میں ذاتی پسند یا ناپسند کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اور نہ اسلوبیاتی نقاد مصنف کے سوانحی کوائف سے کوئی سروکار رکھتا ہے۔ یہ مطالعہ و تجزیہ خالص معروضی ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کے داخلی یا تاثراتی عنصر کو شامل ہونے نہیں دیا جاتا۔ اس اندازِ نقد میں اقداری فیصلوں سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔ اسلوبیاتی تنقید سے متعلق میری تینوں کتابوں میں یہی اندازِ نقد اختیار کیا گیا ہے۔ میں نے اردو کے لسانی مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ میرے اس نوع کے مضامین میرے دو مجموعوں میں شامل ہیں: (1) 'لسانی تناظر' (1977) اور (2) 'لسانی مسائل و مباحث' (زیرِ طبع)۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاصر ادبی تنقید لسانیاتِ جدید سے گہرے طور پر متاثر ہوئی ہے۔ اسلوبیات کا ذکر پہلے آ چکا ہے جس کی بنیاد لسانیات پر قائم ہے۔ علاوہ ازیں نئے تنقیدی نظریات مثلاً ساختیات وپس ساختیات کا بھی تعلق لسانیات سے بہت گہرا ہے۔ اس سے قبل روسی ہیئت پسندی کے ارتقا میں بھی زبان نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے بعد جب امریکہ میں آئی۔اے۔ رچرڈز (I.A.Richards) نے عملی تنقید کی بنیاد ڈالی تو اس کے پسِ پردہ زبان ہی تھی۔ بیسویں صدی کے دوران میں نئی ادبی تھیوری اور نئے تنقیدی رویوں کے ارتقا میں لسانیات کے ابوالآبا فرڈی نینڈ ڈی سسیور (1857-1913) کے تازہ لسانی افکار اور فلسفۂ لسان کو خاص دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تنقید کے لسانی مضمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لسانیات ہی کے وسیلے سے میں نے معاصر ادبی تنقید تک رسائی حاصل کی اور نئے تنقیدی رویوں اور میلانات و رجحانات سے متعلق ایک کتاب موسوم بہ 'ادبی تنقید کے لسانی مضمرات' تصنیف کی جو 2012 میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔

ع ح: اردو کی ابتدا اور ارتقا پر مختلف محققین کی اپنی آرا ہیں۔ آپ کے استاد مسعود حسین خاں نے بھی اردو کی ابتدا پر اپنا نظریہ پیش کیا تھا۔ آپ کس نظریے سے اتفاق رکھتے ہیں؟ کیا آپ کا اپنا بھی کوئی نظریہ یا تحقیق ہے؟

مرزا خلیل احمد بیگ: آپ نے بالکل درست فرمایا۔ محمد حسین آزاد سے لے کر مسعود حسین خاں تک کئی ادیبوں اور محققوں، نیز ماہرینِ لسانیات نے اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے بیش تر نظریات جدید لسانیات کی روشنی میں رد کیے جا چکے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی کا یہ کہنا کہ اردو کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا، محض قیاس آرائی ہے، یہ کوئی نظریہ نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی لسانیاتی حقیقت ہے۔ اسی طرح دکن میں اردو کے پیدا ہونے کا خیال، جسے نصیر الدین ہاشمی اور آمنہ خاتون نے پیش کیا تھا، محض مفروضہ ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے 1928 میں اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا جسے شیر علی خاں سرخوش اپنے

تذکرے 'اعجازِ سخن' میں پانچ سال قبل پیش کر چکے تھے، لیکن مسعود حسین خاں نے اس نظریے کو رد کرتے ہوئے اردو کے آغاز کا اپنا ایک الگ نظریہ پیش کیا جس کی رو سے اردو 1193 میں مسلمانوں کی فتحِ دہلی کے بعد دہلی و نواحِ دہلی میں پیدا ہوئی جس کا براہِ راست تعلق نواحِ دہلی کی ایک بولی ہریانوی سے تھا۔ انھوں نے اس نظریے کو اپنی تحقیقی تصنیف 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' میں پیش کیا جو پہلی بار 1948 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے یکے بعد دیگرے کئی ایڈیشن نکلے، لیکن 1987 میں جب اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں انھوں نے اپنے بنیادی نظریے میں تھوڑی سی ترمیم کی اور کہا کہ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ مسعود صاحب 1987 سے پہلے تک اردو کا ارتقا براہِ راست ہریانوی سے بتاتے تھے، لیکن 1987 سے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اردو براہِ راست کھڑی بولی سے پیدا ہوئی ہے۔ ہریانوی کو، اردو کی پیدائش کے سلسلے میں انھوں نے دوسرے نمبر پر پہنچا دیا۔ مسعود حسین خاں کے پیش کردہ آغازِ اردو کے نظریے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مسلمانوں کی فتحِ دہلی (1193) کے بعد جب کھڑی بولی میں عربی و فارسی کے لسانی عناصر 'نفوذ' کر جاتے ہیں تب اردو پیدا ہوتی ہے۔

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں میرا نظریہ مسعود حسین خاں کے نظریے سے ذرا مختلف ہے۔ شروع ہی سے میرا یہ نظریہ رہا ہے کہ اردو براہِ راست کھڑی بولی سے پیدا ہوئی اور یہی اس کی اصل و اساس ہے بلکہ کھڑی بولی ہی اردو ہے۔ اپنے ارتقائی اور تشکیلی دور میں یہ ہریانوی اور نواحِ دہلی کی بعض دیگر بولیوں سے ضرور متاثر ہوئی ہے، لیکن جیسے جیسے یہ ترقی کرتی گئی ان بولیوں کے اثرات زائل ہوتے گئے۔ میں اردو کا وجود اس وقت سے تسلیم کرتا ہوں جب سے کھڑی بولی معرضِ وجود میں آئی ہے، لیکن مسعود صاحب اردو کی پیدائش کے سلسلے میں کھڑی بولی کا دامن بعد میں تھامتے ہیں اور 1193 میں مسلمانوں کی دہلی میں آمد کا انتظار کرتے ہیں اور کھڑی بولی میں عربی و فارسی الفاظ کے 'نفوذ' کر جانے کو ضروری بتاتے ہیں۔ میری ادنیٰ رائے یہ ہے کہ اردو کے آغاز کے لیے نہ تو دہلی میں مسلمانوں کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے اور نہ کھڑی بولی میں عربی و فارسی عناصر کے 'نفوذ' کر جانے کی شرط لگانی چاہیے۔ جب لسانیاتی تحقیق کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اردو کی تہہ میں جو بولی ہے وہ کھڑی بولی ہے تو پھر ہم کھڑی بولی کے آغاز کو ہی اردو کا آغاز کیوں نہ تسلیم کریں۔ شمالی ہندوستان میں کھڑی بولی کا آغاز 1000 سنہ عیسوی میں شورسینی اپ بھرنش کے خاتمے کے بعد سے ہوتا ہے۔ میرے نظریے کی رو سے اردو کے 'ابھار' کا یہی زمانہ ہے، کیونکہ یہ کھڑی بولی کے ابھار کا زمانہ ہے۔

ع ح: کیا اردو اور جدید لسانیات کے حوالے سے عصری جامعات میں پیش رفت ہو رہی ہے؟

مرزا خلیل احمد بیگ: یقیناً ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک اُردو کے لسانیاتی مطالعات کا انداز محض روایتی تھا جسے 'علم اللسنہ' (Philology) کے ضمن میں رکھا جا سکتا ہے۔ سید محی الدین قادری زور پہلے اردو اسکالر ہیں جنھوں نے یورپ جا کر لسانیاتِ جدید (Modern Linguistics) کی تربیت حاصل کی اور اردو کے حوالے سے لسانیاتی مطالعات وتحقیقات کا آغاز کیا۔ زور صاحب کے بعد مسعود حسین خاں، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، دوسرے اردو اسکالر ہیں جنھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت حاصل کرنے کے لیے یورپ کا رخ کیا تھا۔ انھوں نے انگلستان میں رہ کر مشہور ماہرِ لسانیات وصوتیات جے آر فرتھ (J.R.

(Firth کی رہنمائی میں عروضی صوتیات (Prosodic Phonology) کا علم حاصل کیا اور فرانس میں اپنے قیام کے دوران 1953 میں لسانیات میں ڈی.لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر وہ راک فیلر فاؤنڈیشن (امریکہ) کی مالی امداد سے منعقدہ دکن کالج، پونا کے مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں میں لسانیات کا درس دینے پر مامور ہوئے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

اسی زمانے میں ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں لسانیات کے نئے شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی 1968 میں لسانیات کا ایک علاحدہ شعبہ قائم ہوا جس کے صدر پروفیسر مسعود حسین خاں بنائے گئے۔ انھوں نے شعبۂ لسانیات کی شیرازہ بندی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُردو کے حوالے سے صحیح معنیٰ میں جدید لسانیاتی تحقیق کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ لیکن کچھ اہلِ علم علی گڑھ سے باہر دوسری یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے حوالے سے لسانیاتی تحقیق میں مصروف تھے۔ ان میں سب سے نمایاں نام گیان چند جین کا ہے جنھوں نے 'عام لسانیات' اور 'لسانی مطالعے' کے نام سے کتابیں لکھیں۔ یہ دونوں کتابیں ترقی اردو بیورو (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کی جانب سے شائع ہوئیں۔ عبدالقادر سروری نے 'زبان اور علمِ زبان' کے نام سے ایک نہایت کارآمد کتاب لکھی جو 1970 میں حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں بنگلور کی آمنہ خاتون نے 'دکنی کی ابتدا' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ گوپی چند نارنگ نے امریکہ کی وسکانسن اور انڈیانا یونیورسٹیوں میں رہ کر اُردو صوتیات پر اعلیٰ سطح پر تحقیقی کام کیا جس کے نتائج (Findings) بین الاقوامی جرائد میں شائع ہوئے۔ انھوں نے اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو پر بھی کتاب شائع کی اور دہلی کی ایک سماجی بولی (Social Dialect) پر Karkhandari Dialect of Urdu کے نام سے ایک تحقیقی مطالعہ پیش کیا۔ اسلوبیات، جس کا تعلق اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics) سے ہے، نارنگ صاحب کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اسلوبیاتی تنقید سے متعلق کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے نئی ادبی اور تنقیدی تھیوری پر کام کرنا شروع کیا جس کے لسانی مضمرات کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ عبدالستار دلوی نے ممبئی یونیورسٹی سے منسلک رہ کر لسانیات بالخصوص سماجی لسانیات پر اُردو کے حوالے سے قابلِ قدر تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ دکنیات بھی دلوی صاحب کی دل چسپی کا میدان رہا ہے۔ عصمت جاوید کے 'نئی اُردو قواعد' کے نام سے اُردو زبان کی توضیحی اور تخلیقی قواعد (Generative Grammar) ترتیب دی۔ نصیر احمد خاں نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے منسلک رہ کر 'اُردو ساخت کے بنیادی عناصر' اور بعض دیگر لسانیاتی موضوعات پر تحقیقی کام کیا۔ جے این یو ہی کے ایک اسکالر سید امتیاز حسنین نے اُردو کے حوالے سے زبان کی معیار بندی پر کام کیا۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (میسور) کے ہنس راج دوآ نے دکنی اردو پر انگریزی میں تحقیقی کام کیا اور کتاب شائع کی۔ علی گڑھ سے منسلک رہ کر عبدالغفار شکیل نے میسوری اردو کا توضیحی لسانیاتی مطالعہ پیش کیا۔ اقتدار حسین خاں نے بھی علی گڑھ ہی میں بیٹھ کر اردو صرف و نحو پر جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے کتابیں تصنیف کیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ لسانیات کے قیام کے بعد ایم اے کا جو پہلا بیچ 1971 میں فارغ التحصیل ہو کر نکلا اس میں مَیں بھی شامل تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد میں نے پی ایچ.ڈی میں داخلہ لیا۔ میرے ریسرچ سپروائزر پروفیسر مسعود حسین خاں تھے۔ میں نے ان کی نگرانی میں چار سال کے اندر ہی 'شمالی ہند کی اُردو کی تاریخی قواعد' پر مقالہ لکھ کر یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ اگلے سال (1976) مجھے لسانیات میں پی ایچ.ڈی کی ڈگری مل گئی اور اسی شعبے میں میرا تقرر بحیثیت لکچرر ہو گیا۔ پھر میں نے رفتہ رفتہ ریڈر، پروفیسر اور صدرِ شعبہ کے مدارج طے کیے۔ میں نے تقریباً 30 سال تک اس شعبے میں لسانیات کا درس دیا، اور شب و روز تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ میں نے لسانیات کے میدان میں اب تک جو کچھ بھی علمی کام کیے ہیں ان کا ذکر اجمالاً پہلے کر چکا ہوں۔ اب میرے بعض شاگرد لسانیاتی تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے، اسے نئی جہت دینے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں، مثلاً علی رفاد فتیحی، خطیب سید مصطفیٰ، نذیر احمد ملک، نذیر احمد دھر، صباح الدین احمد اور عبدالعزیز خاں وغیرہ نے اُردو کے حوالے سے لسانیات کے مختلف گوشوں میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں اور کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے علاوہ مسعود علی بیگ، نہال احمد، اعجاز محمد شیخ، نثار احمد کوکا، سید اختیار علی اور محمد اشرف بھٹ وغیرہ بھی لسانیات سے اپنی وابستگی قائم رکھے ہوئے ہیں اور اس کے عملی نمونے بھی وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔

ع ح: اردو الفاظ کے تلفظ اور اس کی علاقائی شناخت پر روشنی ڈالیں؟ کیا اردو تلفظ کی معیار بندی ہونی چاہیے۔؟

مرزا خلیل احمد بیگ : زبان کا یہ اصول ہے کہ وہ زمان و مکاں میں تبدیلی کے ساتھ خود بھی تبدیلی کے عمل سے گذرتی ہے (Languages change in time and space)۔ ایک عہد کی زبان دوسرے عہد کی زبان سے کئی اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک علاقے یا خطے کی زبان دوسرے علاقے یا خطے کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر زندہ زبان میں مختلف النوع لسانی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ پرانی کہاوت ہے کہ ہر دس کوس پر زبان بدل جاتی ہے۔ زبانوں میں جب پھیلاؤ ہوتا ہے اور جب ایک علاقے کی زبان بعض سماجی و تہذیبی، نیز سیاسی تقاضوں کے ماتحت دوسرے علاقے میں پہنچتی ہے تو اس کے لیے ایک ہی نہج پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس میں صوتی، صرفی، نحوی اور قواعدی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں، اور وہ اپنے معیار سے ہٹ جاتی ہے۔ جس طرح زبانوں میں تاریخی تبدیلیاں ناگزیر ہیں اسی طرح زبانوں میں علاقائی تباین (Regional Variations) کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔ اردو کو ہندوستان گیر زبان کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کے وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس لیے اس میں نہ صرف صوتی سطح پر فرق کا پایا جانا لازمی ہے، بلکہ صرفی، نحوی اور قواعدی، نیز معنیاتی سطح پر بھی اس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اردو صوتیے رق /ر/ کی حیدرآباد (دکن) میں رخ /غ/ میں تبدیلی اور اسی آواز کی پنجاب میں رک /ڑ/ میں تبدیلی صوتی سطح پر اردو کے علاقائی تباین کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح 'میں نے لاہور جانا ہے' کہنا بھی اردو کے علاقائی فرق کی مثال ہے۔ علاقائی سطح پر اردو کے تلفظ میں فرق کا پایا جانا فطری ہے، اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فرق اردو کی علاقائی شناخت کی دلیل ہے۔ جہاں تک کہ اردو تلفظ کی

معیار بندی کا سوال ہے، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اردو زبان کی معیاری بندی کے ساتھ اردو تلفظ کی معیاری بندی کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اس سے سماجی اور علاقائی سطح پر انحراف (Deviation) ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا جو بالکل فطری ہے۔ اردو ایک معیاری زبان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو زبان کی ہر سطح پر خواہ وہ صوتی سطح (تلفظ کی سطح) ہو یا صرفی، نحوی اور قواعدی یا معنیاتی سطح، اس کا معیار قائم ہو چکا ہے، اب مزید معیار بندی کی ضرورت نہیں ہے۔ علاقائی فرق تو انگریزی جیسی بڑی زبان میں بھی پایا جاتا ہے۔ تلفظ، لغات، روزمرہ (Usage)، نیز فقروں اور جملوں کی حد تک برطانوی انگریزی اور امریکہ میں بولی جانے والی انگریزی میں نمایاں فرق موجود ہے۔ اردو میں تحریر کی سطح پر معیار بندی کے اصولوں کا برتا جانا جتنا آسان ہے، تقریر (تلفظ) کی سطح پر اتنا ہی مشکل ہے۔

ع ح: اردو املا کمیٹی کی سفارشات پر آپ کیا کہیں گے؟ موجودہ دور میں ایک ہی لفظ کا کئی طرح سے املا کیا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں اس صورتِ حال سے کس طرح نپٹا جا سکتا ہے؟

مرزا خلیل احمد بیگ: اردو املا کمیٹی کی سفارشات کو بہت غور و خوض کے بعد حتمی شکل دی گئی تھی۔ ان سفارشات کو مرتب کرنے میں اردو زبان کی تاریخ و تہذیب، روایت، نیز عصری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔ یہ ہر لحاظ سے نہایت معقول و مناسب سفارشات تھیں۔ ان سفارشات کو اردو رسم الخط کی معیار بندی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان سفارشات پر پورے طور پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں دوبارہ عام کیا جائے۔ ایک گشتی مراسلے کے ذریعے اردو کے نمائندہ ادیبوں، مصنفوں، مترجموں، صحافیوں، محققوں، اور لسانیات کے ماہرین، نیز درس و تدریس کے پیشے سے منسلک افراد سے گزارش کی جائے کہ وہ ان سفارشات پر خود بھی عمل کریں اور انھیں عام کرنے میں تعاون دیں، کیونکہ اردو جیسی معیاری زبان کے لیے یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ اس کے کسی بھی لفظ کو دو یا تین طرح سے لکھا جائے، جیسے کہ لیے، لئے، لیئے وغیرہ۔

ع ح: اردو کے فروغ کی سمت میں کیا کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں جو موجودہ دور میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

مرزا خلیل احمد بیگ: اردو کے فروغ کی بات جب بھی میرے ذہن میں آتی ہے تو میرا ذہن اردو رسم الخط کے فروغ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اردو ادب کا تو کافی فروغ ہو چکا ہے۔ اردو شاعری سے بھی لوگ کافی حد تک مانوس ہو چکے ہیں۔ شاعری کے فروغ کا ایک ذریعہ مشاعرے اور غزل سرائی کے پروگرام ہیں جو آئے دن ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں سب سے دل دُکھانے والی بات یہ ہے کہ خود اردو بولنے والوں کی نئی اور نوجوان نسل اردو رسم الخط سے ناواقف ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح اردو سے اس کا رشتہ ٹوٹتا اور منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اب مسجدوں، مدرسوں اور مقبروں سے بھی اردو رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ لکھنؤ کی کئی مساجد کا میں عینی شاہد ہوں جہاں مساجد کے اندر اور باہر سارے سائن بورڈ صرف اور صرف دیوناگری لپی (رسم الخط) میں لگے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور میں اردو رسم الخط کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش اور جدوجہد کی جانی چاہیے۔ یہی اردو کا فروغ ہے۔ یہ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے والے ادارے اور انجمنیں انٹرنیٹ کے ذریعے اردو رسم الخط سکھانے کی ویب سائٹ تیار کر سکتی ہیں۔ ہندی کے ذریعے اردو سکھانے کی معیاری کتابیں بھی تیار کی جا سکتی ہیں اور ہر شہر میں محبانِ اردو اپنے وسائل سے جز وقتی مفت اردو کوچنگ کا انعقاد بھی کر سکتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اسکولوں میں اردو کو طلبہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے، لیکن وہاں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایسے اسکولوں کے منتظمین سے مل کر اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے کوششیں کی جا سکتی ہیں۔ علی گڑھ میں یہ تجربہ کامیاب رہا تھا۔

ع ح: اردو کا مستقبل روشن ہے۔ آپ اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں؟

مرزا خلیل احمد بیگ: یقیناً اردو کا مستقبل روشن ہے۔ یہ دعویٰ اس بنیاد پر کیا جا سکتا ہے کہ اردو کا جو سماجی لسانی تناظر پچاس سال قبل تھا وہ آج نہیں ہے۔ اس میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے، اور اردو بولنے والوں کی تعداد میں گذشتہ پچاس سال کے دوران میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت ہندوستانی مردم شماری کی لسانی رپورٹ کے سرکاری اعداد و شمار ہیں۔ سنہ 1961 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی کل تعداد صرف 2 کروڑ 33 لاکھ 23 ہزار 518 تھی، لیکن 2001 میں یہ تعداد بڑھ کر 5 کروڑ 15 لاکھ 3611 ہو گئی۔ 2011 کی مردم شماری کے لسانی اعداد و شمار ابھی سامنے نہیں آئے ہیں، لیکن توقع کی جاتی ہے کہ اس مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی تعداد چھے کروڑ سے تجاوز کر جائے گی۔ گذشتہ پچاس سال کے دوران میں ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد سرکاری رپورٹ کے مطابق حسب ذیل ہے :

1961	: 2, 33, 23, 518
1971	:2,86,20,895
1981	:3,49,41,435
1991	: 4, 34, 06, 932
2001	: 5, 15, 36, 111

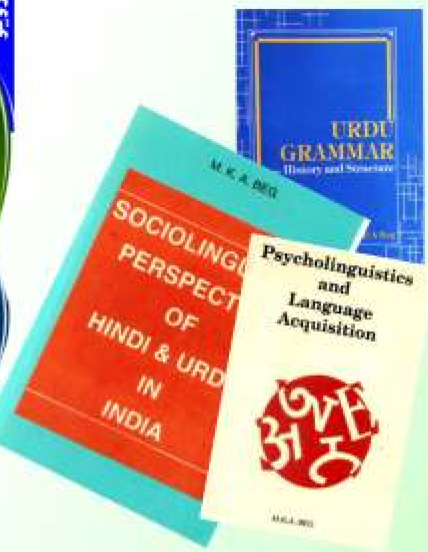

جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد میں گذشتہ پچاس سال (1961 تا 2011) کے دوران میں تقریباً تین گنا اضافہ ہو گیا ہو اور آئندہ بھی اضافے کے امکانات روشن ہوں، اس کا مستقبل کیوں کر تاریک رہ سکتا ہے! ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو بولنے والوں کی نئی اور نوجوان نسل کو اردو رسم الخط سے بہ خوبی روشناس کرایا جائے۔ جب وہ اردو رسم الخط سیکھ جائیں گے تو گویا انھوں نے اردو سیکھ لی۔

ع ح: 'اردو دنیا' کے قارئین کو آپ کیا پیغام دیں گے؟

مرزا خلیل احمد بیگ: 'اردو دنیا' کے قارئین کے لیے میں صرف یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ خود تو ماشاء اللہ اردو پڑھتے ہی ہیں اپنے احباب اور ملنے جلنے والوں کو بھی (اگر وہ اردو سے واقف نہیں ہیں) اردو پڑھائیں اور انھیں اس لائق بنائیں کہ وہ موقر ماہنامہ 'اردو دنیا' اور دیگر اردو رسائل و اخبارات کا مطالعہ کر سکیں۔ قارئینِ 'اردو دنیا' اردو رسم الخط کے فروغ کے لیے دل و جان سے کوشش کریں جو درحقیقت اردو کا فروغ ہے، اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں کہ اردو ہماری تہذیب کا جزو لاینفک ہے۔ اگر اردو مٹتی ہے تو ہماری تہذیب کیوں کر باقی رہ سکتی ہے!

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

شازلی حسن خاں

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط اکتساب

(Blended Learning in Higher Education)

اکتساب کے جدید ترین اور اختراعی طریقوں میں 'مخلوط اکتساب' نہایت اہم طریقہ ہے۔ آج جب کہ زندگی کے ہر شعبے میں ٹکنالوجی کی مدد سے خوبی کو بہتر بنایا جارہا ہے، اکتسابی تجربات اور اسکولوں میں تدریسی طریقوں کو بھی بہتر بنانے کی سعی ہورہی ہے۔ آج کی Knowledge Society کے مدنظر اعلیٰ تعلیمی اداروں کو بھی استاد اور طلبا کی صلاحیتوں میں وقت کے تقاضہ کے لحاظ سے اضافہ کی ضرورت ہے۔ اکتساب میں خاطرخواہ تبدیلی کے لیے 'مخلوط اکتساب' سے کافی امکانات روشن ہیں۔ 'مخلوط اکتساب' محض زیادہ تدریس کرنا نہیں ہے بلکہ تدریس اور اکتساب کے لیے ایک نئی طرز رسائی ہے۔ یہ ایک ایسا منظم اور منصوبہ بند طریقہ ہے جس میں روبرو (آمنے سامنے) کی تدریس اور Online اکتساب دونوں کو اہمیت دی گئی ہے اور جس کے ذریعے تعلیمی ہدف حاصل کرنا اور اکتساب کی خوبی کے اضافہ کرنا مشکل نہیں رہے گا۔

'مخلوط اکتساب' کے تصور کو بخوبی سمجھنا اور اس کے نفاذ کے لیے منصوبہ بند لائحہ عمل تیار کرنا انتہائی اہم اقدام ہے۔

مخلوط اکتساب کو ایک درسیاتی (Pedagogical) طرز رسائی سمجھنا چاہیے جس میں دو طریقوں کو سائنٹفک طریقے سے آمیزہ کیا گیا ہے یعنی درجۂ جماعت میں اکتسابی اور سماجی ہم آہنگی کے فوائد اور Online سے ٹکنالوجی پرمبنی اکتساب۔ تحقیق سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ طلبا اور اساتذہ دونوں اس ترکیب سے مطمئن ہوتے ہیں اور اس سے خاطرخواہ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

'مخلوط اکتساب' کے کئی نمونے (Models) ممکن ہیں جن میں اس کے مختلف پہلوؤں کو مختلف اور عملی امکان کے (Practicality) تعلق سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اکتساب معلومات (Information) کے بنیاد پر؛ اکتساب بذریعہ تعاون (Collaboration)؛ اور درجۂ جماعت میں اکتساب۔ ان عناصر کو مختلف تناسب میں اسکول کی ضرورت اور وسائل کے لحاظ سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ ماہرین تعلیم Dziuban, Hartman اور Moskal کا کہنا ہے کہ 'مخلوط کتساب' کو ایسا درسیاتی طریقہ سمجھنا چاہیے جس میں کمرۂ جماعت کی تدریس کے فوائد، علم کی تحصیل اور سماجی ہم آہنگی وغیرہ کو ٹکنالوجی پرمبنی Online ماحول سے ملایا جاتا ہے۔''

حال میں اطلاعاتی اور ترسیل ٹکنالوجی (ICT) نے اکتساب میں اضافہ کے لیے نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے۔ طلبا خود-اکتساب (Self-learning) کرسکتے ہیں اور انٹرنیٹ (Intrernet) کی مدد سے مختلف قسم کی مشقیں کرسکتے ہیں۔ اب یہ منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبا کے لیے Internet کی سہولت فراہم کریں۔

'مخلوط اکتساب' سے انفرادی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ 'مخلوط اکتساب' کے امکانات (Potential) تقریباً لامحدود ہیں۔

مخلوط اکتساب کو مؤثر بنانے کے لیے اس کو صحیح طور سے سمجھنا ضروری ہے۔ اس میں دونوں طریقوں یعنی آمنے سامنے کی زبانی تدریس و ترسیل اور Internet کی Online ترسیل، دونوں کو کافی غور و فکر اور منصوبہ بندی کے بعد موزوں تناسب میں اور تعلیمی مقاصد کے لحاظ سے ضم کیا جاتا ہے۔ مخلوط اکتساب بظاہر نہایت سادہ اور آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عملی طور سے کافی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس میں انٹرنیٹ اور تدریسی پروگرام کو محض جوڑنا نہیں ہے بلکہ درجۂ جماعت کے اوقات کی نئی ترتیب اور انٹرنیٹ تک رسائی کے لیے مناسب تال میل (Coordination) اور منصوبہ بندی لازمی ہے یعنی تدریس و اکتساب کے سب ہی

پہلوؤں کو از سر نو تشکیل دینا ہے۔

مشہور ماہر تعلیم (Mark Rorenberg) 2001 نے اپنے ایک مضمون میں بہت صحیح کہا ہے کہ ''سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں کیا Blend کرنا ہے بلکہ یہ ہے کہ کون کون سے عناصر کو Blend کرنا چاہیے۔'' اس کے علاوہ تدریسی مواد (Course Material) کو نئے تقاضوں کے لحاظ سے ڈیزائن کرنا بھی شامل ہے۔

اعلیٰ تعلیمی سطح کے طلبا کو مخلوط اکتساب سے نئے تجربات کی فہم حاصل ہوگی۔ اس کے اصول اور طریقوں کی جانکاری سے ان کو خود اعتمادی ملے گی اور چشم تصور (Version) وسیع ہوگا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مخلوط اکتساب کی بنیاد ٹکنالوجی ہے۔ اس عمل میں تعلق اور تعاون (Correction & Collaboration) کرکے مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس میں کمرۂ جماعت میں اکتساب اور سماجی ہم آہنگی کے علاوہ آن لائن کے طریقوں سے بھی مواد حاصل کرنے، بحث و مباحثہ اور تعامل کے لیے ای میل وغیرہ کی آسانی ہے، اس لیے طلبا کی صلاحیت اور علم میں کافی اضافہ ہوگا۔

اس طریقے سے طلبا اپنی مہارت کو مضبوط کرنے کے لیے مشقیں اور سرگرمیاں معلوم کرسکتے ہیں۔ کفایتی اور لچکیلا ہونے کی وجہ سے طلبا کو حسب توقع ٹکنالوجی مل سکتی ہے اور وہ اپنی سہولت کے لحاظ سے جگہ کا اور وقت کا تعین کرسکتے ہیں۔ تعاملاتی مکالمہ (Interactive, dialogue) جو اس مخلوط اکتساب کے ذریعے فراہم ہوگا، تنقیدی سوچ اور اعلیٰ سطح کی سیکھ کے لیے نہایت سازگار ہے۔ اس سلسلے میں Hudson (2012) نے بہت صحیح کہا ہے کہ ''فکر و تخیل کی بنیادی مکالمہ ہے جو خیالات کو بامعنی بنا دیتا ہے۔'' ایسا دیکھا گیا ہے کہ مرکب (یعنی مخلوط) اکتساب بمقابلہ روایتی درجۂ جماعت کی تدریس کے زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہوتا ہے۔ طلبا کی حصولیابی بہتر ہوتی ہے اور وہ زیادہ مطمئن ہوتے ہیں۔ ان کی یادداشت بھی دیرپا ہوتی ہے۔ طلبا کے لیے استاد کی رہنمائی بہت اہم ہے۔ انٹرنیٹ پر مباحثہ؛ کثیر ذرائع کے مواد (Multi media)؛ Quizzes وغیرہ دستیاب ہیں۔ ان سے استفادہ کرنے سے طلبا کی اکتسابی خوبی اور علم میں اضافہ ہوگا لیکن جیسا کہ ماہر تعلیم Twigg نے کہا ہے کہ کورسز اور کل درسیاتی پروگرام کو غور و فکر کے بعد Re design کرنے کی ضرورت ہے۔

مخلوط اکتساب کی کامیابی کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کے انتظام اور منصوبہ بندی پر بہت توجہ دی جائے۔ مخلوط اکتساب میں طلبا کی تعداد زیادہ ہونے کی امید ہے۔ ان کے Courses کے لیے مخلوط اکتساب کا منصوبہ اپنانا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ارباب اختیار کو کئی مسائل کو پہلے سے طے کرنا چاہیے۔ مثلاً ضرورتوں کی پہچان کرنا اور ان کا انتظام کرنا۔ مقاصد اور نشانہ (goals) طے کرنا۔

انٹرنیٹ اور وسائل کی امکانی لاگت، باتربیت تکنیکی اسٹاف۔ وغیرہ۔ مقاصد اور نشانہ حاصل کرنے کے لیے عمل آوری (Operational) کے سب ہی پہلوؤں کی پہلے سے منصوبہ بندی کرنا ہوگی: مثلاً مخلوط اکتساب میں کتنے اجزا (Components) ہوں گے۔ یعنی کون کون سے تدریسی اور ہدایتی جزو اور کتنے تناسب میں شامل کیے جائیں گے۔

مخلوط اکتساب میں ذیل میں بیان کی گئیں سرگرمیاں اور اشیاء شامل ہیں۔

حقیقی یا مجازی (Virtual) واقعات سے کمرۂ جماعت کا ماحول بنایا جاسکتا ہے۔ سب ہی طلبا اور استاد ایک ہی وقت میں رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ طلبا اپنی سہولت اور اپنی رفتار سے اکتساب کرسکتے ہیں۔ مختلف جگہوں کے طلبا سرگرم ترسیل اور تعامل سے آپس میں علم کو Share کرسکتے ہیں۔ طلبا کی حصولیابی کی جانچ بھی دونوں طرح سے یعنی کمرۂ جماعت میں اور آن لائن کی جاسکتی ہے۔

مخلوط اکتساب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اس کا انحصار استاد کردار، لائحہ عمل اور اوقات نامہ پر ہے۔ مثلاً:

(الف): روبرو (Face to Face) کا نمونہ۔ اس میں استاد ہی مواد مہیا کرتا ہے اور آن لائن کو مدد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(ب): باری باری (Rotation) کا نمونہ۔ طلبا خود Online اکتساب کرتے ہیں اور مختلف وقت میں کمرہ جماعت میں استاد سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

(ج): On Line Lab اسکولوں کے لیے کل مواد آن لائن دستیاب ہے۔ طلبا ان سے استفادہ کرتے ہیں اور روایتی کورسز بھی لیتے ہیں۔

مخلوط اکتساب میں رسمی اور غیر رسمی دونوں قسم کے مواقع اور وسائل دستیاب ہیں۔ رسمی اکتساب میں کمرۂ جماعت کی تدریس و تربیت اور تعین قدر شامل ہیں۔ غیر رسمی اکتساب میں آن لائن کتابیں اور مضامین ویڈیوز؛ سماجی نٹ ورک، Wolos، Blogs وغیرہ دستیاب ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر بھی مخلوط اکتساب نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر چند اصولوں کو اپنایا جائے۔ مقامی اور طلبا کی ضرورتوں کو اہمیت دینا چاہیے نیز بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure) کو کافی مضبوط بنانے کی ضرورت ہے جس میں پرعزم اور تربیت یافتہ اساتذہ، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی سہولت وغیرہ شامل ہیں۔ مخلوط اکتساب کو ایک اضافی ٹکنالوجی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ایک تبدیلی (Transform) عمل ہے۔

مخلوط اکتساب کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ مقامی اور عالمی برادری سے ترسیل اور سماجی تعاملات کے لیے ایک موثر ذریعہ ہے۔ اس سے لوگوں کو ایک دوسرے کے ثقافتی اور سماجی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ٹکنالوجی سے لوگوں میں سماجی ہم آہنگی اور برداشت کے مزاج (Tolerance) کو فروغ ملے گا۔

آج کے سائنسی اور ٹکنالوجی کے دور میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کو بھی ان ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم کی خوبی میں اضافہ کرنا بھی قومی اور عالمی مسابقت کے مدنظر انتہائی اہم ہوگیا ہے۔ مخلوط اکتساب سے اعلیٰ علمی معیار حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ان اداروں کو صاف اور مستحکم پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ مخلوط اکتساب کی افادیت اور تاثیر کو جانچنا بھی بہت اہم ہے تاکہ معلوم ہوسکے کہ طلبا کی یادداشت اور حصولیابی میں کتنا فرق آیا ہے اور یہ کہ طلبا اور اساتذہ اس سے کتنے مطمئن ہیں۔ طلبا کی تنقیدی اور انعکاسی فکر میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔

حال میں کئی تنظیموں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں نے ٹکنالوجی کو تدریسی، اکتسابی عمل میں ضم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بڑی کمپنیاں اور تجارتی تنظیمیں (Corporate) انٹرنیٹ سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

عمدہ (Sophisticated) Data system سے اساتذہ طلبا کے بارے میں وسیع معلومات رکھ سکتے ہیں اور روزمرہ کے کاموں میں وقت کی بچت ہوتی ہے۔ مخلوط اکتساب اگر عام اور مقبول ہوجائے تو اساتذہ بھی ایک دوسرے سے تعاملات (Intract) کرکے زیادہ باخبر اور زیادہ باصلاحیت ہوسکیں گے۔

کل ملا کر مخلوط اکتساب ایک بہتر اور سازگار ماحول کی تشکیل میں معاون ہوگا۔ یہ طالب علم پر مرکوز ہے۔

ترسیل اور تعاملات مخلوط اکتساب کے لازمی اجزا ہیں۔ اس میں اساتذہ اور منتظمین کی بصیرت اور عہد کی بہت اہمیت ہے۔

■

Shazli Hasan Khan
4/757, Friends Colony
Sir Syed Nagar
Aligarh - 202002 (UP)

آفاق حسین صدیقی

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری

ایک نابغۂ روزگار شخصیت

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہماری علمی وادبی تاریخ کا ایک معتبر اور محترم نام ہے وہ بیک وقت ایک باریک بیں محقق، نکتہ رس، ناقد، اعلیٰ مفکر، بے مثال مدبر، ماہر قانون داں، ماہر تعلیم، شعلہ بیان مقرر، بلند پایہ مترجم، صاحب طرز نثر نگار اور جدت پسند شاعر تھے۔ انھوں نے اگرچہ مختصر عمر پائی لیکن قلیل مدت میں علم وادب کے مختلف میدانوں میں اپنی فہم وفراست کے روشن نقوش یادگار چھوڑے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری سیوہارہ ضلع بجنور میں آباد ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس خاندان کے بزرگ سرزمین عرب سے ہجرت کرکے ایران آذربائیجان میں آباد ہوئے تھے۔ پھر اسی خاندان کے ایک بزرگ ہندوستان آئے۔ بجنوری کے خاندان کے بارے میں ان کے فرزند فاتح فرخ نے لکھا ہے:

''محمد ابن ابوبکر کی اولاد ہیں۔ ابتدائے اسلام میں اس خاندان کی ایک شاخ زنجان صوبۂ آذربائیجان ملک ایران میں مقیم ہوئی۔ بعدازاں ہندوستان میں بہ عہدۂ قضا ممتاز ہوکر ایک صاحب اس خاندان کے آئے جن کی نسل اب تک سیوہارہ ضلع بجنور میں آباد ہے۔''[1]

بجنوری کی تاریخ پیدائش کے مستند شواہد دستیاب نہ ہونے کی بنا پر ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں محققین کے درمیان اختلافات ملتے ہیں۔ محمد فاتح فرخ نے 'یادگار بجنوری' میں ان کی پیدائش 1885 درج کی ہے اور لکھا ہے کہ صحیح تاریخ معلوم نہیں۔[2] ڈاکٹر شہزاد بانو دہلوی نے 'اردو ادب کے خالق' میں ان کی تاریخ پیدائش 10 جون 1885 درج کی ہے۔[3] اس سلسلہ میں انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جب کہ مشہور محقق ڈاکٹر سید حامد حسین نے ریاست بھوپال کے قدیم سرکاری ریکارڈ کے حوالے سے ان کی تاریخ پیدائش 10 جون 1887 تحریر کی ہے۔[4]

بجنوری کی ابتدائی تعلیم وتربیت مشرقی انداز میں گھر پر ان کی والدہ کی نگرانی میں ہوئی ان کی والدہ آمنہ خاتون اپنے زمانے کے جید عالم دین مولوی ریاض الدین کی بیٹی تھیں اور دینی علوم سے گہری واقفیت رکھتی تھیں انھوں نے بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کے لیے سہارنپور کے قاری حافظ نیاز صاحب کو مقرر کیا تھا۔ بعد میں جب بجنوری کے والد قاضی نورالاسلام برٹش حکومت کی ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ گئے تو بجنوری بھی حصول تعلیم کی غرض سے ان کے ہمراہ کوئٹہ چلے گئے۔ بجنوری کے والد مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی کی اچھی استعداد رکھتے تھے اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر برٹش حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور 'خان بہادر' کے اعزاز سے سرفراز ہوئے تھے۔ بجنوری نے 1902 میں کوئٹہ ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ گئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخلہ حاصل کیا۔ یہاں سے 1904 میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے انٹر اور 1906 میں بی۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد اسی کالج سے انھوں نے 1909 میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

بجنوری بچپن سے ہی انتہائی ذہین، متین اور غور وفکر کرنے والے انسان تھے۔ ابتداء سے ہی وہ وطنی محبت کے جذبے سے سرشار وغیر ملکی اقتدار سے بیزار، مشرقی علوم وحکمت کے پرستار اور اپنی مادری زبان اردو کے شیدائی اور اس کے علمی وادبی ذخیرے کی اہمیت ووقعت کے قائل تھے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ہی جہاں ان کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کو بھرپور طور پر ابھرنے کا موقع ملا وہیں یہاں کی فضا اور ماحول نے ان کے جذبات واحساسات میں شدت اور استحکام پیدا کیا اور خیالات میں پختگی اور غور وفکر میں سنجیدگی اور متانت پیدا ہوگئی جس کی بنا پر تعلیم کے دوران میں بہت جلد ہی انھیں محمڈن کالج میں غیر معمولی مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوگئی اور اپنے ہمعصروں میں

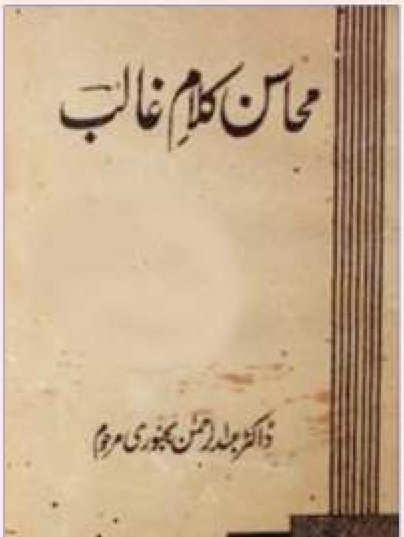

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ محمڈن اورینٹل کالج میں 1907 میں انگریزوں کے خلاف جو اسٹرائک ہوئی تھی اور پانچ ماہ تک جاری رہی تھی، بجنوری اس کے رہنما تھے اسی کے بعد 21 اور 22 جنوری 1908 کو جب یونین کلب کا الیکشن ہوا تو بجنوری بلا مقابلہ نائب صدر منتخب کیے گئے۔ انھوں نے یونین کے نائب صدر کی حیثیت سے نہ صرف اپنی ذمے داریوں کو بحسن خوبی انجام دیا بلکہ نائب صدر کی حیثیت سے نئی نئی سرگرمیوں کا آغاز کرکے اور تقریر و تحریر کے نئے مقابلے اور اہم موضوعات پر سمینار اور مباحثوں کا انعقاد کرکے اور کالج کی دوسری ضروریات پر توجہ دے کر اس عہدہ کے وقار میں بڑا اضافہ کردیا۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں انھیں کئی اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا۔ جس میں سے ایک 'کیمبرج اسپیکنگ پرائز' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔[5] (یہ انعام 1888) میں کالج کے پروفیسر ہیرالڈ کاکس (Horoldcox) نے قائم کیا تھا۔ یہ ہر سال اس طالب کو دیا جاتا تھا جو یونین کے مباحثوں کے دوران میں انگریزی زبان میں بہترین تقاریر کرتا تھا۔

محمڈن کالج کے دوران میں ہی بجنوری نے کالج کے اندرونی علمی و تعلیمی اور انتظامی معاملات میں دلچسپی لینے کے ساتھ ملکی اور قومی معاملات میں بھی دلچسپی لینا شروع کردیا تھا اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ ابتدا سے ہی وطنی محبت کا جذبہ ان میں موجزن تھا۔ چنانچہ انھوں نے تصدق احمد شروانی، سید محمود اور عبدالرحمٰن صدیقی کے ساتھ مل کر 'اخوان الصفا' کے نام سے ایک خفیہ جماعت کی تشکیل کی تھی اس جماعت کا مقصد طلبا کو انگریزوں کی مرعوبیت سے نجات دلانا، ان میں وطنی محبت کے جذبات کو فروغ دینا اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کی تحریک پیدا کرنا تھا۔ اس جماعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمود نے ایک خط میں لکھا تھا:

''مقالے پڑھے جاتے تھے کہ انگریزوں کو کیسے ملک سے نکالا جائے، ایک بار ہم لوگوں نے مل کر سرسید کے مزار پر عہد و پیمان کیا کہ جب تک ہم انگریزوں کو ملک سے نکال نہ دیں گے دم نہ لیں گے اور ملک کو غلامی سے آزادی دلانا ہماری زندگی کا مقصد ہوگا۔''[6]

بجنوری 1909 میں علی گڑھ کالج سے قانون کی ڈگری لینے کے بعد قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اکتوبر 1910 میں انگلستان گئے وہاں انھوں نے لنکنز ان (Lincoln'sinn) میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے 24 اکتوبر 1910 کو داخلہ لیا ساتھ ہی جرمنی میں ریسرچ کرنے کے اپنے منصوبے کے تحت فرائی برش (باون) کی یونیورسٹی میں بھی داخلہ حاصل کرلیا دسمبر 1913 میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور 26 جنوری 1914 کو انھیں بیرسٹر بنادیا گیا۔[7]

بجنوری نے جرمنی میں 'اسلامی قانون کے ماخذات' پر تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا انھیں 1913 میں اس پر ڈی۔ جے کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ جرمنی زبان میں لکھے گئے اس مقالے کو جولائی 1914 میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا تھا۔[8]

بجنوری نے اعلیٰ تعلیم کے دوران انگلستان اور جرمنی اور فرانس کے مختلف مقامات کی سیاحت کے مواقع بھی نکالے انھوں نے جنوبی یوروپ اور جنوب مشرقی ممالک کی سیاحت میں خاص دلچسپی لی اور وہاں کے رہنماؤں اور دانشوروں سے ملاقاتیں کیں انھوں نے ترکی کی سیاحت میں خاصا وقت گزارا اور مسلم دانشوروں سے مل کر وہاں کے سیاسی وسماجی وتہذیبی معاملات و مسائل سے واقفیت حاصل کی۔ 'باقیات بجنوری' میں شامل ان کے خطوط اور مضامین 'خواب' اور 'بلغاریہ میں اسلام' وغیرہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بجنوری 1914 میں ہندوستان واپس آئے تو قانون کی اعلیٰ ڈگری ہونے کے باوجود وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے بجائے کسی ایسے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہتے تھے جس سے ملک وقوم کو فائدہ پہنچ سکے لیکن باوجود کوششوں کے ان کو ان کے مزاج اور خواہش کے مطابق کوئی عہدہ نہیں مل سکا چنانچہ مجبوراً انھوں نے مرادآباد میں وکالت شروع کردی اور اپنی افتاد طبع کے تحت ملی اور علمی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے اسی دوران جب بجنوری مرادآباد میں تھے اور اپنی خواہشات کے برخلاف وہاں وکالت کررہے تھے 16 اپریل 1916 کو نواب زادہ حمیداللہ خاں نے ریاست بھوپال کے چیف سکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طالب علم رہے تھے انھوں نے 1915 میں وہاں سے بی اے کیا تھا اور مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں مختلف کمیٹیوں میں شامل تھے اور مسلم یونیورسٹی کے قواعد وضوابط وغیرہ کے سلسلہ میں بجنوری کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف بھی تھے اور ان کے معترف بھی۔ چنانچہ ریاست بھوپال میں ایک مفید اور معتبر نظام تعلیم کی ترتیب وتشکیل کے لیے انھوں نے بجنوری سے ریاست بھوپال میں مشیر تعلیم کے عہدہ پر آنے کی پیش کش کی۔ بجنوری نے اسے قبول کرلیا اور وہ چھ ماہ کے لیے 500 روپے ماہوار مشاہرے پر یکم اکتوبر 1916 کو بھوپال آگئے بعد میں ہر چھ ماہ بعد ان کی ملازمت کی توسیع ہوتی رہی۔[9]

ریاست بھوپال کی ملازمت کے دوران بجنوری کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے وسیع مواقع ملے۔ سب سے پہلے انھوں نے افسران بالا کے ساتھ ریاست کے اضلاع اور مواضعات کے دورے کرکے یہاں کی تعلیمی سرگرمیوں کی صورتحال کا جائزہ لیا اس کے بعد غور وفکر کرکے ایک مفید اور مناسب نظامِ تعلیم مرتب کیا اور 'قانون تعلیم جبریہ شہر بھوپال' کا مسودہ تیار کیا۔ 'قانون تعلیم جبریہ شہر بھوپال' کے نام سے یکم جنوری 1918 کو سلطان جہاں نے منظور کیا اور سرکاری گزٹ میں شائع کیا گیا۔ بھوپال میں بجنوری کا دوسرا اہم کام ایک ایسا کالج قائم کرنے کی تجویز تھی جس میں متوسط طبقے کے طلبا کم خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔ اس اسکیم پر نواب زادہ حمیداللہ خاں، عمادالملک سید حسین بلگرامی، حکیم اجمل خاں، مفتی محمد انوارالحق، جسٹس عبدالرحیم، بیرسٹر محمد نسیم (پروفیسر محمد مجیب کے والد) اور سید علی امام اور عبدالرحمٰن بجنوری نے تائید میں دستخط کیے تھے۔ اس کالج کا نام سلطانیہ کالج تجویز کیا گیا تھا۔ یہ دہرہ دون میں قائم ہونا تھا اس کے لیے نواب سلطان جہاں نے 4 لاکھ روپے دینے کی منظوری دی تھی۔ بجنوری نے اس کالج کے قیام کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی بحث کے ساتھ منشور کا مسودہ مرتب کیا اور بجٹ تیار کردیا تھا لیکن برٹش حکومت کے حکام بالا کی تائید حاصل نہ ہونے کی بنا پر کالج کا منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔

بجنوری بھوپال میں قیام کے دوران میں ریاست کے تعلیمی معاملات میں مصروف رہنے کے ساتھ مجوزہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوششوں سے بھی وابستہ رہے۔ تعلیمی مسائل سے بجنوری کی دلچسپی کا آغاز ان کے ایم او کالج کے طالب علمی کے زمانے سے ہی ہوچکا تھا۔

1906 میں جب لکھنؤ میں تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو کالج کے ٹرسٹیوں اوراسٹاف ممبران کے ساتھ بجنوری بھی لکھنؤ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی کے قیام کی کوششوں میں اوراس کے کانسٹی ٹیوشن کی تیاری کے سلسلہ میں برابر حصہ لیتے رہے تھےاس کے پیش نظر جب 1912 میں یونیورسٹی کےقواعدوضوابط تیارکیے گئےتو ڈاکٹر ضیاءالدین نے اس کامسودہ اظہار رائے کے لیے بجنوری کو جرمنی بھیجا تھا۔ 10 بجنوری نے اس پر غور وخوض کرکے اس پر تبصرہ کرکے مجوزہ یونیورسٹی کے اراکین کوبھیجا تھا لیکن ان کی تجاویز پر بحث نہیں ہوسکی بعدمیں جب بجنوری ہندوستان واپس آئے تو نواب وقارالملک نے بجنوری کواسے شائع کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ بجنوری نے اسے ٹائٹل پردرج ذیل عبارت کے ساتھ شائع کیا تھا۔

''مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مسودہ ایکٹ، اسٹیٹیوز، ریگولیشن وغیرہ پر مفصل بحث جس کوچہل ممبران کانسٹی ٹیوشن کمیٹی وجملہ ممبران مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے خاص غور وملاحظہ کے واسطے اور ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ ورہبران قوم کی توجہ کے لیے عبدالرحمٰن، ممبر مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن منجانب اولڈ بوائز شائع کیا۔ 11

بجنوری کا یہ تبصرہ نواب وقارالملک کے دیباچہ کے ساتھ 'مجوزہ مسلم یونیورسٹی' کے عنوان سے شمس المطابع مرادآباد 1915 میں طبع ہوکر فاؤنڈیشن کمیٹی کے چالیس ممبران مدرسۃ العلوم کے ٹرسٹیوں اوردوسرے رہنماؤں کواظہاررائے کے لیے بھیجا گیا تھا اس کے علاوہ جب ہندویونیورسٹی کے قیام کا معاملہ بھی شروع ہوا تواس سلسلہ میں بجنوری نے ہندو یونیورسٹی ایکٹ سے بہت سی باتوں میں اختلاف کااظہار کیا اوراس سلسلہ میں 'ہندویونیورسٹی ایکٹ اور مجوزہ مسلم یونیورسٹی' کے عنوان سے ایک رسالہ شائع کیا جو 1916 میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے ایکٹ کے سلسلے میں سیر حاصل بحث کی اور ہندو یونیورسٹی ایکٹ کی تقلید نہ کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالی تھی۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے قیام اوراس کے ریگولیشن کے سلسلہ میں طویل مباحث کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر انصاری کے ایماپر 8 اپریل 1917 کوعلی گڑھ میں پرنس حمیداللہ خاں کے زیرصدارت فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں یونیورسٹی کوفی الحال قبول کرنے کی تجویز منظور کرلی گئی تو نئے حالات کے تحت یونیورسٹی ایکٹ اور ریگولیشن تیارکرنے کے لیے ڈاکٹر ولی محمد کے ساتھ بجنوری کو ذمے داری دی گئی تھی۔ 12

اس سلسلہ میں ممبر تعلیم سرسنکرن نائر سے ملاقات کے لیے بجنوری 22 اگست 1917 کوشملہ گئے وہاں 16 دن کے قیام میں کئی میٹنگیں ہوئیں اور بہت سی اصلاحات اورترمیمات ہوئیں کانفرنس کے بعد 10 ستمبر کو بجنوری دہلی پہنچے تھے مجوزہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور ایکٹ ریگولیشن وغیرہ کے سلسلہ میں بجنوری کی خدمات کا جائزہ تفصیلی بحث کاموضوع ہےاس سلسلہ میں ان کی غیرمعمولی کوششوں اور خدمات کااندازہ ڈاکٹر انصاری کے درج ذیل الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے جوانھوں نے بجنوری کوخراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہے تھے انھوں نے کہا تھا ''مجوزہ مسلم یونیورسٹی جب کبھی عالم وجود میں آئے گی تواس کے اندر مرحوم کے دماغ اورقلم کے نقوش ہمیشہ صاف نظرآتے رہیں گے۔ 13

قیامِ بھوپال کے دوران میں بجنوری نے انجمن ترقی اردوکوایک مفیداورکارآمد ادارہ بنانے کے سلسلہ میں بھی غیرمعمولی دلچسپی دکھائی اوراردو زبان کے فروغ اور اردو کے علمی وادبی سرمایہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے کئی تجاویز پیش کیں اوراس ذیل میں برابر مولوی عبدالحق کوتعاون دیتے رہے جس کااعتراف مولوی صاحب نے انجمن کی 1916 کی رپورٹ میں کیا ہے۔ 14

> **بجنوری کو علم وادب کاذوق اور شوق ورثے میں ملا تھا۔ ان کی ذھانت، فطانت، گھرے اوروسیع مطالعه اور فلسفیانه سوچ وفکر نے اس ذوق وشوق کی بھترین تر بیت کی اس کے علاوہ علی گڑہ کے بمبوق کلب سے وابسته رھے بعدمیں اردوزبان کے فروغ کے لیے تشکیل دی گئی 'انجمن اردوئے معلیٰ' سے وابسته ھوکر اس کی سرگرمیوں میں شریک رھے اورعلی گڑہ کالج کے بھترین مقررین میں ان کا شمارھونے لگا۔ مولانا محمدعلی کے قول کے مطابق ''وہ ایک قابلِ فخر مقرر تھے۔**

اس سلسلہ میں بجنوری نے انجمن ترقی اردو کے لیے دیوان غالب کاایک مستند اوردلکش نسخہ ترتیب دینے کا آغاز کیا۔اس سلسلہ میں غالب کے دیوان کے مختلف مطبوعہ نسخوں اوردیگراشعار وغیرہ کی تلاش وجستجو کے کام کے ساتھ انھوں نے مجوزہ نسخے کے لیے ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ بھی لکھنا شروع کیا جس کی تکمیل میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگا۔ مقدمہ مکمل ہوگیا تھا اور دیوان بھی ترتیب کی منزلوں سے گزر چکا تھا کہ بھوپال میں اگست 1918 کونواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں غالب کے دیوان کاایک ایسا قدیم نسخہ دستیاب ہوا جس میں غالب کا نوعمری کے زمانے کا بہت سے حذف شدہ کلام بھی شامل تھا۔ چنانچہ بجنوری نے انجمن کے دیوان کو نودریافت دیوان کے ساتھ مرتب کرکے شائع کرنے کا فیصلہ کیا لیکن چندماہ بعد ہی 1918 میں سارے ہندوستان کواپنی گرفت میں لینے والے مہلک مرض انفلوانزا جسے اردواخبارات نے 'جنگی بخار' کانام دیا تھا اس نے بجنوری اوران کی اہلیہ پرحملہ کردیا۔علاج معالجہ کی تمام کوششیں کی گئیں لیکن کوئی خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ پہلے ان کی اہلیہ جمیلہ بی کی وفات ہوئی اس کے چاردن بعد پنجشنبہ 7 نومبر کو بجنوری نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا اور بھوپال میں ہی لال گھاٹی پرواقع قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

بجنوری کی وفات کے بعد دیوان غالب کے لیے لکھا گیا ان کامقدمہ انجمن ترقی اردو کے رسالے 'اردو' کے پہلے شمارے جنوری 1921 میں 'محاسن کلامِ غالب' کے عنوان سے شائع ہوا۔اسی سال انجمن نے اسے علاحدہ سے 'محاسن کلام غالب' کتابی شکل میں شائع کیا۔ 1921 میں ہی بھوپال سے جب دیوان غالب کانسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوارالحق شائع ہوا تواس میں بھی اس مقدمہ کو شامل کیا گیا۔ مقدمہ (محاسن کلام غالب) میں بجنوری نے غالب کے کلام کابڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لے کراردوشاعری میں نہ صرف غالب کی شاعری کی انفرادی وامتیازی خصوصیات کی وضاحت کی ہے بلکہ اپنی غیرمعمولی علمی ادبی معلومات اورفکرانگیزی سے مغربی مفکرین، دانشوروں اورفنکاروں کےافکاروخیالات اورفنی کاوشوں کے تناظر میں غالب کی فکرانگیزی، سوچ وفکر، فلسفیانہ موشگافیوں اوربے مثال فن کاری کا جائزہ لے کر غالب کو دنیائے ادب کا بے مثل فن کار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اورغالب کو 'رب النوع' اور 'دیوانِ غالب' کو 'الہامی کتاب' قرار دیا ہے۔

بجنوری کوعلم وادب کاذوق اورشوق ورثے میں ملا تھا۔ ان کی ذہانت، فطانت، گہرے اوروسیع مطالعہ اور فلسفیانہ سوچ وفکر نے اس ذوق وشوق کی بہترین تربیت کی اس کے علاوہ علی گڑھ کے بمبوق کلب سے وابستہ رہے بعدمیں اردوزبان کے فروغ کے لیے تشکیل دی گئی 'انجمن اردوئے معلیٰ' سے وابستہ ہوکر اس کی سرگرمیوں میں شریک رہےاورعلی گڑھ کالج کے بہترین مقررین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ مولانا محمد علی کے قول کے مطابق ''وہ ایک قابلِ فخر مقرر تھے۔ 15

جہاں تک ان کی تحریری کاوشوں کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے ان کی نگارشات کی ابتدا ترجموں سے ہوئی تھی ان

کا پہلا مضمون 'بیوی کا انتخاب' ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ تھا جو 'مخزن' کے ماہ مئی 1904 کے شمارے میں شامل ہوا تھا۔ جون 1904 کے مخزن کے شمارے میں ایک اور ترجمہ 'تحائف زندگی' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ان کا طبعزاد مضمون 'بڈھا مصور' کے عنوان سے فروری 1905 کے مخزن میں شائع ہوا تھا اس کے بعد مولانا حالی پر تنقیدی مضمون رسالہ 'زمانہ' کانپور کے جنوری 1907 کے شمارے میں شائع ہوا۔ علمی موضوعات پر ان کے مقالات کا سلسلہ 'انجمن اردوئے معلّیٰ' کی نشستوں میں پیش کیے گئے۔ مقالے کا سلسلہ 'مسئلہ ارتقا اور مسئلہ کون' سے شروع ہوا تھا۔ یہ مقالہ بعد میں علی گڑھ منتھلی میں شائع ہوا تھا علمی موضوع پر ان کا دوسرا مضمون جس میں نظام عصبی اور مذہب کے رشتے کو واضح کیا گیا تھا ماخذ مذہب کی تحقیق کے عنوان سے علی گڑھ منتھلی میں شامل ہوا تھا۔ دراصل بجنوری اردو زبان کے عاشق اور اس کے ادبی سرمایے کے معتقد تھے لیکن انھیں اردو زبان میں علمی وسائنسی نوعیت کے ذخیرے کی کمی کا احساس تھا وہ اس کمی کا تدارک کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ زبان علمی اور سائنسی معلومات سے بھی مالا مال ہوسکے اس کے لیے انھوں نے صرف مشورے نہیں دیے بلکہ خود علمی موضوعات پر مقالات تحریر کرکے دوسروں کو اس طرف متوجہ کرنے کی سعی کی اردو میں علمی موضوعات کے اضافہ کے سلسلہ میں انھوں نے مسئلۂ ارتقا پر ایک تصنیف مرتب کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا جس کا پتہ مولوی عبدالحق کے درج ذیل بیان سے چلتا ہے۔

لکھنے سے پہلے انھوں نے کتاب کا ایک خاکہ کھینچا تھا............یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی...... 16

اردو میں علمی ذخیرہ کے اضافہ کے ذیل میں بجنوری ترجمہ کے حامی تھے انھوں نے اپنی تحریری سرگرمیوں کی ابتدا ترجموں سے ہی کی تھی۔ 1907 کے آخر میں جب علی گڑھ میں مولوی حمیدالدین اور مولوی وحیدالدین سلیم کی سرکردگی میں 'انجمن مترجمین' کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا تو بجنوری نے اس کی پُرزور حمایت کی تھی اور اس میں شامل ہوگئے تھے۔ بعد میں بھی وہ انجمن ترقی اردو کے کاموں کے سلسلہ میں برابر ترجمہ کی اہمیت وافادیت اور ضرورت پر زور دیتے رہے اور خود بھی اس سلسلہ میں عملی قدم اٹھائے۔ جس کا اندازہ ان کے ٹیگور کی گیتا نجلی کے بعض حصوں کے ترجموں سے ہوتا ہے۔ 17

بجنوری کی اردو زبان کی بقا اور ترقی کی شدید خواہش کی بنا پر وہ انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں وہ مولوی عبدالحق سے برابر رابطہ قائم کرتے رہتے تھے مولوی صاحب بھی ان کی آرا، مشوروں کا احترام کرتے اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے معترف تھے اس سلسلہ میں ان کے مضامین 'وضع اصطلاحات علمیہ' اور 'اردو کی ترقی کے لیے چند خیالات' قابل ذکر ہیں جو انھوں نے انجمن ترقی اردو کے اجلاسوں میں پڑھنے کے لیے تحریر کیے تھے لیکن بعض غیر معمولی مصروفیات کی بنا پر وہ اجلاسوں میں شرکت نہیں کرسکے تھے لیکن انھوں نے مقالات بھیج دیے تھے یہ مقالات ان کی وفات کے بعد رسالہ اردو میں شامل کیے گئے۔ پہلا مضمون وضع اصطلاحات علمیہ'' رسالہ اردو کے جولائی 1923 کے شمارے میں صفحہ 325 تا 340 میں اور دوسرا جولائی 1921 کے شمارے میں شامل کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ بجنوری نے دوسرے بہت سے اہم موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ان میں سے 'علم ومذہب' کے عنوان سے ایک مضمون لکھنؤ کے رسالہ 'معلومات' کے اکتوبر و نومبر 1915 کے شمارے میں شامل کیا گیا تھا اور فرانسیسی فلسفی برگسان کا خواب پر لکچر کا ترجمہ 'خواب' کے عنوان سے انجمن ترقی اردو کے رسالے 'سائنس' کے جنوری 1926 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

بجنوری کی مختلف علمی، ادبی، تحقیقی، وتنقیدی اور معلوماتی نگارشات اور ان کے اہم مکاتیب بالخصوص جو انھوں نے قیام یورپ کے دوران میں اپنے اعزّہ کو لکھے تھے ان کے فرزند فاتح فرخ نے باقیات بجنوری اور یادگار بجنوری میں جمع کردیے ہیں۔ 'باقیات بجنوری' 1940 میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا تھا اس مجموعہ میں تین مضامین، 17 مکاتیب، اور 14 مکمل منظومات شامل ہیں۔ مضامین کے عنوانات (1) گیتا نجلی (2) وضع اصطلاحات علمیہ اور (4) سیر لکھنؤ ہیں۔

دوسرا مجموعہ 'یادگار بجنوری' بھی ان کے فرزند نے ہی مرتب کیا تھا لیکن یہ محمد فاتح فرخ کی وفات کے بعد شائع ہوا............اس میں محمد فاتح فرخ کا مقدمہ شامل ہے جس پر 2 اپریل 1946 کی تاریخ درج ہے۔ یادگار بجنوری میں مولوی عبدالحق کا تعارف بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ سول اینڈ ملٹری پریس کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اندازہ ہے کہ یہ 1951 میں منظر عام پر آیا۔

یادگار بجنوری میں دس مضامین، 11 مکاتیب، تین نظمیں اور گیتا نجلی عنوان کے تحت کچھ اشعار اور مولوی عبدالحق کے نام ایک خط شامل ہے۔ 'یادگار بجنوری' میں شامل دس نگارشات کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(1) اردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات (2) بیوی کا انتخاب (3) بڈھا مصور (4) مسئلہ ارتقا اور مسئلہ کون (5) خواب (6) حالی (7) میل جول (8) لندن (9) مآخذ مذہب کی تحقیق (10) تحائف زندگی۔

اس طرح 'باقیات بجنوری' اور 'یادگار بجنوری' میں بجنوری کی نگارشات اور تخلیقات کا زیادہ تر سرمایہ محفوظ کردیا گیا ہے۔ صرف تین تحریریں ایسی ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں ہیں مکاتیب ان کے علاوہ ہیں تحریریں درج ذیل ہیں:

(1) 'سرویا میں اسلام' مطبوعہ ہمدرد دہلی (محمد علی کے اخبار) 11، و 13/ جون 1913
(2) 'بلغاریہ میں اسلام' مطبوعہ ہمدرد، 22، 24، و 28/ جون 1913
(3) 'مذہب وعلم' مطبوعہ رسالہ 'معلومات' لکھنؤ شمارہ اکتوبر نومبر 1915

بجنوری نے اردو زبان کے علاوہ انگریزی اور جرمنی زبانوں میں بھی اپنی نگارشات یادگار چھوڑی ہیں ان کی زبان دانی کے بارے میں ڈاکٹر خورشیدالاسلام لکھتے ہیں:

''وہ جدید علوم سے غیر معمولی شغف اور ان میں سے چند میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے اور عربی وفارسی کے علاوہ ترکی زبان وادب سے بھی آشنا تھے۔ انگریزی پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔ فرانسیسی، اطالوی اور جرمنی جانتے تھے۔'' 18

بجنوری کی جرمنی زبان پر دسترس کا ثبوت اگر ان کے ڈاکٹریٹ کے لیے جرمنی میں لکھے گئے ان کے مقالے 'اسلامی قانون کے ماخذات' سے ملتا ہے تو ان کے انگریزی زبان پر عبور کا اندازہ ٹیگور کی 'گیتا نجلی' کے تبصرہ اور ان کی نظموں کے تراجم اور اقبال کی مثنویات پر انگریزی میں تحریر کیے گئے مقالے سے ملتا ہے۔ مثنویات اقبال پر ان کا فکر انگیز مقالہ ڈاکٹر نکلسن کے اسرار خودی کے ترجمے سے پہلے انگریزی رسالے 'ایسٹ اینڈ ویسٹ' بمبئی کی اگست 1918 کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اس کا اردو میں ترجمہ مالک رام صاحب نے کیا جو 'مثنویات اقبال اسرار ورموز' عنوان سے 'نیرنگ خیال' لاہور کے اقبال نمبر ستمبر واکتوبر 1932 میں شائع ہوا۔ اس کے پیش نظر ڈاکٹر خورشیدالاسلام نے صحیح لکھا ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ اقبال کو یورپ سے اور ٹیگور کو اردو سے روشناس کرانے کا کام بجنوری نے ہی انجام دیا۔ 19

بجنوری کی نگارشات کا ذخیرہ اگرچہ کم ہے لیکن اس کا سرسری جائزہ لینے پر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بجنوری نے اپنی تحریروں میں صرف شعروادب کو موضوع نہیں بنایا بلکہ فلسفہ، مذہب، سیاست، سائنس، تعلیم، اخلاقیات، زبان اور اصطلاح سازی وغیرہ پر فکر انگیز افکار وخیالات کا اظہار کیا ہے۔

بجنوری کا مزاج فلسفیانہ تھا ان کا مطالعہ وسیع،

مشاہدہ گہرا اور نگاہ دوررس تھی انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا اس کی تمامتر جزئیات اور باریکیوں پر ان کی گہری نگاہ اور سنجیدہ وفلسفیانہ غوروفکر نے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرکے ایک طرح سے اس کا حق ادا کردیا ہے جہاں تک بجنوری کی تنقیدنگاری کا تعلق ہے ان کی تنقیدنگاری کا آغاز حالی پران کے مضمون سے ہوا تھا۔اس کے بعد مثنویات اقبال پران کا تبصرہ، ٹیگور کی گیتانجلی پر اظہار خیالات، محاسن کلام غالب اور بیرسٹر آصف علی کی تخلیقات پر ان کے تبصرے ان کے تنقیدی نظریات کے غماز ہیں۔

بجنوری نے اپنی غیر معمولی ذہانت، فکرانگیزی اور علم وادب کے گہرے ادراک وآگہی سے تنقید میں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے فن پاروں یافنی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے محض اظہار بیان کے معاملات ومسائل تک خود کو محدود نہ رکھتے ہوئے ایک وسیع نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور تخلیق کار کے نظریہ حیات کے ساتھ نفس مضمون کے فکری وفلسفیانہ پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے اور کسی بھی فن پارے کی قدر وقیمت کا تعین ایک مخصوص فکری، تہذیبی اور فنی سیاق وسباق میں کرنے کی کوششیں کی ہیں اس کے علاوہ جمالیات کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے جس کی بناپر ان کی تنقیدی نوعیت کی تحریروں میں بڑی دلکشی اور اثرانگیزی پیدا ہوگئی ہے۔ان کی تنقید کے بارے میں ڈاکٹر حدیقہ بیگم لکھتی ہیں:

''بجنوری نے تنقید ادب کی سرحدیں فلسفہ حیات اور عالمی تہذیبی تاریخ سے ملانے کی ابتدا کی۔بجنوری نے ادب کو تہذیبی وحدت کی حیثیت سے سمجھا، اور تنقید کو فلسفے کی گیرائی اور گہرائی سے ہمکنار کیا۔انھوں نے اردو تنقید کو رسمی اصطلاحات کے شکنجے اور روایتی فکر کی سطحیت سے نجات دلاکر ایک 'فکری جہت' سے روشناس کرایا۔انھوں نے تنقید میں فکر واظہار کی جامعیت کا جو رجحان پیدا کیا وہ آج بھی اردو تنقید کا ایک اہم اسلوب ہے''[20]

بجنوری نے نثرنگاری کے علاوہ نظم گوئی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔بجنوری کی نظم گوئی کا آغاز اگرچہ طالب علمی کے زمانے سے ہی ہوگیا تھا ان کی نظم 'قانون فنا' مخزن مارچ 1907 میں شائع ہوئی تھی لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت ان کی وفات کے بعد سامنے آئی جب مولوی عبدالحق اور آصف علی نے اس سلسلہ میں پیش رفت کی۔ بیرسٹر آصف علی نے ان کے ایک مضمون 'اوج سخن' میں بجنوری کی پانچ نظمیں (1) ناہید (2) ہندوستان (3) موسیقی (4) مجذوب (5) شمع وپروانہ سے بحث کی۔ یہ مضمون 'نقیب' بدایوں کے اگست 1920 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد مولوی عبدالحق رسالہ 'اردو' میں ان کی نظمیں شائع کرتے رہے۔'نٹ راجا' جنوری 1924 کے شمارے میں 'صبح بنارس' اپریل 1925 کے شمارے میں 'معلم الملکوت' جولائی 1926 کے شمارے میں اور 'اجنبی' جولائی 1928 کے شمارے میں شائع ہوئیں۔ان کے علاوہ 'دعا' اگست 1927 'یادگل' عید نمبر 1927 اور 'داعی اجل' جو ٹیگور کی تخلیق کا ترجمہ ہے۔عید نمبر 1928 کے 'نیرنگ خیال' لاہور میں شامل کی گئیں۔

ان میں سے ناہید، ہندوستان، موسیقی، مجذوب، شمع وپروانہ، صبح بنارس، معلم الملکوت، اجنبی، دعا اور یادگل باقیات بجنوری میں شامل کی گئی ہیں۔اور نٹ راجا باقیات بجنوری میں شامل ہے۔'داعی اجل' دونوں مجموعوں میں نہیں ہے۔ان منظومات کے علاوہ 'باقیات بجنوری' میں 4 نظمیں اور تین شعر اور شامل ہیں۔نظموں کے عنوانات ہیں (1) بچے اور بڑے (2) ڈارون (3) بندے ماترم (4) ترکی قومی گیت، باقیات بجنوری میں مذکورہ نظموں کے علاوہ ایک قطعہ 'رنگ مانند بشب' ٹیگور کی گیتانجلی کے ترجمہ پر مشتمل چند شعر (جو گیتانجلی کے تبصرے میں شامل کیے گئے ہیں) اور بائیس اشعار اور ایک مصرع اور شامل کیا گیا ہے۔

بجنوری کے مقالات اور منظومات کے علاوہ ان کے مکاتیب خصوصاً وہ مکاتیب جوانھوں نے اعلیٰ تعلیم کے دوران میں بیرون ممالک سے ان کے والد محترم اور احباب کو تحریر کیے ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔خطوط کے مطالعہ سے بجنوری کی باریک بینی، غیر معمولی قوت مشاہدہ، وسعت النظری اور گہرے غوروفکر کے علاوہ ان کی مذہبی، تہذیبی، سماجی، سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور بیرون ممالک کے سیاسی، تمدنی اور ثقافتی معاملات اور حالات سے ان کی غیر معمولی آگہی کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں رہ کر انھوں نے علمی وادبی ہستیوں خصوصاً مولوی عبدالحق اور آصف علی وغیرہ کو جو خطوط لکھے ہیں وہ بھی ان کی علم وادب اور زبان کے مختلف معاملات پر گہرے اور سنجیدہ غور وفکر کے غماز ہیں۔ ان کے بیشتر خطوط باقیات بجنوری اور یادگار بجنوری میں شامل ہیں۔لیکن ڈاکٹر سید حامد حسین کے قول کے مطابق ابھی بہت سے خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔[21]

> بجنوری نے اپنی غیرمعمولی ذہانت، فکرانگیزی اور علم وادب کے گہرے ادراک وآگہی سے تنقید میں بھی اپنی انفرادیت کاثبوت دیا ہے۔ انھوں نے فن پاروں یافنی کاوشوں کاجائزہ لیتے ہوئے محض اظہار بیان کے معاملات ومسائل تک خود کو محدود نہ رکھتے ہوئے ایک وسیع نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور تخلیق کار کے نظریہ حیات کے ساتھ نفس مضمون کے فکری وفلسفیانہ پہلوئوں پر زیادہ زوردیا ہے اورکسی بھی فن پارے کی قدروقیمت کاتعین ایک مخصوص فکری، تہذیبی اورفنی سیاق وسباق میں کرنے کی کوششیں کی ہیں اس کے علاوہ جمالیات کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے جس کی بناپر ان کی تنقیدی نوعیت کی تحریروں میں بڑی دلکشی اور اثرانگیزی پیدا ہوگئی ہے۔

بجنوری نے اپنی مختصر زندگی میں علم وادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کے پیش نظر بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہماری ادبی تاریخ کی ایک ایسی دانشور ہستی تھی جس کی نظیر اگر معدوم نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

حواشی:

(1,2) یادگار بجنوری از فاتح فرخ،ص 6
(3) اردو ادب کے خالق، از ڈاکٹر شہزاد بانو دہلوی، مطبوعہ یوپی اردو اکادمی، 2012
(4) عبدالرحمٰن بجنوری مشمولہ 'تحریر' جنوری-مارچ 1973، ص 49
(5) محمڈن کالج ڈائریکٹری 1907
(6) منقولہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا قومی شعور (مکتوب ڈاکٹر سید محمود بنام محمد قاسم صدیقی) از ڈاکٹر سید حامد حسین 'غبار خاطر' اورنگ آباد جنوری 1975 ص 177
(7) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، از ڈاکٹر سید حامد حسین تحریر دہلی، جنوری-مارچ 1973، ص 50
(8) رسالہ تحریر دہلی، از ڈاکٹر حامد حسین، جنوری-مارچ 1973، ص 55
(9) یادگار بجنوری، از فاتح فرخ، ص 18
(10) عبدالرحمٰن بجنوری۔ مجوزہ مسلم یونیورسٹی مرادآباد، 1915، ص 4
(11) عبدالرحمٰن بجنوری، مجوزہ مسلم یونیورسٹی، ص 3
(12) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 16 مئی 1917، ص 2
(13) تقریر ڈاکٹر مختار احمد انصاری، صدر جماعت استقبالیہ آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس یازدہم دہلی، 30 دسمبر 1918، ص 4
(14) رپورٹ اجلاس سی ام آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، ص 93
(15) روئداد نمبر 65، اجلاس ٹرسٹیاں مدرسۃ العلوم علی گڑھ منعقدہ 30 جنوری 1916
(16) رپورٹ اجلاس انجمن ترقی اردو منعقدہ ماہ دسمبر 1918، ص 120
(17) اس سلسلہ کے شواہد آصف علی کے مضمون گیتانجلی۔تمدن جولائی 1916، ص 42
(18) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، از ڈاکٹر خورشید اسلام مشمولہ 'تنقید کے بنیادی مسائل' مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص 51-250
(19) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مشمولہ 'تنقید کے بنیادی مسائل' مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص 268
(20) نقد بجنوری، از ڈاکٹر حدیقہ بیگم صفحہ 150
(21) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریرات، مشمولہ شاعر، بمبئی نومبر 1973

■

Afaque Husain Siddiqi
D-136, Firdos Nagar
P.G.B.T.College Road, D.I.G. Benglow
Bhopal - 462038 (M.P.)
Mob:09229673388

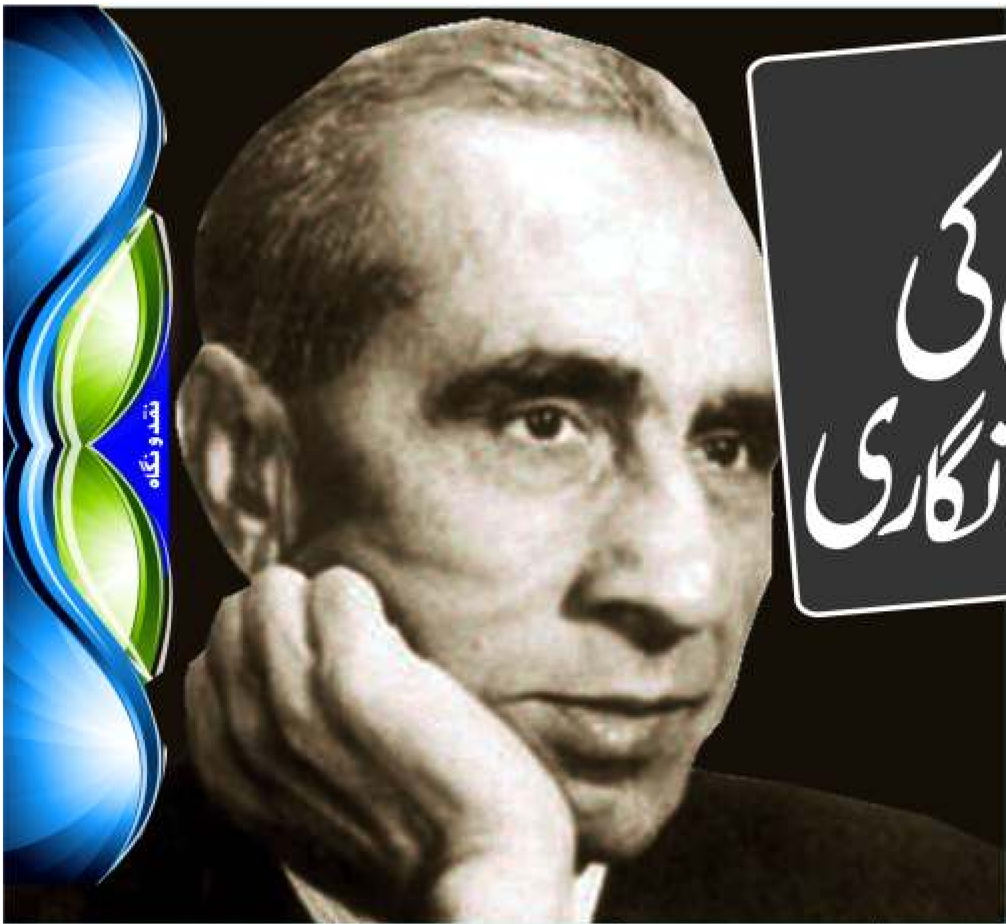

پطرس کی مزاح نگاری

مسعود جامی

پطرس اردو کے ان خوش نصیب ادیبوں میں ہیں جنھوں نے اپنے محدود تخلیقی سرمایے کے باوجود نمایاں مقام حاصل کیا۔ پطرس کی تخلیقی کاوشیں صرف چند مضامین کا احاطہ کرتی ہیں اور انھی پر ان کی شہرت کا تمام تر دارومدار ہے۔ وہ بلاشبہ اردو میں مزاح نگاری کے سب سے بڑے بلکہ تنہا علم بردار ہیں، اس فن میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ آخر پطرس کا سبب امتیاز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ان کے مضامین سے براہِ راست رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن اس سے بھی پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فن مزاح نگاری کی نمائندہ خصوصیات کی حد بندی کردی جائے تاکہ مضامین کے جائزے کے لیے ایک پس منظر فراہم ہوسکے۔

بہ قول اسٹیفین پی کاک ''مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فن کارانہ اظہار ہوجائے'' انسان زندگی کے راست پہلوؤں کو دیکھنے کا عادی ہے جب اسے زندگی یا ماحول میں کجی اور بے اعتدالی نظر آتی ہے تو اس کی توقعات متاثر ہوتی ہیں اور اس کی فطرت میں احتجاج پیدا ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کے اندر دو طرح کے جذبے سر ابھارتے ہیں ...... ایک نفرت اور دوسرا ترحم کا جذبہ۔ یہی جذبے جب الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو طرز اظہار کے دو رخ سامنے آتے ہیں یعنی طنزیہ اور مزاحیہ۔ طنزیہ اظہار ناہمواریوں سے نفرت کا نتیجہ ہے جب کہ مزاحیہ اظہار ان سے انسیت اور شگفتگی کا مظہر۔ اول الذکر میں تلخی، برہمی، نفرت اور نشتریت کی لے تیز ہوتی ہے، جب کہ مؤخر الذکر میں پیار، محبت، خلوص اور ہمدردی کی ہلکی اور دھیمی لہریں اٹھتی ہیں۔ گویا طنز نگار ایک جراح ہوتا ہے جو سماج اور زندگی کے ناسوروں کے فصد کو بے رحمی کے ساتھ کھولتا ہے اور مزاح نگار ایک مرہم جو ہوتا ہے جو بغیر تکلیف و آزار کے ناسوروں کا علاج پیار و محبت کے ساتھ کرتا ہے۔ طنز و مزاح میں فرق محض ردعمل اور طرز اظہار کا ہوتا ہے ورنہ دونوں کا نصب العین یکساں ہوتا ہے۔ دونوں ہی زندگی کی بے اعتدالی، کجی اور بے ڈھنگے پن کو ابھار کر اعتدال اور راستی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ طنز و مزاح کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ

''ہمارے یہاں طنز و مزاح کے فرق کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے۔ طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا اور اسے تبدیل کردینے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مزاح زندگی اور ماحول سے مفاہمت کی پیداوار ہے اور مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے محبت کرتا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے اور توڑنے کے دوران فاتحانہ قہقہہ لگاتا ہے۔ چنانچہ طنز میں جذبۂ افتخار کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ دوسری طرف مزاح نگار اپنی ہنسی سے ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑتا ہے اور بڑے پیار سے ناہمواریوں کو تھپکنے لگتا ہے چنانچہ مزاح میں غالب عنصر ہمدردی کا ہوتا ہے۔''

زندگی اور ماحول کے بے ڈھنگے پن پر برہمی کا اظہار کرنا قدرے آسان ہے، لیکن ناہمواریوں پر شفقت و محبت کا ہاتھ پھیرنا بہت مشکل۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ایک مخصوص قسم کی شخصیت درکار ہوتی ہے.... ایسی شخصیت جو اعلیٰ حوصلگی، خلوص اور ہمدردی کی مظہر ہو۔ اور جسے خود رو رو کر دوسروں کو ہنسانے کا طریقہ آتا ہو۔ غالب کو یہ فن اچھی طرح آتا تھا۔ ان کے مکتوبات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پطرس کا نام بھی بڑے شوق سے لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی زندگی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اپنی کشادہ دلی اور وسعت نظر کے تحت زندگی کی ناہمواریوں سے محظوظ ہوئے۔ انھوں نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے وقت یا کردار کی بوالعجبیوں یا واقعہ کی بے اعتدالیوں کو اجاگر کرتے وقت ہمدردانہ انداز نظر کا مظاہرہ کیا، جو ان کے مزاج کی صحت مندی کی دلیل ہے۔ میرے خیال میں پطرس نے اپنے طریقۂ کار کی نشان دہی اپنے دیباچہ میں اشارۃً کردی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اگر آپ نے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ اس کتاب کو اچھی سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بہ جانب ثابت کریں۔''

یہاں کتاب خواں طبقے سے مزاح نگار کی ہمدردی، احسان مندی اور دل دہی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کتب بینی کے سلسلے میں لوگوں میں مذکورہ تینوں رویے عام رہے ہیں۔ یعنی مفت حاصل کرکے، چرا کر اور خرید کر پڑھنے کا لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب کے سب طریقے راست نہیں ہوسکتے ان میں کجی بھی ہے۔ لیکن پطرس

انھیں ہدفِ ملامت نہیں قرار دیتے۔ اس کے برعکس وہ ان سے ہمدردی جتاتے اور احسان مندی کا اظہار کرتے ہیں۔

مزاح نگاری ہی کے قبیلے سے تعلق رکھنے والی ذکاوت (Wit) بھی ہے جس میں لفظی الٹ پھیر سے سامانِ ظرافت فراہم کیا جاتا ہے۔ غالب کو اس فن میں کمال حاصل تھا انھیں لفظوں کے الٹ پھیر سے ظرافت پیدا کرنے کا سلیقہ خوب آتا تھا۔ پطرس کے یہاں بھی ذکاوت کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن یہ ان کا طرزِ عام نہیں۔ انھوں نے اپنی مزاح نگاری کی عمارت کو صورتِ واقعہ کی اساس پر استوار کیا ہے، وہ کسی مضحک کیفیت کو ابھارنے کے لیے صورتِ واقعہ کو ایک خاص سلیقے سے اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ وہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالات و واقعات کی تہہ سے مزاح کے سوتے از خود پھوٹ رہے ہیں۔ ہاسٹل میں پڑھنا، سویرے جب کل آنکھ میری کھلی، مرید پور کا پیر، سنیما کا عشق، میں ایک میاں ہوں، مرحوم کی یاد میں، انجام بخیر، میبل اور میں، یہ تمام کے تمام مضامین واقعات کی فن کارانہ ترتیب ہی کا نتیجہ ہیں۔ ہاسٹل میں پڑھنا، میں ایک طالب علم کی ناآسودہ خواہش اور بزرگوں کے محتاط رویے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ متمول گھرانے کا یہ طالب علم بہت کم نمبروں سے پاس ہوجاتا ہے، والدین کی آرزو ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ اس کا داخلہ لاہور یونیورسٹی میں ہوجاتا ہے، لیکن اس کے چاہنے کے باوجود اسے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں ملتی، نتیجہ کے طور پر اس کے ذہن میں تصادم جنم لیتا ہے۔ پطرس نے طالب علم کی ذہنی کشکش اور نفسی کیفیت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ نہایت عمدہ اور پرلطف ہے۔ طالب علم ہاسٹل میں رہنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے نت نئے حربے استعمال کرتا ہے۔ والدین کو رضامند کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل پیش کرتا ہے، لیکن سب لاحاصل اور بے سود۔ جب وہ سات سال تک متواتر امتحان میں ناکام ہوتا ہے تو اس کے والدین کچھ اس کی تعلیم سے مایوس اور کچھ اس کے کیریئر سے ناامید ہوکر اسے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ لیکن سوئے اتفاق وہ اس سال پاس ہوجاتا ہے اور اس طرح اس کی ہاسٹل میں رہنے کی خواہش دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے۔

''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' میں وہی طالب علم نہایت عیش کوش اور تساہل شعار نظر آتا ہے۔ سو کر دس بجے اٹھنا اس کا معمول ہے۔ امتحان جب سر پر آجاتا ہے تو وہ مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نظام الاوقات میں تبدیلی لاتا ہے۔ کتابوں کو آراستہ کرتا ہے اور صبح کو

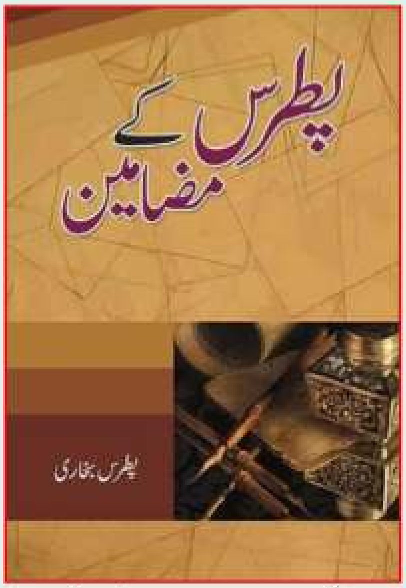

جگا دینے کی ذمہ داری اپنے پڑوسی لالہ کے سپرد کرتا ہے۔ لالہ جی علی الصباح اسے جگا بھی دیتے ہیں لیکن اس کی ازلی تساہل پسندی اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ پھر لمبی تان کر سو جاتا ہے۔ دن میں لالہ جی کے استفسار پر بہانے بنا دیتا ہے کہ نماز میں مشغول تھا۔ یہاں مزاح نگار نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانی عادات جب جڑ پکڑ لیتی ہیں تو بہت طاقتور ہوجاتی ہیں۔ خارجی پابندیوں سے اس کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ اور اگر اس کا کبھی موقع بھی آجائے تو وہ اپنے فطری بہاؤ کے لیے بہانے تراش لیتی ہیں۔ پطرس نے باتوں ہی باتوں میں انسانی نفسیات کے ایک اہم نکتے کو پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے طالب علم کے جاگنے اور لحاف کے ناک سے کان اور پھر کان سے سرتک سرکنے کا جو منظر پیش کیا ہے اس کی کیفیت کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

''صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے منہ نکالا، ان کو گڈ مارننگ کہا اور نہایت بے دردانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہوکر باہر چلے گئے، ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ ہم آج فوراً ہی جاگ اٹھے تھے۔ دل سے کہا 'دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے 'ہم تو یونہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔ دل نے کہا اور کیا'' تمہارے تو یونہی اوسان خطا ہوجایا کرتے تھے۔'' ہم نے کہا'' سچ کہتے ہو یعنی ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہمارے قریب سے گزر جائیں..... ناک کو ذرا سی سردی محسوس ہوئی تو اس کو ذرا یوں ہی لحاف کی اوٹ میں کر دیا اور پھر سوچنے لگے'' خوب ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں بس ذرا اس کی عادت ہوجائے تو آئندہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کردیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز روز الحاد کی طرف مائل ہوتے جارہے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کرلیں گے۔ اکبر بے چارہ یہ کہتا کہتا مرگیا لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ لحاف کانوں پر سرک آیا..... تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں..... بہت ہی پہلے..... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ خداوندا! یہ کالج والے بھی کس قدر سست ہیں۔ ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوجایا کرے۔

(لحاف سر پر) بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے.....''

اقتباس قدرے طویل ہوگیا۔ لیکن اپنی بات کی وضاحت اور طالب علم کی ذہنی اور نفسی کیفیات اور اس کی حرکات و سکنات کا لطف دکھانے کے لیے یہ ضروری تھا۔ اس اقتباس میں خود کلامی کی تکنیک سے جو کام لیا گیا ہے وہ کردار کی داخلی کیفیت کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مزید برآں اس میں شعور کی رو کی تکنیک کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ یہی صورت حال ان کے تمام مضامین میں پائی جاتی ہے۔

مزاح نگاری کے لیے صورتِ واقعہ پر فن کارانہ گرفت ناگزیر ہے۔ پطرس اس فن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ واقعہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایک مخصوص فضا کی تخلیق کرتے ہیں جس کے تحت قاری کے اندر توقعات اور تجسس جنم لیتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ مزاح نگار کا قلم خطِ مستقیم پر چلتے چلتے اچانک ایک نیا موڑ اختیار کرلیتا ہے اور مضمون کا خاتمہ بڑا ہی اتفاقی اور ناگہانی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کی قائم کردہ توقعات ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ توقعات کے قائم ہونے اور اس کے ریزہ ریزہ ہوکر بکھرنے سے ایک ایسی مضحک صورتِ حال جنم لیتی ہے جو قاری کو ابتسام پر مجبور کرتی ہے۔ یہ کیفیت مرید پور کا پیر، ہاسٹل میں پڑھنا، میبل اور میں، میں نمایاں طور پر ابھری ہے۔ مرید پور کا پیر، ایک خود ساختہ اور نقال لیڈر کی پرلطف داستان ہے۔ یہ لیڈر عملی زندگی سے دور ہے، اس کے پاس اپنی کوئی فکر نہیں، وہ فن خطابت سے بھی نابلد ہے۔ مانگے تانگے کے الفاظ اور جملوں سے وہ اپنی تقریر کا تانا بانا بنتا ہے۔ لیکن عین موقع پر اس کا ذہن ماؤف ہوجاتا ہے۔ الفاظ اور جملے یاد نہیں آتے۔ بوکھلاہٹ میں دورانِ خطاب اس کی زبان سے جو فقرے ادا ہوتے ہیں وہ انتہائی بے ربط اور مضحکہ

خیز ہوتے ہیں۔ یہاں مزاح نگار نے لیڈر موصوف کی مضحک صورت حال کو منظر عام پر لاکر مزاح کا رنگ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اس عمل کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ خیالی اور عملی زندگی میں بہت فرق ہے نیز یہ بھی کہ لیڈری کے لیے کچھ خلقی صفات ہوتی ہیں جو سب کو ودیعت نہیں ہوتیں۔

پطرس کی مزاح نگاری میں موضوعات کی عمومیت کا بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے لیے کسی وقتی یا ہنگامی مسائل کا انتخاب نہیں کیا۔ بلکہ ایسے موضوعات لیے جن سے روز ہی ہم دوچار ہوتے ہیں۔ پطرس کا مشاہدہ وسیع اور عمیق ہے۔ انھوں نے ایک حقیقی فن کار کی طرح زندگی کے معمولی سے معمولی پہلوؤں کو بھی بڑی باریک بینی اور خلوص اور ہمدردی کے ساتھ دیکھا، اس کی ناہمواریوں کو محسوس کیا اور اپنے جادو نگار قلم سے انھیں منظر عام پر لایا۔ مذکورہ مضامین کے موضوعات بھی عمومی نوعیت کے حامل ہیں۔ طالب علم کی زندگی اور لیڈروں کی مضحکہ خیزیاں بلاتخصیص وقت اور مقام دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ہمہ دم تازہ اور نیا ہے۔ 'سنیما کا عشق' میں بھی ایک ایسے ہی موضوع کو برتا گیا ہے۔ اس میں پطرس نے اپنے دوست مرزا صاحب کی غفلت شعاری اور تساہل پسندی کو بے نقاب کیا ہے۔ ہر چند مزاح نگار نے کوشش کی کہ مرزا صاحب کے رویے میں فرق آجائے لیکن سب بے سود اور وہ جب بھی سنیما گئے تو لیٹ ہی پہنچے۔ 'مرحوم کی یاد میں' بھی مرزا اپنی عیاری اور ہشیاری سے اپنی شناخت کرواتے ہیں اور وہ اپنے دوست کے ہاتھوں ایک از کار رفتہ سائیکل بیچ کر رقم اینٹھ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ واقعات ایسے ہیں جو آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ دھوکہ بازی، عیاری، مکاری، غفلت شعاری کا چلن کم از کم ہمارے معاشرے میں تو عام ہے۔ پطرس نے انھیں ایک واقعہ کی صورت عطا کی ہے۔

'ببل اور میں' 'اور' 'میں ایک میاں ہوں' میں مزاح نگار نے عورت اور مرد کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے اور مضمون کی صورت میں ایک ایسا آئینہ پیش کر دیا ہے جس میں عورتیں اور مرد اپنے ذاتی خصائص اور داخلی کیفیات کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ببل اور واحد متکلم دونوں ایک ہی یونیورسٹی کے طالب ہوتے ہیں۔ دونوں کتابیں خریدتے ہیں خود پڑھتے اور ایک دوسرے کو پڑھواتے ہیں۔ بعد ازاں اس پر رائے زنی کرتے ہیں۔ اس رائے زنی میں دونوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی آواز زیادہ بلند اور زیادہ پائیدار ہو۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی یہ خواہش ان کی صنفی برتری کے احساس کی زائیدہ ہوتی ہے۔ 'مَیں' 'ایک بار بیمار پڑ جاتا ہے۔ ببل جب اُس کی عیادت کو آتی ہے تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے تمام کتابوں پر بغیر پڑھے ہی تبصرہ کیا تھا۔ 'ببل' زیر لب مسکراتی ہے۔ اس کی مسکراہٹوں میں بھی ایک راز پوشیدہ ہے۔ اس راز کی نقاب کشائی اس وقت ہوتی ہے جب واحد متکلم کتاب کھولتا ہے تو اس کے اوراق جڑے ہوئے پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ببل بھی اسی غلطی کا ارتکاب کرتی رہی تھی۔ اس مضمون کو ایسے مبصروں کے طنز پر محمول کیا ہے جو بغیر کتاب پڑھے ہی رائے زنی کے عادی ہیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں اور طنز و مزاح کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے نتیجے میں ہے۔ اس مضمون میں کہیں بھی طنز کی نشتریت اور لہجے کی تلخی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس پطرس کے لہجے میں ہمدردی اور انسیت کی جھلک ملتی ہے جو اسے خالص مزاح کے زمرے میں لے جاتی ہے۔ پطرس کے معرکہ آرا مضمون 'کتے' کے سلسلے میں بھی اسی طرح کا خیال ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ پطرس نے کتوں کے ہنگامے کو مشاعروں سے موازنہ کرکے مشاعرہ کا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن وزیر آغا نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں ''پطرس کے مضمون کتے کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشاعروں کو کتے کے ہنگامے سے تشبیہ دے کر پطرس نے مشاعرے پر طنز کی ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ اول تو پطرس کا سارا لہجہ ہی ہمدردی اور توازن سے مملو ہے۔ دوسرے اس میں نشتریت کا عمل ناپید ہے۔ تیسرے طنز کا طرۂ امتیاز کہ طنز نگار خود کو اس ناہمواری سے بلند و بالاتر تصور کرتا ہے جسے وہ نشانۂ طنز بناتا ہے..... اس تشبیہ میں موجود نہیں۔ پطرس کا یہ کہنا کہ ہم نے کھڑکی میں سے کئی بار آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعے پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا اس بات پر دال ہے کہ مصنف نے اس موازنے میں اپنی ذات

کو شامل کرکے طنز کو پوری طرح کند کر دیا ہے۔

پطرس نے کوئی مثالی کردار ایسا پیدا نہیں کیا جو میاں خوجی، آزاد، یا اسی قسم کے کرداروں کا ثانی قرار دیا جاسکے۔ ہاں انھوں نے واحد متکلم کا ایک کردار ضرور پیش کیا ہے جو اپنی ناہمواریوں اور خامیوں کی وجہ سے ظرافت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ لیکن اسے زندہ جاوید ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ پطرس کے یہاں کردار نگاری ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ اپنی تمام تر توجہ واقعہ نگاری پر صرف کرتے ہیں۔

پطرس بلاشبہ ایک بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔ ان کی مزاح نگاری اکتسابی نہیں بلکہ عطیۂ غیبی ہے۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور عمیق ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے بھی بڑے راز داں ہیں۔ ہماری کمزوریاں ان کی نظروں میں مترشح ہوتی ہیں۔ لیکن وہ ان پر طنز کا وار نہیں کرتے بلکہ انھیں تراش خراش کر ایک آئینہ کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں جس میں ہم خود اپنی حماقتوں کے عکس دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں۔ وہ اپنے مزاح کے لیے کسی وقتی یا ہنگامی موضوعات کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ روز مرہ کے مسائل کو لے کر اپنی فن کارانہ مہارت سے انھیں زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔ ان کی ظرافت لفظوں کی ظرافت نہیں بلکہ واقعات کی ظرافت ہے۔ ان کے یہاں مزاح کے سوتے واقعات کی سرزمین ہی سے پھوٹتے ہیں اور اہل ذوق کی تشنگی کو سیراب کرتے ہیں۔ فضا آفرینی کا سلیقہ انھیں خوب آتا ہے اور اس سے وہ مضمون میں دل چسپی پیدا کرنے میں بڑا کام لیتے ہیں۔ پطرس کی زبان سادہ اور پرکار ہوتی ہے۔ جملے مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔ ان میں شگفتگی اور سلاست بھی ہوتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ اَدق اصطلاحی الفاظ کا استعمال کرکے اپنی علمیت کی دھونس نہیں جماتے بلکہ سیدھے سادے اور روز مرہ کے الفاظ میں ہی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے پطرس بخاری کے سلسلے میں بجا طور پر کہا ہے کہ ''اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے بہ اتفاق آرا کس کو اپنا نمائندہ منتخب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا ہے۔''

■

Masood Jami
Jami Enclave, C-1, Jamia Nagar
Ranchi - (Jharkhand)
Mob:9504969822

بسنت
خسرو کی شاعری کے حوالے سے

شریف احمد قریشی

موسم سرما میں شدید سردی کے باعث نباتات پژمردہ اور حیوانات کی طبیعتیں منقبض ہو جاتی ہیں۔ بسنت رُت یعنی موسمِ بہار میں سیلانِ خون کے سبب طبیعتوں کا شگفتگی، جوش اور اُمنگ سے بھر جانا عین فطرت ہے۔ اس موسم میں آفتاب سمتِ دکن سے طرب انگیز سامان کے ساتھ پلٹتا ہے اور نباتات و حیوانات میں تازہ زندگی کی روح پھونک دیتا ہے۔ پیڑ پودوں کی شاخوں پر سبز کونپلیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ چڑیوں کے مسحور کُن نغمے اور نیچر کا بہار راگ غم ناک و نم ناک فضاؤں کو خوش گوار بنا دیتا ہے۔

بسنت رُت یعنی موسمِ بہار کا استقبال کرنے کے لیے ماگھ کے مہینے کی پانچویں تاریخ کو نہایت دھوم دھام سے جشن کا آغاز کیا جاتا ہے جسے بسنت پنچمی کہتے ہیں۔ یہ جشن کہیں ایک ہفتے اور کہیں پندرہ دنوں تک مسلسل چلتا رہتا ہے۔ مخصوص مندروں اور بعض مقامات پر بسنت کے میلوں کا انعقاد نہایت دھوم دھام سے کیا جاتا ہے۔ اس دن وشنو اور کام دیو یعنی موکلِ عشق کی پرستش کی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی دن علم کی دیوی سرسوتی کا اس عالمِ رنگ بو میں ظہور ہوا تھا اس لیے اس دن کو سرسوتی دیوی کے یومِ پیدائش کے طور پر بھی منایا جاتا ہے۔

امیر خسرو سے پہلے مسلمانوں میں بسنت اور بسنت کے میلوں کے انعقاد کا دستور نہ تھا۔ خسرو وہ پہلے مسلم ہیں جنھوں نے دہلی میں تیرہویں صدی عیسوی میں بسنت کے جشن کی شروعات کی۔ اس کے بعد صوفیاے کرام بالخصوص خاندانِ چشتیہ سے وابستہ بزرگانِ دین کی مزاروں، درگاہوں اور خانقاہوں میں بسنت کے جشن اور میلے نہایت دھوم دھام سے منعقد کیے جانے لگے جس کا سبب یہ ہے کہ امیر خسرو کے پیر و مرشد حضرتِ نظام الدین اولیاء اپنے بھانجے تقی الدین نوح کو اس قدر چاہتے تھے کہ ذرا دیر کی مفارقت بھی اُنھیں ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ تقی الدین نوح کو بھی اپنے ماموں حضرتِ نظام الدین اولیاء سے بے حد اُنس تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد دُعا مانگتے تھے کہ اُن کی عمر اُن کے ماموں کو لگ جائے تاکہ اُن کے روحانی فیض کا چشمہ عرصۂ دراز تک جاری رہے مگر مشیتِ ایزدی کہ ایک روز اچانک وہ اُٹھتی جوانی ہی میں اس جہانِ فانی سے اُٹھ گئے۔ نظام الدین اولیاء کو اپنے بھانجے کے انتقال کا اس قدر رنج و ملال ہوا کہ وہ گُم صُم رہنے لگے۔ تقریباً چھ ماہ کا عرصہ اسی کیفیت میں گزر گیا۔ امیر خسرو اپنے مُرشد کی اس حالت سے نہایت فکر مند تھے اور ہر لمحہ کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح اُن کا غم غلط ہو۔

ایک روز حضرتِ نظام الدین اولیاء اپنے مریدوں اور مصاحبین کے ساتھ تالاب کی سیر کو نکلے۔ کسی وجہ سے امیر خسرو پیچھے رہ گئے۔ راستے میں اُن کی نظر ایک جمِ غفیر پر پڑی۔ بسنت پنچمی کا دن تھا۔ کالکا جی کے مندر کے احاطہ میں بسنت کا میلہ لگا ہوا تھا۔ بیشتر شرکاء زرد لباس زیبِ تن کیے ہوئے موجِ مستی اور عقیدت کے عالم میں گا بجا رہے تھے۔ وہ دیوی کو خوش کرنے اور اُس کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے سرسوں کے پھولوں کے ہار، گجرے اور پھولوں سے سجی ہوئی گاگریں نذر کر رہے تھے۔ امیر خسرو کو اُسی وقت خیال آیا کہ وہ بھی اپنے مغموم و رنجور مُرشد کو اسی طرح خوش کر سکتے ہیں۔ اُنہوں نے اُسی وقت فارسی اور ہندی زبان میں کچھ اشعار موزوں کیے۔ اس کے بعد اپنی دستار کو کھول کر کچھ پیچ اِدھر اُدھر لٹکائے، اُن میں سرسوں کے پھولوں کے گچھوں کو اُلجھا کر جھومنے لگے اور یہ مصرع کہ ''اشک ریز آمدہ است بہار'' کو لحنِ خاص میں بار بار پڑھتے ہوئے تالاب کی سمت روانہ ہوئے۔ حضرتِ نظام الدین اولیاء اُس وقت اپنے بھانجے کی مزار پر تھے اُنھوں نے دور سے ملاحظہ کیا کہ آج امیر خسرو عجیب رنگ میں ہیں۔ مستانہ چال اور معشوقانہ انداز میں خراماں خراماں نیم بے خودی کی حالت میں اُن کی طرف بڑھ رہے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو نہ روک

سکے اور اپنے رنج وغم کو بھلا کر جیسے ہی خسرو کی جانب بڑھے تو خسرو نے آبدیدہ ہو کر اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بے تابانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

اشک ریز آمدہ است بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

دوسرے مصرع کے سُنتے ہی حضرت نظام الدّین اولیاء بے قرار و بے تاب ہو گئے اور ایسے مدہوش ہوئے کہ اُسی رنگ میں رنگ گئے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ بیشتر صوفیائے کرام کی مزاروں ، درگاہوں اور خانقاہوں میں بسنت کی گاگریں چڑھنے لگیں اور میلے لگنے لگے۔ لوگ ہاتھوں میں کنول کے پھول اور گڑوے لیے ہوئے تقی الدّین نوح کی مزار پر جاتے ہیں اور قوّال ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر خسرو کے مصرع ''عرب یار توری بسنت منائی'' کو بار بار والہانہ انداز میں پڑھتے ہیں۔

امیر خسرو نے مسلمانوں میں بسنت کو رواج ہی نہیں دیا بلکہ بسنت کے تعلق سے کئی قابل قدر اور ناقابل فراموش گیت بھی لکھے جو عوام وخواص میں حددرجہ مقبول ہوئے۔ اُن کے گیت بسنت کی تقریبات میں نہایت ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ دیکھیے وہ بسنت کے موقع پر کس انداز سے اپنے پیر ومرشد حضرتِ نظام الدّین اولیاء سے گویا ہوتے ہیں۔

موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے
تو تو صاحب مرا محبوب الٰہی
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے

ہمری چنریا، پیا کی پگڑیا
وہ تو دونوں بسنتی رنگ دے
تو تو صاحب مرا محبوب الٰہی

جو کچھ مانگے رنگ کی رنگائی
مورا جوبن گروِیں رکھ لے
تو تو صاحب مرا محبوب الٰہی

آن پڑی دربار تہارے
موری لاج شرم سب رکھ لے
تو تو صاحب مرا محبوب الٰہی
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے

حضرتِ نظام الدّین اولیاء سے روحانی فیض حاصل کرنے والوں میں امیر خسرو کو اوّلیت وافضلیت حاصل ہے۔ پیر ومرشد کی تربیت ہی کی وجہ سے وہ کئی سال تک صائم الدہر رہے اور عشقِ الٰہی کی سوزش میں تپتے رہے۔ صوفیانہ اندازِ نظر میں انسان دوستی اور باہمی رفاقت کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خسرو کے تخلیقی مزاج میں انسانیت اور ہندوستانیت پائی جاتی ہے۔ اُن کی صوفیانہ فکر بے جا تکلّفات سے مبرّا ہے۔ وہ رواداری اور وسیع النظری کا پیکر تھے۔ انسانیت اُن کا مذہب تھا۔ وہ طبقاتی امتیازات اور عقائد کے بندھنوں سے آزاد باہمی یگانگت اور صلحِ کُل کے علم بردار صوفی منش شاعر تھے۔ اُنہوں نے ہندوستانی رسم ورواج اور بالخصوص ہندوؤں کے تیوہار بسنت سے متعلق نہایت خلوص، یگانگت اور جوش وولولے کے ساتھ اپنے افکار کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے عوام کی بول چال اور گفتگو کو اشعار کے پیکر میں ڈھال کر عوامی زبان کو فروغ دیا۔ پریم مارگی سنت اور صوفی اپنے گرو، مرشد یا مالکِ حقیقی کو پیا اور خود کو اُس کی بِرہ یا یا دیوانی تصوّر کرتے ہیں۔ بسنت سے متعلق خسرو کے بیشتر گیت اسی نظریے کے عکّاس وآئینہ دار ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آج بسنت منالے سُہاگن ، آج بسنت منالے
انجن منجن کر پیا موری، لمبے نیر لگائے

تو کیا سووے نیند کی ماتی، سو جاگے تیرے بھاگ سُہاگن
آج بسنت منالے سُہاگن ، آج بسنت منالے

اونچی نار کے اونچے چتون، ایسو دیو ہے بنائے
شاہِ امیر توہے دیکھن کو ، نینوں سے نینا ملائے

آج بسنت منالے سُہاگن ، سہاگن آج بسنت منالے

امیر خسرو کی شاعری میں بسنت رُت کی جوسرشاری و بے خودی نظر آتی ہے وہ موسمِ بہار سے متعلق فارسی شاعری میں دوٗر دوٗر تک نظر نہیں آتی۔ یہاں کی بسنت رُت ایسی فصلِ بہار ہے جسے سرتاج موسم کا درجہ حاصل ہے۔ کھیتوں میں سرسوں پھولنے، آموں کے درختوں پر بوٗر آنے کے مناظر اور کوئیل کی نغمہ سنجی سے سُننے والوں کے نہ صرف دل بے کل ہو جاتے ہیں بلکہ وہ بوٗرا سے جاتے ہیں۔ گوریاں سنگار کرتی ہیں اور سجے ہوئے گڑوؤں کو لے کر مندروں میں جاتی ہیں۔ اس منظر کو امیر خسرو اپنے پیر ومُرشد کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سکل بن پھوٗل رہی سرسوں، امبوا بَورائے، ٹیسو پھولے
کوئل بولے ڈار ڈار اور گوری کرت سنگار
ملنیا گڑھوا لے آئیں کرسوں، سکل بن پھوٗل رہی سرسوں
طرح طرح کے پھول کھلائے، لے گڑھوا ہاتھن میں آئے

نجاموڈیں کے دروا جے پے آون کہہ گئے عاشق زار
اور بیت گئے برسوں ، سکل بن پھوٗل رہی سرسوں

یہی نہیں وہ آئندہ آنے والی بسنت رُت میں چادر کی علامت سے خود کو پوری طرح رنگ دینے کا اظہار اپنے پیر ومُرشد سے اس طرح کرتے ہیں۔

توری صورت کے بلہاری ، رکھ لے لاج ہماری
سب سکھین میں چدر میری میلی ، دیکھ ہنسیں نر ناری

اب کے بہار چدر میری رنگ دے، رکھ لے لاج ہماری
صدقہ بابا گنج شکر کا، رکھ لے لاج ہماری

قطب فرید مل آئے براتی خسرو راج دلاری، رکھ لے لاج ہماری
کو ساس کو ننند سے جھگڑے، ہم کو آس تمہاری، رکھ لے لاج ہماری

بسنت کے تیوہار سے متعلق امیر خسرو کا ایک اور گیت کی شمولیت 'جواہرِ خسروی' میں ہے۔ جس کا روئے سخن اگرچہ اُن کے پیر ومرشد حضرتِ نظام الدّین اولیاء کی طرف ہے مگر ہندوستانی کلچر، ہندوستانی تیوہاروں سے دلچسپی اور ہندوستان سے گہری وابستگی ومحبت کا اظہار یہ ہے۔ تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اس گیت کے چند بند بطور نمونہ پیش ہیں۔

حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال

بائس کھاجا مل بن بن آیو تا لے
حضرت رسول صاحب جمال
حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال

عرب یار تیرو بسنت بنایو
سدا رکھے لال گلال
حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو نے بسنت سے متعلق اپنی منظوم نگارشات کے ذریعے دو قوموں کی تہذیب ومعاشرت ، رواداری اور باہمی اتحاد کو فروغ دینے میں ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔

■

Dr. Shareef Ahmad Qureishi
Jain Mandir Street
Phoota Mahal
Rampur - 244901 (UP)
Mob: 790693765
Email: drquraishi@rediffmail.com

اردو کے معاصر غیرمسلم شعرا و ادبا

خان حسنین عاقب

ناظر کاکوروی کہتے ہیں، "یہ امر مسلم ہے کہ ہماری زبان جو شیخ و برہمن کی مشترکہ ملکیت ہے، اس کی عزت افزائی ہمایوں کے عہد سے شروع ہوئی اور اکبری دور کے آتے ہی اس نے ایسی متحدہ صورت اختیار کرلی کہ اگر کسی بزم میں عرفی و نظیری سرگرم سخن نظر آتے تھے تو تلسی داس اور سورداس کی نغمہ سنجیاں بھی گرمی پیدا کررہی تھیں۔ اردو ادب اس محبت کے سایہ میں نشو ونما پاتا رہا حتیٰ کہ ہندوستان کی سیاسی بساط کا نقشہ بدلا لیکن باوجود اس انتشار کے شیخ و برہمن کا مسئلہ کہیں بھی رونما نہ ہوسکا۔ اور اگر غالب کے خدنگِ نظر نے میر مہدی کو گھائل کیا تو مرزا گوپال تفتہ بھی اس سے بچ کر نہ نکل سکے۔"

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار کسی صورت ممکن نہیں کہ اردو صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان نہ کبھی تھی، نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ کوئی مذہبی صحیفہ کسی مخصوص زبان میں ہوسکتا ہے لیکن اس مذہب کے ماننے والوں پر یہ قید نہیں ہوتی کہ وہ صرف اسی زبان میں بات چیت کریں، ادب تخلیق کریں جس زبان میں ان کا مذہبی صحیفہ نازل ہوا ہے۔ اسی لیے عربی دنیا بھر کے مسلمانوں کی مادری زبان نہیں ہوسکتی اور نہ ہی سنسکرت دنیا بھر کے ہندوؤں کی مادری زبان۔ کسی زبان پر کسی مذہب کی اجارہ داری نہیں ہوتی اور نہ ہی اس زبان کو مذہب کا لیبل لگا کر بازار میں اس کی تخصیص کی جاسکتی ہے۔ کسی زبان کے پھلنے پھولنے کی اولین شرط بھی یہی ہوتی ہے کہ اسے قبولیتِ عام حاصل ہو۔ اردو کو قبولیت عام حاصل ہوئی، اس کی وجہ محض یہی تھی کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان کے طور پر وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ ہندوستان کے رابطے کی زبان یعنی Lingua franca کے طور پر متعارف و مقبول ہوئی۔ ایک سوال یہ بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنیاد پر یہ تاثر عام ہوا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے؟ اس کا ایک تاریخی اور منطقی جواب بھی ہمیں ناظر کاکوروی کی کتاب 'اردو کے ہندی ادیب' سے پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کی ترقی و تہذیب کے سلسلہ میں مسلمانوں کے کارنامے زیادہ روشن ہیں جس کی وجہ وہ شاہی پشت پناہی تھی جو فرمانروایانِ ماسبق کے دورِ ہمایوں میں اردو زبان کو نصیب ہوئی لیکن یہ کھلی ہوئی بے انصافی ہوگی اگر کوئی ناواقف یہ کہہ اٹھے کہ ہمارے برادران وطن نے اس زبان کی ترقی اور ترویج میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔"

ماضی میں بھی مسلمان مورخین نے ہندو شعرا و ادبا کے کمالات کو بلند آہنگی اور کشادہ دلی کے ساتھ سراہا ہے۔ اور ان کے جواہر پاروں کی قدر و عزت کی ہے۔ کیا اردو کے داستانی ادب میں کوئی پنڈت رتن ناتھ سرشار کی معرکہ آرا تصنیف 'فسانۂ آزاد' کو بھول سکتا ہے؟ کیا کوئی پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' سے صرفِ نظر کرسکتا ہے؟ کیا اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں منشی نول کشور کی خدمات کو فراموش کیا جاسکتا ہے؟ کیا مالک رام کا کوئی بدل ہوسکتا ہے؟ اردو شاعری ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق، طنز مزاح ہو یا تقدیسی ادب، ہر شعبۂ ادب میں غیر مسلم قلمکار، اردو کے ہر محاذ پر شامل رہے ہیں۔ ایک اجمالی اور مختصر نظر ڈالتے ہیں پس منظر پر۔ اہل ذوق زمانی و مکانی تقدیم و تاخیر کے پہلو سے صرفِ نظر فرمائیں۔

بیسویں صدی سے قبل:

بیسویں صدی سے قبل دو تین سو برس کے عرصے پر محیط عہد میں مسلم شعراء و ادیبوں کے ساتھ ساتھ سیکڑوں غیر مسلم شعراء و ادیب بھی اردو زبان و ادب کی آبیاری میں مصروف تھے۔ میر کے عہد اور ان کے بعد کے عہد میں بھی بہت سے برادرانِ وطن کی خدمات قابلِ ذکر ہیں جن میں ٹیک چند بہار، راجہ رام نرائن موزوں جن کے مشہور زمانہ شعر کا مصرعۂ ثانی ضرب المثل بن چکا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مادھو رام جوہر فرخ آبادی جن کے یہ اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

یا پھر یہ شعر۔

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

سروپ سنگھ دیوانہ، رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، جوالا پرساد برق، منشی میوا لال عاجز گیاوی، شیو نرائن چودھری عارف عظیم آبادی، رائے اسیری پرساد عطا عظیم آبادی، رائے سنگھ عاقل، دوارکا پرساد اُفق، گھاسی رام خوشدل، چمنستان شعرا کے مولف لچھمی نارائن شفیق جنھوں نے میر تقی میر کی کتاب نکات الشعرا کی طرز پر چمنستانِ شعرا تالیف کی، درگا سہائے سُرور جہاں آبادی، غالب کے شاگردوں میں ہرگوپال تفتہ کا نام کون نہیں جانتا؟ علامہ اقبال کے دوستوں میں سردار جگندر سنگھ کے نام سے کون واقف نہیں ہے؟

آزادی سے قبل اور بعد:

اردو شعرا و ادبا کی ایک نسل ایسی بھی گزری جو آزادی سے قبل بھی فعال تھی اور آزادی کے حصول کے بعد بھی فعال رہی۔ اس نسل کے شعرا و ادبا میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری جن کے سیکڑوں اشعار زبان زدِ عام ہیں جن میں میری پسند کا شعر ہے

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جن کا مشہور شعر ہے۔

عشق ہوجائے کسی سے، کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد ﷺ پہ اجارہ تو نہیں

ایک چادر میلی سی والے راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگر، پنڈت برج نارائن دتاتریہ کیفی، گوپی ناتھ امن، گلشن نندہ،

گیان سنگھ شاطر، ڈاکٹر اوم پرکاش راز علامی، امر چند قیس جالندھری، جگت موہن لال رواں جن کا شعر ہے۔

کچھ پودے اُگتے تو ہیں کسی اور زمیں پر لیکن
پھل پھول دیتے اور اپنی بہاریں دکھاتے ہیں کہیں اور

ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، بال مکند عرش ملسیانی، علامہ سحر عشق آبادی، دامودر ذکی حیدر آبادی، رائے جانکی پرساد، 'شمع ہر رنگ میں جلتی ہے' کے مصنف باگا ریڈی، تحیر نیم کش اور 'ذرا مسکراؤ' کے مصنف مزاح نگار بھارت چند کھنہ، کنھیا لال کپور، اوپندر ناتھ اشک، جمنا داس اختر، رام لعل، گردیال سنگھ عارف، مشہور دوہا نگار بھگوان داس اعجاز، دیویندر ستیارتھی، پنڈت میلا رام وفا، دلیپ سنگھ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کنول پرشاد کنول، 'گزشتہ حیدرآباد' کے مصنف محبوب نارائن، بشیشر ناتھ صوفی جن کا شعر ہے۔

اِدھر تکرار اُلفت کی، اُدھر جھگڑا وفاؤں کا
جو رنجش پڑ گئی باہم، بڑی مشکل سے نکلے گی

راج بہادر گوڑ، بشیشر پرساد منور، لال چند پرارتھی، بھگوان داس شعلہ، بھگوان داس اعجاز، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، رنبیر سنگھ، نوین چاؤلہ، فکر تونسوی، رام کرشن مضطر، جگن ناتھ آزاد، بلونت سنگھ، امرتا پریتم، ماہیہ نگار ہمت رائے شرما، ہائی کورٹ کے جج جسٹس آنند نرائن مُلا جن کا شعر مشہور زمانہ ہے اور قوالوں نیز غزل گائیکوں نے اسے گا گا کر مزید پھیلا دیا ہے۔

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
یہاں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

گوپی ناتھ امن دہلوی، تلوک چند محروم، چکبست، کالی داس گپتا رضا، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، منشی پریم چند، سرکشن پرساد شاد، نول کشور پریس والے منشی نول کشور، مالک رام، سدرشن کوشل، کاہن سنگھ جمال، نریش چندر ساتھی، ساحر ہوشیار پوری، ستیہ نند شاکر، کرشنا کماری شبنم، ایس۔ آر۔ رتن، ابھے راج سنگھ شاد، آزاد گلاٹی، جگت موہن لال رواں، راجندر من چندہ بانی، نریش کمار شاد جن کا شعر ہے۔

عقل سے صرف ذہن روشن تھا
عشق نے دل میں روشنی کی ہے

راج نرائن راز، راجیش کمار اوج، ست نام سنگھ خمار، سریش چندر شوق، سریندر پنڈت سوز، کنول نور پوری، منوہر شرما ساغر پالم پوری، ہر بھگوان شاد، وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے نام ایسے ہیں جو فی الوقت حافظے کی گرفت میں نہیں آرہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی پرورش خالص اردو کے ماحول میں ہوئی۔

اسی ماحول میں ان کا ذوق اور ان کی دلچسپیاں پروان چڑھیں۔ تقسیم ہند کے سانحے کے بعد بھی ان شعراء و ادباء کی سرگرمیاں جاری رہیں اور وہ اپنی فکر کے مطابق خدمات انجام دیتے رہے۔ ان ناموں میں بہت سے نام ایسے ہیں جو ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہیں۔ بمشکل چند برس گزرے ہوں گے جب اردو والے ان غیر مسلم محبانِ اردو کی رفاقت سے محروم ہوگئے۔ لیکن یہ لوگ اردو ادب میں اپنی خدمات کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

موجودہ غیر مسلم شعراء و ادیب:

موجودہ دور میں جو لوگ ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہنوز اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں فعال ہیں ان کی خدمات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ تمام لوگوں کا ذکر تو ممکن نہیں ہے البتہ جو نام بہ آسانی دستیاب ہوسکے ہیں ہم انھیں یہاں درج کررہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس، اتنے ہی لوگ ہیں اور دیگر ناموں کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ یہ ہماری کم علمی یا پھر ہماری رسائی کی حد کہ ہمارا علم یا ہمارے وسائل دیگر ناموں کو درج کرنے سے قاصر رہے۔ بہر حال، یہ بھی ایک کوشش ہی ہے۔ موجودہ دور میں جو برادرانِ وطن بڑے اخلاص کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان میں پریم وار برٹنی، عزیز پریہار، ستیہ پال آنند، جناب شباب للت جن کا شعر ہے

اپنے مقسوم کی روٹیاں کھاتا ہے شباب
آپ کا دست نگر ہو یہ ضروری تو نہیں

کرشن کمار طور جو ہماچل پردیش کی راجدھانی شملہ سے اردو سہ ماہی 'سرسبز' برسوں سے نکال کر اردو کی آبیاری کررہے ہیں۔ سلکشنا انجم، سریش چندر شوق، مشہور افسانہ نگار دیپک بدکی، کشمیری لال ذاکر، نریندر لوتھر، اندرا شبنم اندو، آشا پربھات، بلراج مین را، ڈاکٹر کیول دھیر، بلراج کومل، پرکاش پنڈت، جتیندر بلّو، عاشق اردو نوے سالہ نند کشور وکرم، راجندر سنگھ رہبر، اودیش رانی حیدر آبادی، بی۔ ایس۔ جین جوہر، مہندر پرتاپ چاند، شین۔ کاف۔ نظام، راجیش ریڈی، اتل اجنبی جنھوں نے کہا

جب غزل میر کی پڑھتا ہے پڑوسی میرا
اک نمی سی مری دیوار میں آجاتی ہے

دیپتی مشرا، ڈاکٹر مہندرا گروال، راجیش آنند اسیر، راجیش عنبر، طفیل چترویدی، ادھو مہاجن بسمل، چرن سنگھ بشر، سیما گپتا، روچا صبا، ڈاکٹر لکشمن شرما واحد، تلنی وبھا ناز، رام پنڈت، ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ آغاز بلڈانوی، گلزار، ساگر ترپاٹھی، ناول نگار اور افسانہ نگار آنند لہر، افسانہ نگار بلراج بخشی، شاعر اور ہندی ماہنامہ 'نئی غزل' کے مدیر ڈاکٹر مہندر کمار اگروال، آر پی شرما مہرش، ڈاکٹر چندو سی وغیرہ چند اہم نام ہیں۔ ان دنوں بزرگ شاعر جناب تلک راج پارس خالص اردو نعتیں تخلیق کررہے ہیں۔ بحیثیت ایک نقاد اور محقق، گوپی چند نارنگ کی خدمات سے پہلو تہی نہیں کی جاسکتی۔ داغ کے تلامذہ کے وارث جناب پنڈت آنند موہن زُتشی گلزار دہلوی ہنوز ہمارے بیچ موجود ہیں۔ موقع ہے تو گلزار دہلوی کے بارے میں قرۃ العین حیدر کی رائے بھی سُن لیجیے۔

وہ کہتی ہیں، یونان، مصر و روما، سب مٹ گئے جہاں سے... لیکن ہندوستان میں گپت سامراجیہ سے لے کر عہدِ مغلیہ تک سارے ادوار محض ایک زبان اور ایک کلچر میں ابھی تک موجود ہیں، اس زبان و تہذیب کا نام ہے اردو... ایک ادبی مورخ کے لیے یہ بات قابلِ ذکر اور اہم ہے کہ اس تہذیب کے وارث اور نام لیوا دورِ حاضر میں بھی شامل ہیں اور وہ اپنے ورثے کی اہمیت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ انھی وارثوں میں ایک اہم نام گلزار دہلوی کا جو شاعر بن شاعر، علم اور اہلِ دانش ہی نہیں بلکہ ایک ادبی اور مجلسی تمدن و شائستگی کا دوسرا نام ہے۔'

جو نام میں نے درج کیے ہیں ان میں سے اکثر اردو زبان اور تہذیب کے پروردہ ہیں اور وہ اردو زبان جانتے بھی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ آج کے دیگر بہت سے غیر مسلم شعراء و ادبا اردو کی ترویج کے لیے سنجیدہ اور کارآمد ہیں۔

بہر حال، اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں بھی کئی غیر مسلم برادرانِ وطن کو اردو کے نام کی نسبت حاصل ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ آج بھی گوپال متل جی کا ادارہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اردو کی ترویج میں اپنا کردار ادا کررہا ہے۔ آج بھی سنجیو صراف، ریختہ ڈاٹ کام نامی نہایت مقبول اور مصدقہ ویب سائٹ کے توسط سے اردو کی ڈیجیٹل ترویج اور ارتقا میں بے بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان دنوں چند نوجوانوں نے اردو اور ہندی کے مشترکہ پلیٹ فارم سے ایک ڈیجیٹل گروپ تیار کیا ہے جس کا نام انھوں نے 'ہر دو' یعنی ہندی اور اردو کا سنگم رکھا ہے۔ ان برادرانِ وطن کے دلوں میں بے شک اردو زبان اور اردو تہذیب کی محبت سمندر کی لہروں کی طرح موجزن ہے۔ انھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر تمام مذاہب کے محبانِ اردو کی وجہ سے بیکراں تیرگی کے باوجود یہ قندیلِ اردو ہنوز ہمارے اطراف ایک پاکیزہ روشنی بکھیر رہی ہے۔ میں آنند نرائن مُلا کے اس شعر پر اس مقالے کو ختم کرنا زیادہ مناسب خیال کرتا ہوں۔

مُلا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

■

Khan Hasnain Aqib
Allama Iqbal Teachers Colony
Mominpura, Washim Road
Poosad - (MS)

جگر کی شاعری اور ان کا رنگ تغزل

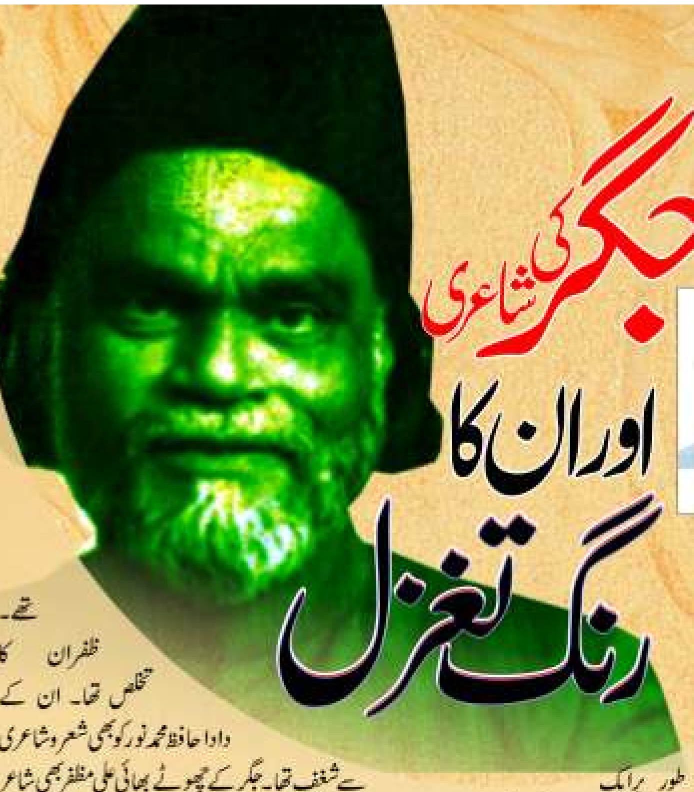

سعود عالم

جگر بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ ان کا عشق ایک رومانی عشق ہے۔ ان کی شاعری خواب اور حقیقت کی ترجمان ہے۔ جگر کے بارے میں عمومی رائے ہے کہ انھوں نے ساری عمر حسن اور عشق کے نغمے گائے ہیں۔ ان کے اس حسن وعشق کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ان کے معاصرین کے کلام سے واقفیت ضروری ہے۔ جگر اور ان کے معاصر اصغر اور حسرت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور جیسا کہ آپ واقف ہیں کہ غزل کی شاعری میں حسن وعشق کا مدار داخلی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ بایں ہمہ غزل میں حسن وعشق کا رشتہ مزید مضبوط اور اٹوٹ ہوجاتا ہے تاہم جگر کے حسن کا تصور اصغر کے حسن سے مختلف ہے۔ وہ اصغر کے بجائے حسرت سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ جگر اور حسرت میں بہت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ دونوں امید کے شاعر ہیں اور غزل کے بھی۔ دونوں نے زندگی کو جیسا پایا، بیان کردیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حسرت نے حقیقت میں رومان تلاش کیا ہے اور جگر نے حقیقت کو رومان بنادیا ہے۔

غزل فطرت انسانی کی سب سے زیادہ نازک اور لطیف صنف سخن ہے۔ لہٰذا اس سوز وساز اور درد وداغ کی تان کو جگر مرادآبادی نے جس جوش وخروش اور جستجو وآرزو کے ساتھ چھیڑا تھا کہ ان کے سامنے ان کے معاصرین کی آوازیں بالکل پست ہوکر رہ گئی تھیں۔ دراصل شعر وشاعری جگر کو وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد مولوی علی نظر مرحوم ایک شاعر تھے۔ وہ خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی 'باغ نظر' کے نام سے موجود ہے۔ جگر کے چچا مولوی علی ظفر بھی شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ظفران کا تخلص تھا۔ ان کے دادا حافظ محمد نور کو بھی شعر وشاعری سے شغف تھا۔ جگر کے چھوٹے بھائی علی مظفر بھی شاعر تھے اور دل تخلص کیا کرتے تھے۔ غرض ان کا پورا خاندان شعری مذاق کا پیروکار ودلدادہ تھا۔ ایسے میں جگر کی شاعری میں تغزل کا ہونا بجا تھا۔ آل احمد سرور جگر کے تغزل سے متعلق رقم طراز ہیں:

''جگر کا تغزل غزل کا جانا پہنچانا تغزل ہے۔ حالی یا اقبال کے تجربات جگر کی شاعری میں ڈھونڈنے کی زیادہ گنجائش نہیں۔ جگر جس ماحول اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ داغ، امیر اللہ تسلیم اور رسا کا ماحول ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ جگر نے داغ، امیر اللہ تسلیم اور رسا جیسے اہم شعرا سے فیض اٹھایا ہے۔ باوجود اس کے شاعری ان کی گھٹی میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جگر نے اپنے کلام کی اصلاح کی شروعات اپنے والد سے کی۔ ان کی وفات کے بعد انھوں نے داغ دہلوی سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ ان کی شاعری میں داغ کا اثر نمایاں ہے اور آخر میں چند غزلوں میں جگر نے رسا اور تسلیم سے بھی اصلاح لی۔ استادی وشاگردی اس زمانے کا رواج تھا۔ شعرا ان چیزوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ جبکہ جگر کا حقیقی استاد خود ان کا اپنا وجدان اور ان کا مذاق تھا۔ وہ نکتہ سنج اور بلاغت شناس شاعر تھے۔ سرور صاحب کلیات جگر میں ان کی شاعری کی کیفیت وکمیت سے متعلق کچھ یوں گویا ہیں:

''جگر کے مزاج میں وہ فلسفیانہ گہرائی، وہ وحدت ذہنی، وہ سنجیدہ فکر نہیں ہے جو مثلاً غالب اور اقبال کے کلام میں ہے۔ اس لیے جگر کو غالب یا اقبال کے معیار پر پرکھنا غلط ہوگا۔ وہ میر ومومن، داغ وحسرت کے دبستان کے شاعر ہیں۔ ان سب شعرا کے یہاں ایک ایسی شدید جذباتیت ملتی ہے کہ وہ ان کی زندگی بن جاتی ہے مگر اس جذباتیت کو فلسفہ نہ سمجھنا چاہیے، مزاج قرار دینا چاہیے یعنی جگر مزاج کے اعتبار سے جمال پرست ہیں۔ وہ حسن کے پجاری ہیں اور حسن کے اداشناس۔''

یہ بات درست ہے کہ جگر کی شاعری میں جوش وجذبے کی بہتات ہے اور وہ ان چیزوں کو اپنے فخریہ کارناموں میں شمار کرتے تھے اور انھیں اپنی شاعری میں کلی طور پر استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ جوشیلا یا جذباتی شاعر فلسفی نہیں بن سکتا یا جگر کو اقبال کی شاعری کے تناظر میں نہیں دیکھ سکتے......

حاصل کلام یہ کہ جوش بیان شاعری کا حسن ہے اور بندش کی چستی، الفاظ کی نشست، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت یہ سب اس کے اجزا وعناصر ہیں جو شاعری کے اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح جز کل میں شامل ہوکر ہی منفرد اور مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ بقول آتش:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

متذکرہ بالا کلیہ کے تحت جب آپ جگر کی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اس میں اقبال کا عکس نظر آئے گا۔ جگر اقبال کے ہم عصر شاعر تھے۔ اس لیے دونوں کی شاعری، اسلوب اور انداز بیان کا ایک جیسا ہونا کوئی بعید نہیں، البتہ دونوں کا طرز تخاطب اور طرز ادا جداگانہ تھا۔ اقبال تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے جبکہ جگر مترنم تھے۔ ان کے پڑھنے کا ایک خاص اور منفرد لحن تھا جس کی گھن گرج آج بھی لوگوں میں سنائی پڑتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور جگر غزل کے۔ اقبال فلسفی کے ساتھ ساتھ ایک آفاقی شاعر بن گئے اور جگر نہ فلسفی تھے اور نہ آفاقی تاہم جگر ایک مقبول اور خاص وعام شاعر ضرور تھے۔ ایسے میں جگر کی شاعری کا اقبال اور حالی کی شاعری سے لگا کھانا کوئی بعید نہیں۔ ہم جگر کو اقبال کا جانشین تو ہرگز نہیں کہہ سکتے اور نہ جگر کی شاعری پر اقبال کے اثرات کا الزام دھر سکتے۔ البتہ مطالعے سے دونوں کے کلام اور طرز ادا میں مماثلت ضرور نظر آجاتی ہے۔ قارئین کی تفہیم کے لیے ذیل میں دونوں کے کلام سے چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں:

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

اب اقبال کے شعر کو دیکھیے:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ایک دوسری مثال:

مقامات ارباب جاں اور بھی ہیں
مکاں اور بھی، لامکاں اور بھی ہیں

صبا خاک دل سے بچا اپنا دامن
ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں
انھیں جب سے ہے اعتمادِ محبت
وہ مجھ سے جگر بدگماں اور بھی ہیں

اب اقبال کا انداز دیکھیے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

دونوں شعرا کے کلام کا انداز ایک، زیر و بم ایک، حتیٰ کہ دونوں کی ردیف اور قافیہ بھی ایک جیسے ہیں۔ اسی طرح دونوں شعرا کے کلام میں بہت سے الفاظ، تشبیہ، اشارہ کنایہ اور تلمیحات ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'خضر' منصور، لالہ وگل، وغیرہ وغیرہ۔

جگر ایک ایسے غزل گو شاعر ہیں کہ ان کی شاعری کا مختلف نوعیت سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ 'داغِ جگر' اور 'شعلۂ طور' یہ دونوں ان کے ابتدائی دور کی شاعری ہے۔ یہ دونوں مجموعے خالص حسن وعشق کا مرقع ہیں۔ لیکن تیسرا مجموعہ 'آتش گل' تک آتے آتے جگر کی شاعری اپنے عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ اس مجموعے کو ان کا شاہکار تسلیم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جگر کی شاعری یہاں تک پہنچتے پہنچتے اپنا رخ بدل دیتی ہے۔ ان کے اس دور کی شاعری میں حسن وعشق کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور تصوف کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی غزلوں کے علاوہ سیاسی نظمیں اور گیت بھی نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کی مشہور غزل سے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جس سے قارئین کو ان کی شاعری سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

دل میں کسی کے راہ کیے جا رہا ہوں میں
کتنا حسین گناہ کیے جا رہا ہوں میں
مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد
مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو، لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

میں ترک رہ و رسم جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد
کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

جہل خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
ضد پہ عشق اگر آ جائے — پانی چھڑکے آگ لگ جائے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت! — روح اگر تسکین نہ پائے

اسی طرح ان کے چند دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں جو ہر خاص وعام کی زبان زد ہیں۔

وہ چہرہ ہے پُر نور کہ اللہ کی قدرت
وہ آنکھ ہے مخمور کہ حافظ کی غزل ہے

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

لے کے خط ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

کبھی شاخ وسبزہ وبرگ پر، کبھی غنچہ وگل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو، مرنے کے لیے تیار ہو جائے
یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالمِ انسانیت کا بار ہو جائے
اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے
نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار ہو جائے
یہ روز وشب، یہ صبح وشام، یہ بستی، یہ ویرانہ
سبھی بیدار ہیں، انساں اگر بیدار ہو جائے

جگر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جذباتی طور پر رندی کے پجاری تھے لیکن ذہنی طور پر اپنی قدروں کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنی تہذیب کی امین ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جگر اردو کے آخری کلاسیکی شاعر ہیں۔ تاہم ان چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی رندی شاعری کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی رندی شاعری کے مقابلے ان کے آخری دور کی شاعری پھیکی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے آخری دور کی شاعری بے کیف وبے کار ہے بلکہ اس کے دیکھنے کا پیمانہ ذرا مختلف ہے۔ اس کو اگر دوسرے نظریہ سے دیکھا جائے تو جگر کے آخری دور کی شاعری پہلے دور کی شاعری سے کہیں زیادہ مقبول عام شاعری ہے۔ ان کے اس دور کی شاعری میں رنگ تغزل کے ساتھ ساتھ تصوف اور عرفان کا پرتو نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر جگر کے مشہور زمانہ شعر کو کون بھول سکتا ہے جس کا تذکرہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب 'پرانے چراغ' میں جگر کے حوالے سے ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ مولانا نے اس مضمون میں جگر سے متعلق بہت سارے واقعات کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل میں نہ جا کر یہاں صرف ان کے پسندیدہ شعر کو نقل کرنا ہی کافی سمجھوں گا۔

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں
پیغام محبت عام سہی، عرفان محبت عام نہیں

جگر کی شاعری کو ایک دوسرے انداز سے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم ان کی شاعری کو ان کی ذاتیات سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں یہاں بھی ان کی شاعری دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ ایک شادی سے پہلے کی اور دوسری شادی کے بعد کی شاعری۔ جہاں تک شادی کے بعد کی شاعری کا تعلق ہے تو اس کی بہترین مثال ان کی ایک مقبول عام غزل ہے جس کو انھوں نے تسنیم سے دوبارہ نکاح کرنے کے بعد لکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

یہ غزل ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جگر صاحب نے اس کے بعد کبھی بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور اس طرح انھوں نے اپنی شاعری کا رجحان تصوف اور مذہبی شاعری کی طرف کر لیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جگر کی شاعری شروع شروع میں درد ہجر اور شوق وصال تک محدود تھی لیکن شادی کے بعد ان کی بے قراری کو قرار آ ہی آ گیا جس کا واضح اور بین ثبوت ان کے بعد کے دور کی شاعری ہے۔ جگر کی محبت پہلے ذاتیات تک محدود تھی، بعد میں اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اس طرح آہستہ آہستہ ان کے موضوعات شاعری میں نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔

■

Dr. Saud Alam
B.114, Okhla Main Market, Jamia Nagar
New Delhi-110025
saudalam1983@gmail.com|Mob: 8076495936

2018 کا فکشن اور فکشن تنقید

ایک جائزہ

اسلم جمشید پوری

وقت کا بہتا دریا، مسلسل بہتا رہتا ہے، دن، مہینے، سال یوں آہستگی سے گذر جاتے ہیں کہ احساس ہی نہیں ہوتا، کب، حال، ماضی اور مستقبل حال میں تبدیل ہوا، پتہ ہی نہیں چلتا۔ نئے سال کا استقبال، نئے نئے منصوبے، خود سے عہد و پیمان، اہداف کا تعین کرتے کرتے ربع اور نصف برس یوں ہی گذر جاتا ہے اور پھر ہماری دیگر مصروفیات کب چین لینے دیتی ہیں۔ سال کے آخر میں پھر خیال آتا ہے کہ اپنا جائزہ لیں، ہم نے کیا کیا، کیا اور کیا کیا نہیں کیا۔ دراصل ہر سال، نئی نئی ایجادات، تخلیقات، حیرت انگیز کارناموں، شخصیات اور یادگار لمحات کے لیے جانا جاتا ہے۔ وقت کے بہتے دریا نے 2018 نامی قطرے کو کچھ اس طور اپنے اندر اتار لیا ہے کہ وہ ضم ہو کے دریا بن چکا ہے۔

2018 میں تحریر ہونے والا ادب خصوصاً اردو فکشن (ناول، افسانہ، افسانچہ اور ڈراما)، بچوں کی کہانیاں، فکشن تنقید، سوشل میڈیا پر فکشن وغیرہ کا ایک عالمگیر جائزہ پیش ہے۔

سال 2018 میں افسانوی مجموعوں کی اشاعت کی رفتار، گذشتہ برسوں سے کچھ زیادہ ہی رہی ہے۔ ہمارے کئی افسانہ نگاروں کے پہلے مجموعے اشاعت کے مرحلے سے گذرے۔ کچھ کے تیسرے اور چوتھے مجموعوں کی اشاعت عمل میں آئی اور کچھ کے نئے ایڈیشن سامنے آئے۔

60 کی دہائی کے معروف افسانہ نگار منظر کاظمی مرحوم کا واحد افسانوی مجموعہ 'لکشمن ریکھا' 1991 میں منظر عام پر آیا تھا مجموعے نے خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی تھی۔ مجموعے کا دوسرا ایڈیشن مع چھ غیر مطبوعہ افسانوں کے 2018 میں شائع ہوا ہے۔ جسے ان کے چھوٹے بھائی معروف طنز و مزاح نگار ڈاکٹر افسر کاظمی نے ترتیب دیا ہے۔ 'لکشمن ریکھا' برسوں سے بازار میں دستیاب نہیں تھا اور اس کی مانگ بہت تھی۔ 'لکشمن ریکھا' کے یوں تو زیادہ تر افسانے انفرادیت رکھتے ہیں۔ لیکن بعض افسانے مثلاً سیاہ غلاف اور کالے جرنیل، آسمان سے گرتی روٹیاں، سو گز پر دفن ایک کہانی، ایک پرانی شاخ سے لپٹا آدمی، آخری دروازے سے گذرتے لوگ، رات کا سورج، دن

کا چاند، طوطے بولتے ہیں، بندر ناچ نہ صرف اپنے عہد کے خوبصورت اور عمدہ افسانے ہیں بلکہ اردو افسانوی روایت میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔

عبدالصمد ہمارے معتبر فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ 70 کی نسل کے لکھنے والوں میں کم ہی ایسے ہیں جو آج اکیسویں صدی میں بھی پورے طمطراق سے خود کو دہرائے بغیر فکشن تحریر کررہے ہیں۔ ایسے ہی معدودے چند میں عبدالصمد بھی ایک ہیں۔ جہاں تک ان کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنی منفرد شناخت کو بنائے رکھا ہے۔ 2018 میں ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ 'دم واپسیں' منظرِ عام پر آیا ہے۔ مجموعے میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ موضوع اور Treatment کے اعتبار سے مختلف و منفرد ہے۔ عبدالصمد کے اسلوب نے زیادہ تر افسانوں کو الگ تراش خراش عطا کی ہے۔ مجموعے کا سرنامہ 'دم واپسیں' ایک نہایت عمدہ افسانہ ہے۔ اس کا نام اعتراف ہوتا تو زیادہ دلکش ہوتا۔ لیکن عبدالصمد نے جس طرح صیغہ واحد متکلم کردار کے ذریعے افسانہ بیان کیا ہے، اس سے افسانے میں خودنوشت کا رنگ غالب ہوگیا ہے اور خودنوشت میں خود کو بے نقاب کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن یہاں عبدالصمد کے کردار نے اپنے ایک ایک گناہ کا اعتراف کرکے خودنوشت کا حق ادا کردیا ہے۔ ایک بے حد خوبصورت افسانہ ہے۔

صادقہ نواب سحر نے اپنے ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' سے جو دھوم مچائی تھی وہ ان کے تازہ ناول 'جس دن سے' تک مزید دور تک پھیل چکی ہے۔ بطور افسانہ نگار بھی ان کی شناخت اپنے ہمعصروں سے منفرد ہے۔ ان کا پچھلا افسانوی مجموعہ 'خلش بے نام سی' 2012 میں شائع ہوا تھا۔ تازہ افسانوی مجموعہ 'پیچ ندی کا مچھیرا' 2018 میں شائع ہوا ہے۔ مجموعے میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں۔ ان سبھی افسانوں میں جہاں ایک طرف علاقائی رنگ خاصا کثیف ہے تو موضوعات کی بوقلمونی بھی ہے۔ لہجے کا نیاپن اور قصے کے اتار چڑھاؤ سے وجود میں آنے والے افسانے قاری کو اپنی گرفت میں کر لیتے ہیں۔ 'پیچ ندی کا مچھیرا' مجموعے کا ایک منفرد افسانہ ہے۔ مرکزی کردار کا مچھلیاں پکڑنا، خوب نشہ کرنا، گھر کا بھی خیال رکھنا اور دوسروں کی مدد کرنا، قاری کو حیران کرتا ہے۔ پٹاخے اور بم پھوڑنے کے چکر میں اپنا ایک ہاتھ گنوانے والا مہادیو، شرابی ضرور ہے مگر ذمہ دار شوہر ہے تو دوسرے کے دکھ درد میں کام آنے والا سخی بھی ہے۔ شراب کے نشے میں ہاتھ گنوانے کے بعد بھی محنت مزدوری سے جان نہیں چراتا، اس کا یہ احساس ذمہ داری، اس کے کردار کو خاص بنا دیتا ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے ٹمٹماتے دیے، اکنامکس، الو کا پٹھا، ٹوٹی شاخ کا پتہ، راکھ سے جلی انگلیاں بھی متاثر کرتے ہیں۔

سلمیٰ صنم کی شناخت سائنس کا افسانوں میں بہتر استعمال کرنے والے معدودے چند افسانہ نگاروں کے طور پر ہوتی ہے۔ ان کے تازہ افسانوی مجموعے 'قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں' نے 2018 میں کم مدت میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ اس سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے، طور پر گیا ہوا شخص، پت جھڑ کے لوگ، پانچویں سمت، شائع ہوچکے ہیں۔ تازہ مجموعے میں زیادہ تر افسانے پچھلے مجموعوں سے شامل ہیں، چند نئے افسانے بھی ہیں۔ پانچویں سمت، میری، پت جھڑ کے لوگ، تھکی ہوئی ناری، طور پر گیا ہوا شخص، آرگن بازار، سورج کی موت وغیرہ عمدہ افسانے ہیں۔

راجیو پرکاش ساحر، نے نئی صدی میں اردو میں لکھنا شروع کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ایک بھیگے لمحے کی لمبی سڑک' 2015 میں شائع ہوا۔ راجیو پرکاش ساحر، اردو کے عاشق ہیں، دلدادہ ہیں، اردو میں افسانے قلم بند کررہے ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'پیاسی سبیلیں' 2018 میں شائع ہوکر خاصا مقبول ہوا ہے۔ مجموعے میں کل گیارہ افسانے ہیں۔ یہ افسانے اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ دراصل راجیو پرکاش اپنے افسانوں میں ہندی کا استعمال بڑی ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ان کی زبان دوآتشہ ہوکر الگ لطف دیتی ہے۔ مجموعے کا ٹائٹل افسانہ 'پیاسی سبیلیں' پانی اور پیاس کے تعلق سے ایک عمدہ افسانہ ہے۔ افسانہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ پانی کے مسئلے کو عمدگی سے پیش کرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار سامعین اور صیغہ واحد متکلم 'میں' کی خاتون کردار ہے جو پیشے کے اعتبار سے کال گرل ہے۔ افسانے میں عمدگی سے دکھایا گیا ہے کہ بازار کی عورتیں ایک سبیل کی مانند ہیں جو دوسروں کی پیاس بجھانے کے لیے ہی بنی ہیں، جہاں بے شمار لوگ اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ لیکن وہ خود اپنی مرضی سے اپنی پیاس نہیں بجھا پاتی، وہ تو ساجن جیسے مخلص مرد کی پیاس بھی نہیں بجھا پاتی ہے، ایک عمدہ افسانہ ہے۔ پورے مجموعے میں املا کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ بعض الفاظ نہ صرف غلط لکھے گئے ہیں بلکہ ان کا استعمال بھی غلط ہوا ہے۔

'علی امام کے افسانے' کو محترم علی امام کے افسانوں کا کلیات کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علی امام ہمارے اچھے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ 1970 کی دہائی سے افسانے قلم بند کرنے والے علی امام کا نام علی امام نقوی سے مماثلت کی وجہ سے بھی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ لیکن علی امام نے اپنی شناخت الگ قائم کی ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'نہیں' 1985، 'مت بھید' 1995 میں شائع ہوچکے ہیں۔ 'ہاں! میں یہاں ہوں' 2018 میں شائع ہونے والا مجموعہ ہے، جس میں 25 افسانے ہیں۔ مگر علی امام کے افسانے، میں ان تینوں مجموعوں کو ایک ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو ریسرچ کا کام کرنے والوں کے لیے انتہائی کارآمد ہے۔ لیکن کتاب کی ضخامت خاصی بڑھ گئی ہے۔ 'علی امام کے افسانے' میں متعدد خوبصورت اور پراثر افسانے شامل ہیں۔ چنا مسالہ، آہٹ، سائے سراب کے، غلامی آپ کو مبارک ہو، نئی، کوئی پتہ نہیں، ہاں میں یہاں ہوں، سریلی آواز وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔

احمد عارف، کرناٹک کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں، جنسی موضوعات کو افسانے میں سلیقے سے باندھنا، کھیل نہیں، احمد عارف اس میدان سے گذرتے ہوئے کبھی لڑکھڑائے تو کبھی کامیاب ہوئے ہیں۔ یوں تو وہ 1982 سے ہی افسانے قلم بند کررہے ہیں، لیکن 'ایک کمرے والا مکان' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، مجموعے میں کل سترہ افسانے ہیں، بیشتر افسانے جنسی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ 'ایک کمرے والا مکان'، ان کا خاص افسانہ ہے۔ یہ بڑے شہروں میں چھوٹے گھروں کا قصہ ہے۔ ایک کمرے میں تین تین چار چار بچوں کے ساتھ میاں بیوی کی زندگی کی عکاسی میں احمد عارف نے حتی الامکان تخلیقیت کا استعمال کیا ہے۔ مجھے منٹو کا افسانہ 'دھنگی آوازیں' یاد آرہا ہے، 'ایک کمرے والا مکان' میں تخلیقی ہنرمندی اور کردار نگاری کے فقدان نے ایک اچھے افسانے کو، بڑا بننے سے روک دیا ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے چونکاتے ہیں، اب بولو، ایک بار اور، بد دعا، دو بہنیں، ناجو کا ادھیکار، تر چڑتر وغیرہ افسانے احمد عارف کی شناخت بنیں گے۔

'پانیوں میں گھلتی زمین' رحمن نشاط کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے تین مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں، مگر نہ جانے کیوں مجھے افسانوں میں اتنے مجموعوں والی پختگی نظر نہیں آتی۔ زیادہ تر افسانے ہنرمندی اور اسلوب کی دلکشی کے فقدان میں بے اثر سے نظر آتے ہیں۔ افسانوں کے موضوعات ضرور مختلف ہیں۔ بعض افسانے علامتی ہیں لیکن علامتیں بہت واضح نہیں۔ ہاں، ایک نیا پن یہ ہے کہ 'پانیوں میں گھلتی زمین' کا جواز یوں پیش کیا ہے کہ کرۂ ارض کا تین چوتھائی پانی بڑھتا جارہا ہے اور زمین کا حصہ روز بروز گھلتا جارہا ہے۔

'ابابیل کی ہجرت' ڈاکٹر شاہد جمیل کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یوں شاہد جمیل ایک عرصے سے افسانہ نگاری کر رہے ہیں۔ اردو کے بیشتر اہم رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ مجموعے میں کل 15 افسانے شامل ہیں۔ شاہد جمیل اپنے اسلوب سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ زندہ اور متحرک کرداروں کو افسانوی رنگ دیتے ہیں اور خوب رنگتے ہیں۔ ان کے کردار قاری کے ذہن میں اندر تک اترتے چلے جاتے ہیں۔ مجموعے میں یوں تو ہر افسانہ اہم ہے۔ مثلاً مہاجر، نجات، تحفہ، صحرا میں بھٹکتی چڑیا، جالے میں پھنسی مکڑی وغیرہ مگر ٹائٹل افسانہ خصوصی طور پر بار بار قرأت کا متقاضی ہے۔ زندگی کے مسائل، بڑھتی صارفیت، قدیم و جدید کا ٹکراؤ، جذباتیت، فلیٹ کلچر کا بڑھتا دائرہ کہانی کے کرداروں کو قریب و دور کرتا رہتا ہے۔ ابابیل کی علامت کا خوبصورت استعمال کر کے شاہد جمیل نے کہانی میں جان ڈال دی ہے۔

اکیسویں صدی میں متعدد نئے چہرے افسانے کی دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ ایسے ہی چند جوانوں میں محمد علیم اسماعیل کا شمار بھی ہوتا ہے۔ مہاراشٹر کی زرخیز سرزمین سے نمودار ہونے والے اس نوجوان کا پہلا مجموعہ 'الجھن' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یوں تو محمد علیم اسماعیل، زیادہ تر افسانچے قلم بند کر رہے ہیں۔ لیکن گاہے بگاہے افسانے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ 'الجھن' ان کے افسانوں اور افسانچوں کا مجموعہ ہے جس میں 59 افسانچے اور 13 افسانے شامل ہیں۔ اختصار یوں بھی افسانچے کا بڑا وصف ہے۔ محمد علیم اسماعیل نے افسانوں میں بھی اختصار کا دامن نہیں چھوڑا ہے، یہ افسانے اور افسانچے نوجوان مصنف کے اندرون کی بے چینی، اضطراب اور الجھن ہے۔ ایسی الجھن جس سے آج کا انسان قدم قدم روبرو ہو رہا ہے خواہ وہ ملک میں پھیلتی فرقہ پرستی ہو، بگڑتا ہوا معاشرہ ہو یا پامال ہوتے اقدار۔ ایسے میں ہر شخص حیران و پریشان سا ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہے۔ 'الجھن' ایک سچے محب وطن مسلم افسانہ نگار کے اضطراب کا مظہر ہے۔

'نئی صبح' کے بعد ڈاکٹر ایم اے حق 'ڈنک' لے کر حاضر ہیں۔ ڈاکٹر ایم اے حق کا شمار اردو کے معدودے چند افسانچہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ فی زمانہ افسانچے کے فن اور اس کی باریکیوں سے کما حقہ واقف افسانچہ نگار بمشکل دو چار ہی ہوں گے۔ ایم اے حق ایسے ہی ماہر فن افسانچہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی قلم بند کیے ہیں لیکن وہ انھیں طویل افسانچے کا ہی نام دیتے ہیں۔ دراصل کوزے میں سمندر سمونا، ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ افسانچے اور لطیفے یا مزاح پاروں میں لطیف سا فرق ہوتا ہے۔ اسے سمجھے بغیر افسانچہ تحریر کرنا، صفحات سیاہ کرنا بس ہے۔ 'ڈنک' ایم اے حق کے خوبصورت، کاٹ دار، طنز سے بھرپور، قصے کی رمق لیے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانچوں کو پڑھتے ہوئے آپ چونکتے بھی ہیں، حیران بھی ہوتے ہیں، کہ افسانچہ نگار نے سماجی برائیوں کو کس عمدگی سے الفاظ میں ڈھالا ہے۔

'مہندی لہو کی' سیدہ تبسم منظور ناڈکر پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ سیدہ تبسم بھی اکیسویں صدی کی افسانہ نگار ہیں۔ مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ مجموعے کے زیادہ تر افسانے معاشرتی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں اصلاحی نقطۂ نظر حاوی ہے۔ زیادہ تر افسانے معاشرے میں رائج غلط قسم کے رواج اور برائیوں کو طشت از بام کرتے ہیں۔

جرمنی میں مقیم سید انور ظہیر رہبر کا پہلا افسانوی مجموعہ 'عکسِ آواز' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا ہے۔ سید انور ظہیر برسوں سے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی کر رہے ہیں۔ 'عکسِ آواز' میں ان کے افسانے انفرادیت کے حامل ہیں۔ سید انور ظہیر نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، جو ہیں تو ہماری زندگی کے، لیکن ان تک ہماری نظر نہیں جاتی۔ بعض موضوعات تو خالص مغربی ممالک کے ہیں۔ ان کے متعدد افسانے، موضوع، Treatment، زبان اور ماحول کے اعتبار سے انفرادیت کے حامل ہیں۔

مجازی خدا میں خدا کی تلاش، 47 کلو میٹر، ہاتھ سے جنت بھی گئی، آوازیں، کبھی دل سے تم نکلے ہی نہیں، 2/3 حصہ بعض ایسے افسانے ہیں جو اپنے موضوع، عنوان اور بنت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہیں۔ ان میں یورپ کی زندگی کے مسائل بھی ہیں، دہشت گردی بھی ہے تو عورت کے دل کی عمدہ عکاسی بھی۔ انور ظہیر رہبر کے یہ افسانے ان کی شناخت بنیں گے۔

'روح دیکھی ہے کبھی' جرمنی کی نوجوان افسانہ نگار ہما فلک کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جسے انہماک پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ ہما فلک اپنے افسانوں میں انوکھے پن اور چونکانے کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے عورت اور مرد کے رشتوں کا بیان ہیں۔ ایک عورت کے اندرون کو ہما فلک نے عمدگی سے لفظوں کی زبان عطا کی ہے۔ مجموعے میں کل 17 افسانے ہیں۔ بعض افسانے مثلاً بلندی والی، وقت سے پرے، کاسہ باز، ایوارڈ، ببول، روح دیکھی ہے کبھی، عمدہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں پیش ہونے والے کردار اور واقعات، قاری کو اپنے ہی آس پاس کے لگتے ہیں۔ قاری مصنفہ کے ساتھ ساتھ کہانی کا سفر شروع کرتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد اس کے اندر شروع ہو جاتی ہے۔

خلیجی ممالک میں مقیم اردو افسانے کی نئی آواز سبین علی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'گل مصلوب' بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے سامنے ہے۔ سبین علی پاکستان کی رہنے والی ہیں اور آج کل سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ دونوں ممالک کے حالات، معاشرہ، عورت کی زندگی، مذہبی معاملات وغیرہ کو ہنر مندی سے سبین علی نے افسانہ کیا ہے۔

معصومہ خاتون کے افسانوں کا مجموعہ 'کشمکش' بھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ معصومہ خاتون افسانے کے ساتھ ساتھ ناول بھی قلم بند کر چکی ہیں۔ ان کے افسانوں میں بہار کی خواتین کے مسائل عام طور پر ملتے ہیں۔ وہ سادگی میں پرکاری کرتی ہیں۔ ان کے افسانے سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ مجموعے میں کل 17 افسانے شامل اشاعت ہیں جن میں سے کئی افسانے جھوٹ، عجیب اتفاق، بدلہ، تصویر کے ٹکڑے، مجبور، عزم قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں۔ معصومہ خاتون کی تحریر میں ایک کشش ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

بہار کے نوجوان افسانہ نگار معین گریڈیہوی 'آنکھوں کا لہو' لے کر آئے ہیں۔ یہ اُن آنکھوں کا لہو ہے جنھوں نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا تھا اور دیکھا تو ایسے مناظر کہ آنکھیں لہو رونے پہ مجبور ہیں۔ مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے ایک ایسے نوجوان قلم کار کے ہیں جس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ زندگی کے حسن و قبح، نشیب و فراز اور سفید و سیاہ سے گذرتے ہوئے آج کے نوجوان کا حال کیا ہوتا ہے۔ کیسے وہ قدم قدم پر نت نئے حادثات کا شکار ہوتا ہے، یہ سب ان افسانوں میں ملے گا۔ ٹوٹتے رشتوں کا عذاب، کرشن جی کا تعزیہ، احساس، حویلی کا چراغ، زمانہ بدل گیا، ہرا زخم، بلیک ڈائمنڈ، ایسے افسانے ہیں جو زندگی کو سمجھنے، اپنے پرائے کا فرق کرنے، حب الوطنی، فرقہ پرستی، انسانیت وغیرہ کو سمجھنے کا اچھا ذریعہ ہے۔

راقم کے مجموعے 'عیدگاہ سے واپسی' کا تیسرا ایڈیشن بھی اسی سال شائع ہوا۔

2018 کے ناول

اکیسویں صدی میں ناول کی اشاعت بھی خاطر خواہ ہو رہی ہے۔ ابھی تک اس صدی میں متعدد اہم ناول شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ پو کے مان کی دنیا (مشرف

عالم ذوقی)، غلام باغ (مرزا اطہر بیگ)، اندھیرا پگ، (ثروت خان)، کئی چاند تھے سر آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی)، انارکلی (مرزا حامد بیگ)، دکھیارے (انیس اشفاق)، آخری سواریاں (سید محمد اشرف)، نادیدہ بہاروں کے نشاں (شائستہ فاخری)، کہانی کوئی سناؤ متاشا (صادقہ نواب سحر)، عزازیل (یعقوب یاور)، چاند ہم سے باتیں کرتا ہے (نورالحسنین)، موت کی کتاب (خالد جاوید)، روحزن (رحمٰن عباس)، شکست کی آواز (عبدالصمد)، دو بیہ بانی (غضنفر)، ایک بوند اجالا (احمد صغیر)، سراب منزل (اے خیام)، لمینیٹڈ گرل (اختر آزاد)، گنو دان کے بعد (علی ضامن)، ڈیوس علی اور دیا (نعیم بیگ)، گرداب (شموئل احمد)، جانے کتنے موڑ (آشا پربھات)، برف آشنا پرندے (ترنم ریاض)، شہر میں سمندر (شاہد اختر) جیسے تقریباً دو درجن ایسے ناول منظر عام پر آئے ہیں جو اردو ناول کے فروغ میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی کے طور پر Project کیا جا رہا ہے۔ دیگر زبانوں کی بات سے گریز کرتے ہوئے صرف اردو پر نظر ڈالیں تو اکیسویں صدی میں اردو فکشن روز افزوں ترقی کی جانب گامزن ہے۔ افسانے کے ساتھ ساتھ ناول کی رفتار بھی اطمینان بخش ہے۔ ہر سال تقریباً نصف درجن ایسے ناول ضرور شائع ہو رہے ہیں جو قاری کی پسند پر کھرے اتر رہے ہیں اور جنہیں اچھے ناول کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

سال کے شروع ہی میں معروف افسانہ اور افسانچہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا خوبصورت ناولٹ 'جسی' شائع ہوا۔ 'جسی' جہاں ایک طرف بشیر مالیر کوٹلوی کی قصہ پر دسترس اور ہنرمندی پر دال ہے وہیں پنجاب کے سیاسی و تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ پنجابی خوشبو کو بکھیرنے والا ناول ہے۔ یہ ایک عورت کے خاموش احتجاج کی کہانی ہے۔ دہشت گردی کے پس منظر میں تحریر ہونے والا ایک اہم اور بامقصد ناولٹ میں بشیر مالیر کوٹلوی نے عمدگی سے پنجاب کی رسم و رواج، شادی بیاہ، خورد و نوش، الہڑ جوانیاں، کھیل کود، کھیت کھلیان، موج مستی کو ناول میں پرو کر زندہ کر دیا ہے، بلونت اور جسی ناول کے مرکزی کردار کے طور پر اپنی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں۔

نورالحسنین اپنے نئے ناول 'تلک الایام' لیے حاضر ہیں۔ یہ وہی نورالحسنین ہیں جنہوں نے گذشتہ برسوں، 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' اور 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' جیسے اہم ناول عطا کیے ہیں۔ آخر الذکر ناول فکشن کی نئی تکنیک جسے کولاژ تکنیک کہا جاتا ہے، میں تحریر کردہ اردو کا پہلا ناول ہے۔ یہاں زماں و مکاں کی حدیں ٹوٹتی ہیں، مختلف زمانے کے مختلف واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر ناول کیا جاتا ہے۔ نورالحسنین نے گذشتہ کئی ناولوں سے تاریخ کو اپنا موضوع بنانا شروع کیا ہے 'تلک الایام' ہماری ہزار ہا سال کی تاریخ، تہذیب اور مذہبی شناخت کا بیان ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے اب تک کے حالات، عروج و زوال اور موجودہ عصری منظر نامہ اور نورالحسنین کا باکمال قلم، ان سب نے ناول کو یادگار بنا دیا ہے۔ خاندان، شرافت، طمطراق اور روحانی سلسلے کا بیان ناول میں جہاں تجسس کو برقرار رکھتا ہے وہیں گم ہوتی تہذیبی اقدار کا منظر نامہ ہمارے سامنے لا دیتا ہے۔

پیغام آفاقی کو مرحوم لکھتے ہوئے آج بھی قلم لرزتا ہے۔ ناول کی دنیا میں پیغام کے 'مکان' نے جو شہرت پائی وہ کم ناولوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ رضیہ سلطانہ اور سلمان عبدالصمد نے ان کی غیر مطبوعہ تحریروں کی تلاش کی، اس طرح پیغام آفاقی کا ناول 'دوست' (مرتبہ رضیہ سلطان/سلمان عبدالصمد) شائع ہوا ہے۔ پیغام آفاقی نے گذشتہ برسوں 'پلیتہ' نام کا ناول تحریر کیا۔ لیکن 'پلیتہ' لوگوں کے دلوں میں وہ گھر نہیں بنا سکا جو 'مکان' بنا چکا تھا۔ 'دوست' ان کا بعد از مرگ سامنے آنے والا پہلا ناول ہے۔ ناول کا موضوع Live in relationship ہے۔ یہ صورت حال مغربی ممالک میں تو اب عام سی ہے لیکن ہندوستان میں ابھی بھی، بہت کم نظر آتی ہے۔ پیغام آفاقی نے ایک اچھوتے موضوع کو عمدگی سے ناول کیا ہے۔

عبدالصمد ہمارے معروف فکشن نگار ہیں۔ 'دو گز زمین' نے انہیں جو شہرت عطا کی، وہ بے مثل تھی۔ اب تک ان کے نصف درجن سے زائد ناول منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ لیکن 'دو گز زمین' والی شہرت و مقبولیت کسی اور ناول کے حصے میں نہیں آئی۔ 'شکست کی آواز' کے بعد اب ان کا تازہ ترین ناول 'جہاں تیرا ہے یا میرا' سامنے ہے۔ راشد ناول کا مرکزی کردار ہے۔ ناول کا موضوع سماجی انتشار ہے۔ ایک بے روزگار نوجوان کے لیے آج کی دنیا سخت ترین آزمائش کی جگہ ہے۔ عبدالصمد نے ناول کے ذریعے اقلیتی تعلیمی اداروں کے کرپشن، ٹیوشن کے کاروبار، مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرنے، طرح طرح سے پریشان کرنے سے لے کر 9/11 کے بعد مسلمانوں کے تئیں امریکیوں کے ذہنوں میں آئی تبدیلی اور معاشی ابتری کو عمدگی سے ناول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ زمانے کی اسی مادیت میں راشد اور آفرین کا معصوم رشتہ بھی ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔

'اندھیروں کے مسافر' الہ آباد کے افسانہ نگار احمد حسنین کا پہلا ناول ہے۔ احمد حسنین اچھے شکاری بھی ہیں۔ انھوں نے شکاریات پر متعدد افسانے اور کہانیاں بھی تحریر کی ہیں، جو شکار اور شکاری کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ 'اندھیروں کے مسافر' میرٹھ اور قرب و جوار یعنی مغربی اتر پردیش کے دیہات میں کھاپ پنچایت کے فیصلوں سے آنر کلنگ تک کے سفر سے اٹھنے والی چنگاری ہے۔ کہانی کھاپ پنچایت کے اعلی ذات اور پسماندہ ذات کے لڑکے لڑکی کے پیار کو سزائے موت دینے سے شروع ہوتی ہے۔ ہاردک اور پونم کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ ہاردک کو مرا سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور پونم جنگلوں میں بھاگ نکلتی ہے۔ کسی طرح ہاردک ممبئی پہنچ جاتا ہے اور پونم جنگل میں ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ڈاکو شیر سنگھ کا گروہ، پونم کو حفاظت سے رکھتا ہے اور اپنے ٹھکانے بدلتے بدلتے مرزاپور، شیتل پور، گھاٹی پہنچ گیا۔ پونم شیر سنگھ پر فدا ہو جاتی ہے۔ ادھر ہاردک اپنے دوست ارشد کے ساتھ پونم کو ممبئی کے کوٹھوں پر تلاش کرتا رہتا ہے۔

ناول میں ڈاکوؤں کی زندگی کو خوبصورتی سے ڈھالا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ناول میں اندھیرا زیادہ ہے۔ یعنی جرائم کی دنیا ہے۔ جرائم کی دنیا کے مسافر، کیسے ہوتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں روشنی کی مانند ہیں، جو برے ہیں لیکن دل کے اچھے ہیں۔ ویسے ناول فلمی کہانی کی طرح فارمولہ بند زیادہ لگتا ہے۔

2018 **فکشن تنقید**

ایک زمانہ تھا جب فکشن تنقید خال خال منظر عام پر آتی تھی۔ ادھر نئی صدی میں فکشن تنقید کی رفتار اور مقدار میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔ مضامین کے مجموعے، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں پر کتب، افسانوں کے انتخاب، افسانوی تذکرے، ناولوں کے تجزیے، ناولوں کے اختصار، تقابلی مطالعے وغیرہ مختلف طرح کی فکشن تنقید سامنے آ رہی ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ فکشن تنقید کے شعبے میں نئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جب شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، وارث علوی، وہاب اشرفی، انور سدید جیسے چند نام تھے۔ 80ء کے بعد فکشن تنقید میں نئی نسل وارد ہوئی۔ انوار احمد، مرزا حامد بیگ، ابوالکلام قاسمی، شمس الحق عثمانی، عظیم الشان صدیقی، ارتضی کریم، علی احمد فاطمی، صغیر افراہیم، مبین مرزا، قمر الہدیٰ فریدی، اعجاز علی ارشد، ظہور الدین، قدوس جاوید، اسلم

آزاد، سلیم آغا قزلباش، صبا اکرام، خالد اشرف، خالد علوی وغیرہ کی نسل نے فکشن تنقید میں نئے زاویے پیش کیے۔ اس نسل کے کچھ زمانی فرق کے ساتھ ایک اور نسل سامنے آئی جس میں مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض، نگار عظیم، حقانی القاسمی، وضاحت حسین رضوی، ہمایوں اشرف، احمد صغیر، اسلم جمشید پوری، فرزانہ احمد، شہاب ظفر اعظمی، مولا بخش، خورشید حیات، فوزیہ اسلم، راشد انور راشد، نعیم انیس، نسیم اعظمی، محمد اسلم پرویز، نجمہ رحمانی، کہکشاں پروین، صاحب علی، محمد عالم خان اور موجودہ صدی میں کئی نام اس میں شامل ہوئے مثلاً ریاض توحیدی، اسود گوہر، عشرت ناہید، اسامنیّ، فرقان سنبھلی، الطاف انجم، مشتاق احمد وانی، ابوبکر عباد، بشیر مالیر کوٹلوی،، نشاں زیدی، سید تحسین گیلانی، رابعہ الربا، سلمان عبدالصمد، ضیاء اللہ نور، غضنفر اقبال، ریاض توحیدی، غالب نشتر، احمد طارق، محمد نسیم جان، تسنیم فاطمہ امروہوی،، ارشد اقبال، جاوید انور، سید عینین علی حق، منصور خوشتر، مہناز عبید، ارشاد سیانوی، صالحہ رشید،، رضوانہ پروین، آمنہ آفرین وغیرہ کی آمد سے اکیسویں صدی میں فکشن تنقید کو خاصی تقویت ملی ہے۔

جہاں تک 2018 میں شائع ہونے والی فکشن تنقید کی بات ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس سال فکشن تنقید پر متعدد کتب شائع ہوئی ہیں۔ افسانوں کے درمیان محمد اسلم پرویز کی کتاب ہے۔ اسلم پرویز نے ادھر منٹو کے حوالے سے خاصا اہم کام کیا ہے۔ کتاب ہذا میں انھوں نے منٹو کے افسانوں کا انتخاب اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس انتخاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اسلم پرویز نے منٹو کے معروف افسانوں سے الگ ایسے افسانوں کا انتخاب کیا ہے جن پر کم گفتگو ہوئی ہے۔ نکی، ڈارلنگ، پھنک، دس روپے، ٹیٹوال کا کتا، انجام بخیر، اوپر، نیچے درمیان، شاہ دولے کا چوہا، گورکھ کی وصیت، یزید، 1919 کی ایک بات، آخری سیلوٹ افسانوں کا انتخاب واقعی مختلف ہے۔ اسلم پرویز کا ماننا ہے کہ منٹو شناسی، منٹو کے چند معروف افسانوں تک ہی محدود ہے۔ اسلم پرویز کی یہ کتاب منٹو شناسی میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہاب ظفر اعظمی نئی نسل کے ممتاز فکشن ناقد ہیں، فکشن پر ان کی کئی تنقیدی کتب بشمول اردو ناول کے اسالیب، شائع ہو چکی ہیں۔ 'مطالعات فکشن' ان کی تازہ ترین کتاب ہے۔ اس میں ان کے ناول اور افسانے پر لکھے گئے تقریباً پندرہ مضامین شامل ہیں، جب کہ 11 اہم ناولوں اور افسانوی مجموعوں پر تبصرات بھی شامل ہیں۔ شہاب ظفر اعظمی کا اپنا نظریہ نقد ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں کرشن چندر، بلونت سنگھ، شمین مظفر پوری سے لے کر انتظار حسین، لالی چودھری، احمد صغیر، صادقہ نواب سحر، سلمیٰ صنم، بلراج بخشی، ابرار مجیب اور مہتاب عالم پرویز جیسے نئے لکھنے والوں پر بھی بھرپور گفتگو کی ہے۔

'سجاد حیدر یلدرم کا فکر وفن' اورنگ آباد کی ابھرتی ہوئی فکشن ناقد اسود گوہر کی کتاب ہے۔ یہ اسود گوہر کا ایم فل کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسود نے سجاد حیدر یلدرم کی فکشن نگاری کے علاوہ، ڈرامہ، رپورتاژ، خطوط اور شاعری کا بھی بخوبی جائزہ پیش کیا ہے۔ سجاد حیدر کے فکر وفن پر یہ کتاب خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

'نشانات سہروردی' (حمید سہروردی: فکر وفن)، واجد اختر صدیقی کا ترتیب کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ حمید سہروردی 60 کے بعد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ یہ اسی نسل کے معتبر رکن ہیں، جس نسل نے افسانے اور قاری کے رشتے کو ازسرنو بحال کیا۔ کتاب میں حمید سہروردی پر تحریر کردہ عمدہ مضامین شامل ہیں۔ مہدی جعفر، فیاض رفعت، نظام صدیقی، علی احمد فاطمی، عشرت ظفر، خالد جاوید، سلام بن رزاق، نور الحسنین، م۔ ناگ، شموئل احمد، نسیم اعظمی، شمیم طارق، طارق سعید، احمد رشید، غضنفر اقبال، ابو صارم جیسے ناقدین اور فکشن نگار کے مضامین، تبصروں اور تجزیوں سے حمید سہروردی کے فن کی عمدہ تشریح وتوضیح ہوتی ہے۔

'معاصر اردو افسانہ (تفہیم وتجزیہ)' جلد اول ڈاکٹر ریاض توحیدی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نئی صدی کے اہم فکشن ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ مختلف رسائل وجرائد میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کتاب ہذا میں انھوں نے 25-20 / برسوں میں شائع ہونے والے اہم افسانوں کو تجزیے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بعض اہم افسانوی مجموعوں پر تبصرے اور اردو افسانے کے تعلق سے کئی اہم مضامین بھی شامل کتب ہیں۔ مضامین میں انھوں نے افسانے کے فن سے لے کر علامتی افسانہ، مائکرو فکشن اور کشمیری افسانے کے مختلف پہلوؤں پر جو بحث کی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

'ایک لفظ کی موت' پروفیسر صادق کی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید کی اس کتاب سے انکشاف ہوا کہ پروفیسر صادق بھی اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نئی نسل کی منفرد فکشن نگار اور فکشن ناقد ہیں۔ ان کی کئی تنقیدی کتب شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ 'ایک لفظ کی موت' میں ڈاکٹر عشرت ناہید نے پروفیسر صادق کی سات ایسی کہانیوں کا انتخاب کیا ہے جو تجرباتی کہانیاں ہیں۔ ان میں پروفیسر صادق نے تجربات کیے ہیں۔ دراصل ان کے زیادہ افسانے جدیدیت کے عروج کے وقت کے افسانے ہیں۔ یہ زمانہ تجربات کا تھا۔ پروفیسر صادق نے متعدد تجربات کیے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

'توبۃ النصوح: ایک تلخیص، ایک تجزیہ' پروفیسر اعجاز علی ارشد کی کتاب ہے جس میں انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے معروف زمانہ ناول توبۃ النصوح کی تلخیص کے ساتھ ساتھ عمدہ تجزیہ بھی کیا ہے۔ دراصل اس طرح کی کتابیں نصابی ضرورت کے تحت تیار کی جاتی ہیں، جو طالب علموں کی قرأت اور معنی تک رسائی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

'آج کا کشمیری افسانہ' شفیع شوق کا انتخاب اور ترتیب شدہ ہے جسے الطاف انجم نے کشمیری سے اردو ترجمہ کیا ہے۔ الطاف انجم ابھرتے ہوئے ناقد ہیں۔ کتاب ہذا میں کشمیر کے تقریباً دو درجن افسانے شامل ہیں۔ الطاف انجم کے ترجمہ شدہ یہ افسانے، کشمیری افسانے کی سمت ورفتار اور صورت حال کو سمجھنے کے لیے بہترین ذریعہ ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے اس کتاب کو اچھے اور خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

'اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار' جلد دوم، محترمہ اسامنیّ کی کتاب ہے۔ کتاب ہذا کو خواتین افسانہ نگاروں کا تذکرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کتاب کی جلد اول 2017 میں شائع ہو چکی ہے جس میں نذر سجاد حیدر سے شائستہ فاخری تک تقریباً 26 افسانہ نگار خواتین کے تذکرے شامل تھے۔ جلد دوم میں تقریباً 106 خواتین افسانہ نگاروں کے تذکرے ہیں۔ ان میں حمیدہ سلطان، سرلا دیوی سے لے کر موجودہ دور کی روشن آرا تک شامل ہیں۔ دونوں جلدوں کو ملا کر خواتین افسانہ نگاروں کے تعلق سے اہم معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ دونوں جلدوں میں زمانے کا کوئی تعین نہیں ہے اور نہ ہی حروف تہجی کے لحاظ سے درجہ بندی۔ دونوں جلدوں میں نئی پرانی افسانہ نگار شامل ہیں۔ اگر پہلی جلد میں ابتدا سے 1960 تک اور دوسری میں 1960 سے موجودہ عہد تک کی، ترتیب یا پھر حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

'قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری' محترمہ مہناز عبید کی تنقیدی کاوش ہے۔ دراصل یہ محترمہ مہناز عبید کا ایم فل کا مقالہ ہے جسے انھوں نے پروفیسر شمیم حنفی کے زیر نگرانی مکمل کیا تھا۔ مہناز عبید نے قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری پر خاطر خواہ کام کیا ہے۔ مقالے کے باب دوم میں قاضی عبدالستار کے اہم افسانوں پیتل کا گھنٹہ، رضو باجی، مالکن، دھند لے آئینے، دیوالی، لالہ امام بخش، سوچ، مجری، ایک

کہانی،، ٹھاکر دوارہ، پر چھائیاں کے عمدہ تجزیے کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے قاضی عبدالستار کے اسلوب اورانفراد پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

'نئی صدی کا اردو افسانہ' ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی اہم کتاب ہے۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی فکشن تنقید کے حوالے سے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہیں، اس سے قبل ان کی کتاب 'چاندنی بیگم : ایک مطالعہ' کے دو ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔ 'نئی صدی کا اردو افسانہ' میں ڈاکٹر ارشاد نے موجودہ منظرنامے کے اہم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب شامل کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ حصہ اول میں آٹھ افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تجزیے شامل کیے ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار ہیں جو گذشتہ صدی میں مستحکم شناخت قائم کر چکے تھے اور آج بھی متحرک ہیں۔ حصہ دوم میں تیرہ افسانہ نگاروں کے افسانے اور ان کا تجزیہ شامل ہے۔ یہ سب کے سب اکیسویں صدی کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ارشاد نے افسانہ نگاروں کا انتخاب صرف ہندوستان تک محدود نہیں رکھا بلکہ عالمی منظر نامے میں اردو کے جو اہم افسانہ نگار ہیں،ان سب کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

'اسلم جمشید پوری: اردو افسانے کی منفرد آواز' الہ آباد یونیورسٹی کی صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر صالحہ رشید کی کتاب ہے۔ جس میں انھوں نے اسلم جمشید پوری کے معروف افسانے لینڈرا کا فارسی کے افسانہ نگار جلال آل احمد (1923-1969) کے مشہور زمانہ افسانہ 'بچہ مردم' کے ساتھ تقابلی مطالعہ اور دونوں افسانوں کو فارسی اور اردو رسم الخط میں شامل کیا ہے۔ ساتھ ہی اسلم جمشید پوری کے دیگر افسانوں اور

فکشن تنقید پر گفتگو کی ہے۔

'حسن رہبر ایک منفرد افسانہ نگار' ڈاکٹر احسان عالم کی ترتیب کردہ کتاب ہے۔ حسن رہبر ہمارے معروف افسانہ نگار ہیں۔ ڈاکٹر احسان عالم نے حسن رہبر پر تحریر کردہ مضامین، افسانوں کے تجزیے اور تبصروں کو یکجا کردیا ہے۔ ان مضامین میں وزیر آغا، انور سدید سے لے کر رضوان احمد، مناظر عاشق ہرگانوی، قمر جہاں، مشتاق احمد نوری، سید احمد قادری اور نئی نسل کے نوشاد منظر، سلمان عبد الصمد، منصور خوشتر کے لکھے مضامین کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ حسن رہبر کی افسانہ نگاری اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں یہ کتاب خاصی معاون ہے۔

'شمیم مظفر پوری کے منتخب افسانے' ڈاکٹر صوفیہ شیریں کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ ڈاکٹر صوفیہ کا شمار بنگال سے ابھرنے والی نئی نسل کے ناقدوں میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل آپ کی ایک کتاب 'منٹو کی خاکہ نگاری' شائع ہو چکی ہے۔ شمیم مظفر پوری ایک زمانے میں اردو فکشن کے منظرنامے کا بہت مقبول نام تھا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ایسے باکمال فکشن نگار کو بھلا دیا۔ صوفیہ شیریں نے ان کے افسانوں کا انتخاب کر کے ایک بار پھر انہیں زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

' پریم چند کے افسانوں میں دلت مسائل' نئی نسل کے ابھرتے ہوئے ناقد ڈاکٹر نور نبی آزاد کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر نور نبی نے پریم چند کے افسانوں کا

بغور مطالعہ کرتے ہوئے ان کے دلت افسانوں کی نشاندہی کی ہے۔ ساتھ ساتھ پریم چند کے افسانوں میں دلت مسائل کی عکاسی بھی کی ہے۔ انھوں نے پریم چند کو اردو میں دلت افسانوں کا موجد بھی قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی پریم چند کے دلت کرداروں پر بھی خاصی گفتگو کی ہے۔

'شمیم مظفر پوری: ایک ہمہ جہت شخصیت' ڈاکٹر صوفیہ شیریں کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے اپنی کاوش سے شمیم مظفر پوری کے فکر وفن اور شخصیت پر سیر حاصل مواد جمع کر دیا ہے۔ خود ان کا پچاس صفحات کا مقدمہ اس طرف ایک اچھی کاوش ہے۔ عبد المغنی، طلحہ رضوی برق، احمد یوسف، توقیر عالم، وہاب اشرفی، مظہر امام، اعجاز علی ارشد، منظر اعجاز، سید احمد قادری، شہاب ظفر اعظمی، ہمایوں اشرف سمیت تقریباً تین درجن اسکالرز کے مضامین، شمیم مظفر پوری کی افسانہ نگاری، ناول نگاری، افسانوں اور ناولوں کے تجزیے، تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔

' عصمت شناسی' اتر پردیش اردو اکادمی کی شائع کردہ کتاب ہے۔ جسے اسلم جمشید پوری نے مرتب کیا ہے۔ کتاب میں عصمت چغتائی پر تقریباً 38 مضامین، افسانوں، ناولوں کے تجزیے اور انٹرویوز شامل ہیں۔

ماہنامہ 'پیش رفت' نے نومبر۔دسمبر 2018 کا شمارہ، خصوصی اشاعت کے طور پر' ہندوستان میں اردو افسانہ 1980 کے بعد' شائع کیا۔ پیش رفت کے اس شمارے کے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ شمارے میں 1980 کے بعد کے افسانہ اور افسانہ نگاروں پر متعدد اہم مضامین شامل ہیں۔ غضنفر، ڈاکٹر محمود شیخ، اسلم جمشید پوری، ہمایوں اشرف، ابوبکر عباد، معصوم عزیز کاظمی، نور الحسنین، سید احمد قادری، اسد اللہ، ایم سعد الدین، نسیم احسن، فاروق اعظم، وقار انور وغیرہ کے تقریباً دو درجن مضامین، سید محمد اشرف، ابن کنول کے افسانے اور وقار انور کے افسانچے بھی شامل ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر 1980 کے بعد شائع ہونے والے اہم مجموعے، اہم افسانے اور افسانوی تنقید پر کتب کی ایک فہرست بھی شامل ہے۔

لاہور سے شائع ہونے والے معروف زمانہ رسالہ 'فنون' احمد ندیم قاسمی کی یادگار کے طور پر جاری وساری ہے۔ جسے ان کی بیٹی ناہید قاسمی اور نواسے نیر حیات قاسمی نے پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ رکھا ہے۔ رسالے کا خاص شمارہ 'احمد ندیم قاسمی نمبر' کی شکل

میں دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ دونوں جلدوں میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں، افسانہ نگاری، شاعری، صحافت، خطوط، کالم وغیرہ پر پوری دنیا کے اہل وعلم و ادب کے مضامین، تبصرے، تجزیے، تاثرات شامل ہیں۔ فنون کا یہ شمارہ یادگار ہے۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال نئی نسل کے نمائندہ ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ 'جوہی کی مالا' ان کے ذریعے ترتیب دیا گیا بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ مجموعے میں 13 کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کے ایک ساتھ شائع ہونے سے بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں کو سہولت ہوگی۔ ساتھ ہی بچوں کی ذہنی اور علمی تربیت میں بھی یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

'ہم تم دوست ہوئے' منصور صفدر نقوی کی تحریر کردہ ایسی کہانی ہے جو بچوں کو پیڑ پودوں سے محبت پیدا کرنے اور ان کی حفاظت کا درس دیتی ہے۔ 'ہم تم دوست ہوئے' دراصل ایک طویل کہانی ہے جسے کتابی شکل میں دیدہ زیب گیٹ اپ اور رنگین تصاویر کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ کہانی میں بچوں کو پیڑ پودوں کو بھی جاندار سمجھنے اور ان سے محبت آمیز رویہ اختیار کرنے کی طرف مائل کیا گیا ہے۔

متعدد رسائل میں فکشن شائع ہو رہا ہے۔ خصوصی گوشے، خاص شمارے اور نمبر بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ندائے گل (لاہور)، انہماک (لاہور)، اجراء (کراچی)، سیپ (کراچی)، ثالث (مونگیر)، نگینہ (کشمیر)، دربھنگہ ٹائمز (دربھنگہ)، تحریک ادب (بنارس)، شاعر (ممبئی)، آجکل، ایوان اردو، خواتین دنیا، پیش رفت (دہلی)، زبان و ادب (پٹنہ)، مژگاں (کولکاتہ)، استفسار (جے پور)، روشنائی (کراچی)، فکر و تحریر، روح ادب (کولکاتہ)، تحقیق و تخلیق (مئو)، سب رس (حیدرآباد)، عالمی انوار تخلیق (رانچی)، موج اردو (علی گڑھ)، اردو آنگن (ممبئی)، لاریب (لکھنؤ) نیا دور (لکھنؤ)، جہاں نما (گنگوہ) وغیرہ رسائل میں افسانے، فکشن تنقید اور ناولوں کی اقساط وغیرہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ مائیکرو فکشن کی اشاعت نے گذشتہ برس ہنگامہ برپا کیا۔ مائیکرو فکشن کو لے کر خاصی بحث جاری رہی۔

2018 میں فکشن کو فروغ دینے والی دیگر سرگرمیاں بھی زور و شور سے جاری رہیں۔ متعدد قومی اور بین الاقوامی سیمینار، ورکشاپ اور سمپوزیم منعقد ہوئے۔ جولائی ماہ میں اردو انجمن برلن نے رضیہ سجاد ظہیر اور احمد ندیم قاسمی پر یک روزہ عالمی سیمینار منعقد کیا جس میں مقالات کے علاوہ رضیہ سجاد ظہیر اور احمد ندیم قاسمی کی زندگی اور کارناموں کو فلم کے ذریعے پردے پر دکھایا گیا۔

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی نے فروری میں ایک دو روزہ قومی سیمینار بعنوان اکیسویں صدی میں اردو ناول کا انعقاد کیا۔ شعبۂ اردو کلکتہ گرلس کالج نے اکیسویں صدی میں اردو ڈراما، عنوان پر دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا۔ ادارہ ادب اسلامی نے دہلی میں دو روزہ قومی سیمینار بعنوان 'ہندوستان میں اردو افسانہ 1980 کے بعد' کا کامیاب انعقاد کیا۔ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی نے چہار روزہ کثیر لسانی بین الاقوامی سیمینار 'موجودہ سماجی تغیرات کے فکشن پر اثرات' (اردو، ہندی، انگریزی) منعقد کیا۔ شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے سال کے آخر میں 'اکیسویں صدی میں اردو فکشن' پر دو روزہ عالمی سیمینار کا کامیاب انعقاد کیا۔ کراچی آرٹ کاؤنسل نے اپنی گیارہویں عالمی کانفرنس میں ایک بھرپور سیشن 'اردو فکشن: ماضی، حال اور مستقبل' کا انعقاد کیا جس کی صدارت اسد محمد خاں اور مستنصر حسین تارڑ نے کی۔

ساہتیہ اکادمی، دہلی نے اس سال اردو کا ایوارڈ جواں سال ناول نگار، رحمٰن عباس کے نام کیا۔ رحمٰن عباس کا شمار اردو ناول نگاروں کی نئی نسل سے ہے۔ ان کے اب تک چار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ انہیں ان کے ناول 'روحزن' پر ساہتیہ اکادمی انعام دیے جانے کا اعلان ہوا ہے۔

2018 میں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ، برائے فکشن، سلام بن رزاق اور ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ برائے فکشن تنقید ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کو دیا گیا۔ ہر سال یہ ایوارڈ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ سے ڈاکٹر منظر کاظمی کی یوم ولادت کے موقع پر دیے جاتے ہیں۔

روزنامہ انقلاب نے، ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک افسانے پر تین چار لوگوں کی آراء، افسانے کی تلخیص کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں شوکت حیات، عبدالصمد، مشتاق احمد نوری، ایم مبین وغیرہ کے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

گذشتہ برس کا ایک یادگار واقعہ 'داستان ہجرتوں کی' ہے۔ معروف ڈراما نگار، ہدایت کار اور اداکار، جاوید دانش (کناڈا) نے اپنی داستان، ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ یو ایس اور یو کے، جرمنی وغیرہ میں پیش کی۔ جاوید دانش، محمود فاروقی وغیرہ کی کاوشوں سے داستان سننے سنانے کے عمل کا احیاء ہو رہا ہے جو اردو فکشن کے لیے خوش آئند ہے۔

2018 میں متعدد ادباء و شعراء ہم سے رخصت ہوئے۔ معروف فکشن نگار اور ہمارے عہد کی شناخت پروفیسر قاضی عبدالستار بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے انتقال پر پوری اردو دنیا غمزدہ ہوئی، خصوصاً اردو فکشن پر غم و اندوہ کے بادل چھائے رہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری بھی چل دیے۔ حامدی کاشمیری کی بنیادی شناخت یوں تو شاعر اور تنقید نگار کی ہے لیکن آپ نے افسانے اور ناول بھی قلم بند کیے جنھیں آج بھی کشمیر کے پس منظر میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔

2018 میں سوشل میڈیا پر بھی فکشن کی خاصی دھوم رہی۔ فیس بک پر عالمی افسانہ میلہ اپنی پوری آن بان کے ساتھ منعقد ہوا، جس میں سیکڑوں افسانے شائع ہوئے جن پر افسانہ قارئین کے ملے جلے تاثرات بھی شائع ہوتے رہے۔ جشن افسانہ، نام سے فیس بک پر ایک انوکھا Event سامنے آیا۔ اس کو مقابلے کی صورت دی گئی ہے۔ یہ گذشتہ برس سے شروع ہوا اور ابھی تک جاری ہے۔ ان کے لیے وحید قمر، اسما حسن، سید تحسین گیلانی، ریاض توحیدی وغیرہ کو مبارک باد!۔

گذشتہ برس عالمی بزم افسانہ کا بھی انعقاد عمل میں آیا۔

وہاٹس ایپ پر مختلف گروپ بنتے اور مٹتے رہے۔ اردو چینل (مدیر قمر صدیقی) نے پورے سال اور 365 دن اردو زبان و ادب کی اہم معلومات، کتب وغیرہ کو شائع کیا۔ متعدد ناول، بے شمار افسانے بھی پورے سال اَپ لوڈ ہوتے رہے۔ قمر صدیقی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پورے سال ادب خصوصاً فکشن کی اہم تخلیقات کو عوام تک پہنچانے کا بڑا کام انجام دیا۔ وہاٹس ایپ پر اس سال 'اردو افسانہ و افسانچہ' (محمد علیم اسماعیل) بھی جاری ہوا جس میں افسانچے اور افسانے کے علاوہ فکشن پر عمدہ مضامین بھی لوڈ ہوتے رہے۔

اردو نیٹ جاپان (جاپان) شعر و سخن (کناڈا) اردو سخن (پاکستان) پاسبان (جرمنی) عالمی پرواز (جمشید پور) اردو دوست (کلکتہ) لن ترانی ڈاٹ کام (ممبئی) وغیرہ پر افسانے اور فکشن تنقید شائع ہوتی رہی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ 2018 اردو فکشن کے لیے اہم سال ثابت ہوا ہے۔ کئی اہم ناول، افسانوی مجموعے، فکشن تنقید پر کتب، فیس بک پر افسانوی میلے، وہاٹس ایپ پر افسانے اور افسانوں کی اشاعت سے نیا منظر نامہ سامنے آیا ہے۔ نئے افسانہ نگار اور ناقدین سامنے آرہے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
HOD, Urdu
CCS University, Meerut (UP)
aslamjamshedpuri@gmail.com
09456259850

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

شبنم اسد

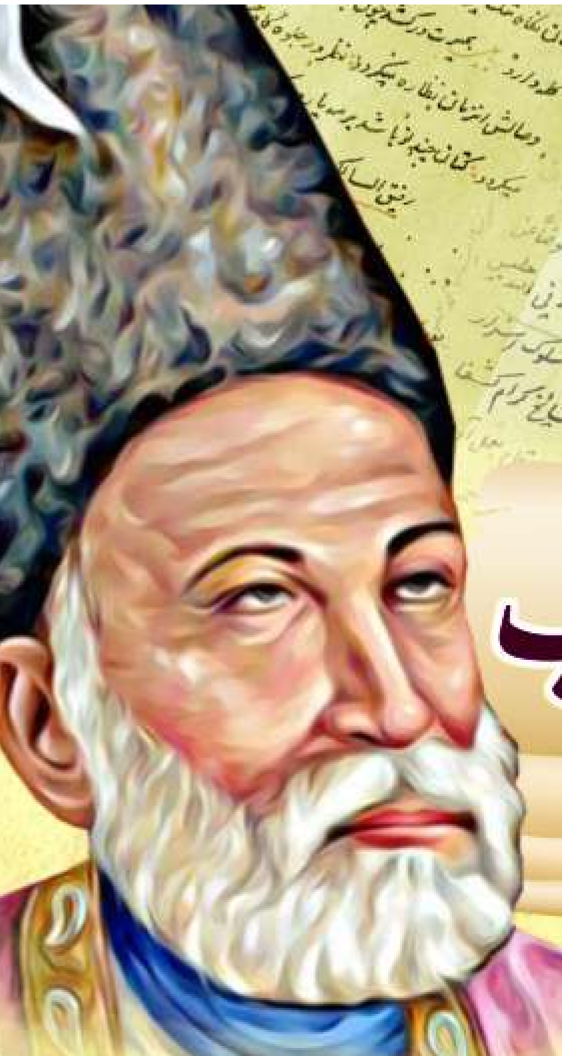

خطوطِ غالب کے مختلف پہلو

خطوط نگاری کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جس قدر فنِ تحریر کی تاریخ۔ انسان مٹی اور چمڑے کی لوحوں، دھات کی پتیوں اور درختوں کے پتوں پر لکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھیجا کرتا تھا۔ خطوط نگاری کو بعض اہل قلم حضرات نے لطیف ترین فن سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال ان ہی لوگوں نے حاصل کیا جنھوں نے سخنِ دل پذیر کو خط کی شکل دیتے ہوئے خونِ جگر صرف کیا ہے۔

'خط' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لکیر یا تحریک ہیں۔ لیکن عربی میں عموماً یہ لفظ تحریک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مکتوب، مراسلہ، نامہ اس کے مترادف ہیں۔ خط سیدھا سادا اور دو حرفی لفظ ہے جو عام طور پر دو اشخاص کے درمیان اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ یعنی مکتوب نگار (خط لکھنے والا) اپنے خیالات مکتوب الیہ (جس کو خط بھیجا گیا ہو) کو بھیجتا ہے۔

''خط کیا ہے آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت ہے''۔ (سید سلیمان ندوی)

خط دراصل قطعاً شخصی و ذاتی چیز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے والے کی شخصیت تمام حجابوں اور پردوں سے باہر آجاتی ہے۔ خطوط نگار شخصی اعتبار سے کوئی بھی ہوسکتا ہے وہ کوئی بڑا فن کار بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن خط کے ذریعے سے وہ ایک عام آدمی کی طرح ابھر آتا ہے۔ اگر خط لکھنے والے کو زندگی کا فہم و ادراک ہے، اس کی انگلیاں نبضِ کائنات پر ہیں اور انسانی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہے تو وہ غیر معمولی شہرت و مقبولیت بلکہ آفاقیت حاصل کرلیتا ہے۔ اردو میں اس کی مثال غالب ہیں۔ یہ ضروری نہیں ایک اچھا ادیب اچھا مکتوب نگار بھی ہو بلکہ یہ خداداد صلاحیت ہے۔

''خطوں کا معاملہ عشق و محبت کا ہے جس طور پر محبت ہوجاتی ہے کی نہیں جاتی، اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا''۔ (رشید احمد صدیقی)

مگر مرزا غالب اردو کے جتنے اہم شاعر تھے، اتنے ہی اہم مکتوب نگار بھی تھے۔ اگر انھوں نے شاعری نہ کی ہوتی اور صرف خطوط ہی لکھے ہوتے، تب بھی تاریخ ادب اردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ غالب کے خطوط کے متعدد مجموعے: مہر غالب، مرتبہ عبد الغفور سرور 1862، انتخاب غالب 1886 عود ہندی مرتبہ منشی ممتاز علی خان 1868، اور معلی مرتبہ حکیم غلام رضا خان 1869، مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی 1937، ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری 1919، خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد 1941، نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق 1969، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر 1951، غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ خلیق انجم 1961، کے علاوہ غالب کے خطوط رسالوں اور کتابوں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

غالب کے اردو خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک تو وہ خطوط جو کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں اور دوسرے وہ خطوط جو بطور تفریح یعنی مکتوب نگاری کے شوق کی تکمیل کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بجا طور پر اندازہ کیا جائے تو شوقیہ خطوط مقدار میں کہیں زیادہ نظر آئیں گے۔ یہ درست ہے کہ غالب نے اردو میں خطوط نگاری کا آغاز ضرورتاً کیا تھا لیکن بعد میں اس کام میں ان کو لطف آنے لگا۔ کیونکہ خطوط کے ذریعہ انھوں نے خلوت میں جلوت کی شان پیدا کرلی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بزم سجی ہوتی ہے جس میں ان کے عزیز دوست، معتقد، مداح، ممدوح اور شاگرد سب ہی شریک ہیں۔ اس بزم کی فضا شگفتہ اور تصنع و تکلف سے پاک ہے۔ غالب ان اہل بزم کو اپنے دکھ و درد میں شریک کررہے ہیں۔ اپنی ناکامیوں پر ماتم اور کامیابیوں پر خوشی کا اظہار کررہے ہیں۔ یہی نہیں اہل بزم کے دکھ درد اور خوشی میں خود بھی برابر شریک ہیں۔

خطوط غالب میں مختلف پہلوؤں کی جادوگری کو سبھی نے تسلیم کیا ہے کہ جس نے ان کو ایک بار پڑھ لیا وہ ان کی دلکشی اور جادواثری کا قائل ہوگیا۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو برس کے گزر جانے کے بعد بھی ان خطوط کی تازگی اور جاذبیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ان کی مقبولیت میں متواتر اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ان خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ خط کسی کے نام ہو، قاری کو یہ گمان ہوتا ہے کہ غالب گویا مجھی سے محو گفتگو ہیں۔ دراصل غالب کی جدت پسند طبیعت نے خطوط نگاری کا بالکل نیا اور جداگانہ انداز پیدا کیا۔

غالب کا شمار جدید اردو نثر کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اس دور کی مکتوب نگاری پر فارسیت کی گہری چھاپ تھی۔ اردو خطوط میں عربی و فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ وتراکیب، مسجع ومقفیٰ عبارت آرائی، پر پیچ اسلوب بیان اور مخاطبت کے لیے طویل فقرے یا القاب کا استعمال عام تھا۔ خطوط غالب کی سب سے انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم انداز کی عبارت آرائی کو قطعی طور پر ترک کردیا۔ پہلے مقفیٰ ومسجع عبارت لکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اپنی علمیت اور قابلیت کا اظہار دقیق اور ادق الفاظ استعمال کرکے کیا جاتا تھا۔ غیر ضروری طور پر تشبیہات اور استعارات کا استعمال لازمی سمجھا جاتا تھا۔ عبارت کو رنگین، پر تکلف بنانے میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اظہار مدعا کی جگہ عبارت آرائی مقصود بذات بن جاتی تھی۔ خود لکھنے والا عبارت کو رنگین بنانے کے بعد راست انداز میں بھی اپنی بات بیان کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ غالب نے اپنی تحریروں میں ایسی تمام باتوں سے اجتناب کیا، جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی بات آسانی کے ساتھ بلا تکلف بیان کردیتے تھے۔ غالب کی وجہ سے اردو نثر اس قابل ہوئی کہ ہر جذبے، کسی بھی کیفیت اور صورت حال کو پوری طرح سے بیان کرسکے۔ بعد میں سرسید اور ان کے رفقاء نے اسی جدید نثر کو معراج کمال تک پہنچادیا۔

غالب کے خطوط کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا ہے۔ ان کو اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ انھوں نے اپنے خطوط کو بات چیت بنادیا ہے۔ مراسلے کو مکالمہ بنادینا خاص غالب کی ایجاد تھی۔ حالی نے بجا طور پر یہ بات کہی ہے کہ ''نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ بعد میں کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہوسکی۔ غالب نے بہت سے خطوط میں بالکل اپنا انداز ایجاد کیا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کررہے ہیں کسی کے خط آنے کو خود اس کا آنا کہتے ہیں۔ خطوط کے لکھنے اور پڑھنے کو وہ باتیں کرنا کہتے تھے۔ اردو مکتوب نگاری میں غالب نے جو مخصوص اسلوب بیان اختیار کیا تھا اور مراسلے میں مکالمے کا یا تحریر میں تقریر کا لطف پیدا کردیا تھا اس کی مکمل پیروی نہ تو ان کے معاصرین ہی کرسکے اور نہ ان کے بعد کسی نے کی۔ اسی لیے حامد حسن قادری کو کہنا پڑا۔

غالب نے اپنی تحریروں میں ایسی تمام باتوں سے اجتناب کیا، جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی بات آسانی کے ساتھ بلا تکلف بیان کردیتے تھے۔ غالب کی وجہ سے اردو نثر اس قابل ہوئی کہ ہر جذبے، کسی بھی کیفیت اور صورت حال کو پوری طرح سے بیان کرسکے۔ بعد میں سرسید اور ان کے رفقاء نے اسی جدید نثر کو معراج کمال تک پہنچادیا۔

''اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں جدتیں پیدا کیں اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی''۔ (داستان تاریخ اردو، ص 217)

غالب کے خطوط کی ایک اور خصوصیت ان کی شوخی تحریر ہے جس کی وجہ سے وہ بے جان بات کو بھی جاندار بنادیتے ہیں۔ شوخی و بذلہ فہمی خطوط غالب کی بہت ہی منفرد خصوصیت ہے۔ اس طرح غالب کو جہاں موقع ملتا ہے لطیف مزاح سے کام لیتے ہیں اور ہر موقع پر زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اپنے دوست کو دسمبر 1858 کی آخری تاریخوں میں خط لکھا۔ خط کا جواب دوست نے جنوری 1859 کی ابتدائی تاریخوں میں دے دیا جس پر مرزا لکھتے ہیں:

''دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں 1858 کے خط کا جواب 1859 میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے دن ہی جواب لکھا ہے''۔ (خطوط غالب، ڈاکٹر خلیق انجم)

خطوط غالب میں ناول کے اجزا بھی مل جاتے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں مکالمے (Dialogue) جو لکھے ہیں بالکل ناول جیسے ہیں۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ کہ وسعت اور لچک کے ساتھ ہر قسم کے خیالات، حالات و واقعات اور کیفیات کو بیان کرکے خطوط میں ناول کی طرح داخلی اور خارجی زندگی کے ہر پہلو کا بیان ملتا ہے۔ غالب کے مکتوب الیہ کرداروں کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ ناول کے کرداروں کی طرح ان کی صفات اور انداز فکر کے بارے میں جان لیتے ہیں۔ ناول میں کردار بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ناول کی ساری دنیا انھی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی طرح غالب کے خطوط کی دنیا ان کے مکتوب الیہ سے وابستہ ہے۔ ناول میں کرداروں کے ساتھ مکالموں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مکالموں ہی کے ذریعے کردار زیادہ واضح اور روشن ہوتے ہیں۔ ناول میں زیادہ سے زیادہ انفرادی آوازوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ غالب کے خطوط میں بھی ناول جیسی آوازوں کی بہتات ملتی ہے۔ وہ جس طرح میر مہدی سے بات کرتے ہیں اس طرح مرزا تفتہ سے نہیں کرتے۔ ناظم علی مہر سے جو گفتگو کا انداز ہے وہ علاء الدین احمد خان علائی کے ساتھ نہیں۔ اسی طرح حقیقی گفتگو میں جو عمل اور ردعمل ہوتا ہے وہ موقع محل کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ ایسی صورت میں بات چیت بامعنی بنتی ہے۔ افسانوی گفتگو میں حقیقی گفتگو کی طرح عمل اور ردعمل نہیں ہوتا، بلکہ مکالمے تخلیق کیے جاسکتے ہیں۔ حقیقی گفتگو میں بات کو جتنا چاہے طول نہیں دیا جاسکتا۔ بات کاٹی بھی جاسکتی ہے گفتگو کا موضوع بدلا بھی جاسکتا ہے۔ لیکن ناول میں مصنف اپنی مرضی کے مطابق گفتگو کو طویل یا مختصر کرسکتا ہے۔ یہاں بات سے بات نکلتی نہیں بلکہ بات سے بات پیدا کی جاسکتی ہے۔ بہر حال افسانوی مکالمے اور حقیقی مکالمے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہے کہ غالب کو بھی پوری طرح سے اس بات کا احساس اور علم تھا کہ ان کے مکالموں کی نوعیت حقیقی مکالموں سے الگ اور مختلف ہے۔ کرداروں اور

مکالموں کے ساتھ ناول میں پس منظر یا زماں ومکاں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ غالب کے خطوط کے سوا زماں و مکاں یا پس منظر اس وضاحت کے ساتھ اردو خطوط کی پوری تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتا۔ 1857 کے بعد دہلی میں جو کچھ ہوا، اس کی تاریخ اور جغرافیائی کیفیت ان کے خطوط میں اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ منظر و پس منظر سانس لیتے نظر آتے ہیں اس طرح اپنے خطوط میں غالب نے ناول کے اہم ترین عناصر استعمال کیے اور یوں ناول کا انداز بیان اردو دنیا کو دیا، بعد میں انہی بنیادوں پر اردو ناول استوار ہوا۔

''جی چاہا تم سے باتیں کرنے کو، یہ باتیں کر رہا ہوں، خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس اس گفتگو میں وہ لطف نہیں جو مکالمہ زبانی میں ہوتا ہے یعنی میں ہی بک رہا ہوں تم کچھ نہیں کہے۔ وہ بات کہاں کہ میری بات کا تم جواب دیتے۔'' (غالب کے خطوط، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم)

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی زندگی کی پوری کہانی بیان کی ہے۔ انھوں نے خطوط میں اپنی زندگی کے واقعات کو ترتیب وار بیان نہیں کیا لیکن زندگی کے تمام حالات غیر شعوری طور پر یہاں تک بیان کر دیے کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے غالب کے خطوط کو سن کی ترتیب کے ساتھ جمع کر کے 'غالب کی آپ بیتی' لکھ ڈالی۔

غالب نے ان خطوط میں اپنے عہد کی تاریخ قلم بند کی ہے خاص طور پر غدر سے پہلے اور غدر کے بعد دہلی کی حالت کی جو تفصیل انھوں نے لکھی ہے وہ ان کے خطوط کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔ غالب نے چونکہ غدر سے کچھ پہلے اردو خطوط لکھنے شروع کیے تھے اس لیے ان کے خطوط میں غدر کے بعد کے حالات بھی ملتے ہیں۔ غدر کے زمانے میں مسلمان گھروں کو چھوڑ کر نکل گئے تھے تاکہ دہلی کی تباہی کی زد میں نہ آ جائیں غالب نے اپنے سیکڑوں خطوط میں دلی کا حال اور احوال لکھا ہے۔ اپنے دور کے حالات و واقعات قلم بند کیے ہیں۔ یوں خطوط غالب بھری تاریخ کے حامل بن گئے ہیں۔ دلی کی اس زمانے کی کیفیت غالب کے ایک خط میں یوں ملتی ہے۔

''واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں'' ۔(ایضاً)

غالب کے خطوط میں ان کی سماجی اور معاشی زندگی آئینہ ہوجاتی ہے۔ ہند مغل تہذیب و ثقافت کے زوال کے ساتھ جن لوگوں کی زندگی اور تصنیف وتالیف سب جگہ حزن وملال کی کیفیت رہی ان میں غالب کی مثال اہم ہے۔

خطوط غالب واقعتاً غالب کی اپنی پریشانیوں کا پشتارہ ہے لیکن پیشکش کے مخصوص انداز اور موضوع کی عمومیت نے ان ذاتی خطوط کو ملکی تہذیب و تمدن کا عہد پیمان بنا دیا۔ غالب کی ذات اور ان کے عہد کے بیچ ایسا تعلق نہیں ہوتا تو یہ خطوط اتنا بڑا علمی صحیفہ نہیں مانے جاتے۔

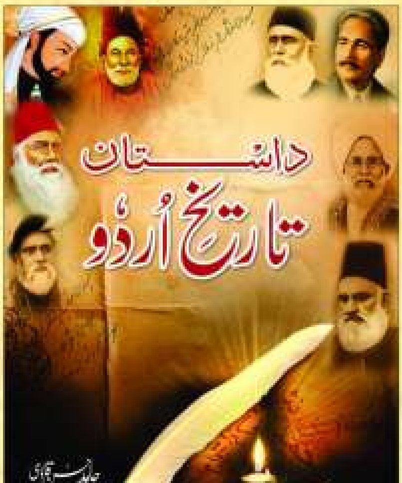

نواب علاء الدین خان غالب کے شاگرد اور قریبی رشتہ دار تھے۔ غالب نے بڑی تعداد میں انھیں خطوط لکھے ہیں۔ اپنی گھریلو پریشانیاں معیشت کی تباہی اور شہر دہلی کا اجڑنا وہ خاص موضوعات ہیں جنھیں غالب علاء الدین خان سے دوران گفتگو پیش کرتے ہیں۔ ایک خط میں غالب اپنی آمدنی اور اخراجات کا گوشوارہ تیار کرتے ہیں۔ آمدنی کم ہے اور خرچ کی تفصیل طویل تر۔ توازن بٹھانے میں اخراجات کم کرنے کی صورت میں استعمال میں لائی جاتی ہے لیکن مسئلہ پورے طور پر حل ہونے سے رہا۔

''اب باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری، سو روپے رامپور، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود و ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، مول جدا، بیوی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ تنگ آ گیا گزارا مشکل ہوگیا روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں قہر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا رات کی شراب و کباب موقوف بیس بائیس روپے مہینہ بچا روزمرہ کا خرچ۔ چلا یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے۔ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے''۔(ایضاً)

اس خط میں غالب نے سب سے پہلے اپنی آمدنی کے ذرائع بتائے۔ انگریزوں کی طرف سے ساڑھے 62 روپے اور نواب رامپور کی جانب سے 100 روپے حاصل ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ رقم کم ہے۔ خرچ کی تفصیل بتاتے ہوئے انکم ٹیکس، چوکیدار، بچے بیوی اور شاگردوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض ضروری خریداری بھی قرض لے کر ہوتی ہے۔ جس کے لیے سود ماہ بہ ماہ دینا ہوتا ہے۔ گزارا مشکل ہونا فطری ہے۔ خط میں آگے خرچ کے بچانے کی تفصیل ہے۔ صبح کا پر تکلف ناشتہ چھوڑا، دن کے کھانے سے گوشت کو ہٹایا اور رات کی محفلوں سے شراب کے اہتمام غائب ہوئے۔ اس سے چوبیس بائیس روپے ماہانہ کی جو بچت ہوئی اس سے روزانہ کے چھوٹے موٹے خرچ چلنے لگے۔ غالب آمد اور خرچ کی اس تفصیل کے بعد شراب نوشی کو موضوع بناتے ہیں اور کسی دوسرے سوال کو پیش کر کر حسن طلب کا ایک دلپذیر انداز ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ''نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے''۔

غالب کے اس خط کا متن (Text) مذاق کا ذائقہ رکھتا ہے۔ ہنستے کھیلتے ہوئے آمد اور خرچ کا گوشوارہ تیار کر دیا جاتا ہے۔ ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے کہ خانہ داری او رمعاشی انتظام میں ایک بہت ماہر شخص یہ تمام باتیں کر رہا ہے۔ عصر حاضر کے محاورے میں اگر گفتگو کریں تو پتا چلے گا کہ خط لکھنے والا Finance Management کا ہنر ور ہے۔ حالات کے اعتبار سے بدل دینا اور وسائل کے مطابق اخراجات طے کرنا اس متن کے لکھنے والے میں موجود ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ غالب ایسے نہیں تھے۔ اپنے حالات اور خواہشات کے درمیان اگر وہ توازن بٹھا سکتے تو پھر ہر لمحہ مرتے رہنے کا ذائقہ انھیں کہاں ملتا۔ خط شروع ہوتا ہے اور مصائب کی تفصیل بھی ملنے لگتی ہے۔ غالب نے بظاہر لاتعلقی سے ان مشکلوں کا ذکر کیا ہے۔ غالب کی شخصیت میں ظرافت کی ایک ایسی قوت موجود تھی جن کے سہارے مشکلوں کے پہاڑ وہ کاٹ سکتے تھے۔ اس خط کی تفصیلات میں سامنے سے ہنستا ہوا چہرہ مگر اندر سے کہیں اتنا ٹوٹا پھوٹا اور مرتا ہوا آدمی دکھائی دیتا ہے۔ غالب کی شاعری اور نثر دونوں جگہ درد و سوز کی ایک گہری پرچھائیں ملتی ہے۔ لیکن ظرافت کا نسخۂ کیمیا استعمال کر کے وہ ایک ڈرامہ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ خط ظرافت کی ڈرامائی کیفیت اور گہرے سوز کا مشترکہ اعلانیہ ہے۔

اپنی شاعری میں معاشی تنگی کا ذکر غالب نے کئی مقامات پر کیا ہے۔ دلی میں قحط غم الفت کی وجہ سے کھانے پر مشکلات کا ذکر شاعری میں موجود ہے، لیکن اگر غالب کے خطوط کی اشاعت نہیں ہوئی ہوتی تو زندگی کے اصل

رنگ پہ واقعتاً پردہ پڑا رہ جاتا۔

غالب ہر جگہ اپنی شخصیت کو نشانہ بناتے ہیں۔ ظرافت کے آلۂ کار کا جتنا بہترین استعمال وہ اس موقع سے کرتے ہیں۔ اس کی شاید ہی کوئی دوسری مثال ہمیں ملے۔ لکھنے والے کی انشاپردازانہ مہارت ایسی ہے کہ نثر نہ ہنسی مذاق کا گلدستہ بن جاتی ہے اور نہ ہی غالب کی معیشت کی رکارڈ بک۔ کمال تو یہ ہے کہ ان کے سامنے والی دونوں صورتوں سے الگ وہ درد و سوز کا گھنا سایہ ہمارے سروں پر پھیلا دیتے ہیں۔ خطوط غالب کا یہی کارنامہ اسے عدیم المثال صحیفہ بنا دیتا ہے۔

غالب سادہ زبان اور عام انداز میں زندگی کے تکلیف دہ مراحل کو بھی ہو بہو پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ہنرمندی یہ ہے کہ وہ مصائب کی تفصیلات پیش نہیں کرتے۔ وہ جگہ جگہ سے واقعات کی کچھ کڑیاں دکھائی دیتے ہیں لیکن پیش کش کا انداز و اتنا مختلف اور پر اثر ہوتا ہے کہ سیدھے قلب و نظر اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس پر مستزاد کہ بیان کے پیرائے میں ہنسی اور کھیل کا لہجہ حاوی ہے۔ حالی نے غالب کو حیوان ظریف بجا طور پر قرار دیا۔ کسی حال میں بھی ظرافت اور ٹھٹھوں کے بغیر خود کو افشا نہیں کرتے۔ اس خط میں غالب کا یہ مرغوب انداز قائم ہے۔ غالب کی انشاپردازی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی واقعات کو بنیاد بنا کر اپنے خطوط میں جو نثری ٹکڑے شامل کیے ہیں، ان کا استعمال اردو میں محاورتاً بھی ہوتا ہے۔ ایک نثر نگار کی حیثیت سے غالب کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

عام طور پر غالب کے خطوط میں ان کے عہد اور زندگی کی صبر آزما تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بالخصوص 1857 کے بعد کے خطوط غالب کی مشکل اور پریشان زندگی کے واقعات سے آراستہ ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ غالب کوئی تاریخ نویس اور آپ بیتی لکھنے والے نہیں تھے وہ اردو کے عظیم شاعر تھے اس لیے ان کے خطوط میں سب سے بڑا حصہ ایسے نوشتوں کا ہے جن میں شعر و ادب کی باریکیاں بتائی گئی ہیں۔ خصوصیت سے ایسے خطوط جن کے مخاطبین ان کے شاگرد ہیں۔ ان کا نفس مضمون شاعری کی مبادیات بتانے میں وقف ہوا ہے۔

''دیباچہ وہ تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لیا۔ کیوں روپیہ خراب کر لیتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو اور اور یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑ گئے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے، میں کہاں تک دیباچہ لکھوں گا۔ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ اور رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس سے جو کچھ فراہم ہو جائے دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔ صاحب جہاں تقطیع میں 'الف' نہ سمائے وہاں کیوں لکھو''۔ (ایضاً)

موجودہ خط غالب کے محبوب شاگرد اور دوست مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام مرقوم ہے یہ بھی قابل غور بات ہے کہ یہ خط غدر سے پہلے کا ہے۔ یہاں ایک مختصر پس منظر یہ ہے کہ مرزا ہرگوپال نے غالب سے اپنے دوسرے دیوان پر چند دعائیہ تحریر رقم کرنے کی گزارش کی۔ غالب نے اس کے جواب میں یہ مختصر خط روانہ کیا۔ پہلے جملے سے ہی غالب اپنے مخصوص ظریفانہ لہجے میں آجاتے ہیں۔ غالب کا کہنا ہے کہ مرزا کے لیے دیوان تیار کرنا اتنا آسان کام ہے

> عام طور پر غالب کے خطوط میں ان کے عہد اور زندگی کی صبر آزما تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بالخصوص 1857 کے بعد کے خطوط غالب کی مشکل اور پریشان زندگی کے واقعات سے آراستہ ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ غالب کوئی تاریخ نویس اور آپ بیتی لکھنے والے نہیں تھے وہ اردو کے عظیم شاعر تھے اس لیے ان کے خطوط میں سب سے بڑا حصہ ایسے نوشتوں کا ہے جن میں شعر و ادب کی باریکیاں بتائی گئی ہیں۔ خصوصیت سے ایسے خطوط جن کے مخاطبین ان کے شاگرد ہیں۔ ان کا نفس مضمون شاعری کی مبادیات بتانے میں وقف ہوا ہے۔

اس قدر غالب کی طرف سے تقریظ لکھا جانا ہرگز آسان نہیں۔ ہنستے ہنستے اگلا جملہ اور سخت پیش کرتے ہیں اور مدعا یہ ہے کہ نئے دیوان کی اشاعت سے روپے ضائع ہوں گے۔ مذاق کا لہجہ آگے بھی قائم رہتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ دوسرے دیوان کی اشاعت کے بعد بھی تیسرے دیوان کی تکمیل کے کام میں تم لگ جاؤ۔ خط کے پہلے جملے میں غالب نے مذاق میں جس جملے کی ابتدا کی تھی اس کا عروج آگے آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے، میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا۔''

غالب اپنے شاگرد کو بسیار گوئی سے روکنا چاہتے ہیں۔ دیوان کو چھاپ کر عوام کے سامنے لے جاتے ہیں۔ غالب نے خود بھی کبھی جلد بازی نہیں کی۔ شاگرد کو جلدی جلدی دیوان نہیں چھاپنے کی ہدایت مقصود ہے۔ اس کے لیے پہلے تو انھوں نے تاویلی کلمے پیش کیے کہ تقریظ کا لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ شاگرد جب تک چند کلمے ان سے نہیں لکھا لے اپنا دیوان کس طرح شائع کرسکتا ہے۔ دیوان کی اشاعت سے روکنے کے لیے ایک علاحدہ مشورہ بھی دیا۔ بچوں کو جس منطق (Logic) سے قابو میں کرتے ہیں اسی انداز سے غالب نے مرزا ہرگوپال کو نشانہ بنایا ہے۔ بڑے لطف سے کہتے ہیں کہ تم موجودہ غیر مطبوعہ دیوان کو گزشتہ شائع شدہ دیوان کے برابر بنالو کچھ اور غزلیں کہہ لو اور اس کی ضخامت بڑھالو۔ مقصد یہ ہے کہ دیوان ابھی چھپے نہیں۔

دیوان کی اشاعت روکنے کی مہم یہیں ختم نہیں ہوتی۔ مرزا ہرگوپال کو غالب ایک علاحدہ مشورہ دیتے ہیں اور اردو کی دو قدیم اصناف کی طرف ان کی توجہ دلاتے ہی قصیدہ اور رباعی اردو کی دو ایسی صنفیں ہیں جن میں استادانہ مہارت اور فنی ہنرمندی سب سے زیادہ چاہیے۔ آج یہ بات صحیح نہ ہو، لیکن عہد غالب میں یہ سب مانتے تھے کہ پختہ مشق کے بعد ہی رباعی اور قصیدہ کی طرف جانا چاہیے۔ غالب نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اب تمھیں قصیدہ اور رباعی جیسی اصناف کو خاص طور پر آزمانا چاہیے۔ اس مشورے میں جہاں ایک طرف مشق سخن کی پختہ کامی کی طرف جھکاؤ ہے وہیں دوسری طرف دیوان کی تیاری کا معاملہ خوش اسلوبی سے (Pending) ڈال دیا گیا ہے۔ اس اپنائیت اور چالاکی سے غالب یہ بتاتے ہیں کہ دو چار برس قصیدہ اور رباعی کہہ دو گے تو وہ سب کلام اس دیوان میں شامل کر لینا۔ مدعا یہ کہ شاگرد کا دیوان ابھی نہ چھپے۔

غالب نے اپنے شاگردوں کو بے تکلفی کے ساتھ خطوط لکھے۔ ان کے مکاتیب کے جواب میں بھی غالب نے تفصیل سے خطوط روانہ کیے۔ اگر خطوط کا یہ سرمایہ ہمارے ساتھ نہیں ہوتا تو غالب کی پسند ناپسند اور ذاتی زندگی کے نہ جانے کتنے مصائب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتے موجودہ خط غالب کے مشہور شاگرد میاں داد خاں سیاح کے نام مرقوم ہے

''کیا فرمائش کروں اور کیا تم سے منگاؤں وہاں کون سی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دہلی آم بھیجنا، محض تکلف ہے۔ روپے کے آم اور چار روپے محصول ڈاک اور پھر سو میں

سے شاید دس پہنچے۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرو۔ یہاں دیسی انواع اقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبو افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بہ سبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اے لو، آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کو بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے دو ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تیراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے''۔ (ایضاً)

استادی اور شاگردی کے انداز قدیم میں استاد کی طرف سے فرمائش کرنا اور شاگرد کی طرف سے اس کی تعمیل کرنا بنیادی فرائض میں داخل تھا۔ موجودہ خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاگرد غالب نے خود استاد سے اصرار کیا کہ اپنی پسند کی کوئی شے وہ طلب کریں۔ اسی فرمائش و طلب میں غالب کا یہ خط وجود میں آیا ہے۔ اردو ادب کے طالب علم کو یہ بتاتا ہے کہ غالب کو کون سا پھل پسند ہے۔ یادگار غالب میں حالی نے ایسے کئی لطائف جمع کر دیے ہیں جن میں غالب کی ایک مخصوص پھل سے رغبت ظاہر ہوتی ہے۔ اس خط میں بھی غالب اسی پھل سے اپنی فرمائش کا سلسلہ جوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ آم کے سوا اور کون پھل ہوسکتا ہے جس کی تعریف میں غالب نے پوری نظم کہہ رکھی ہے۔

غالب اپنی بات انکاری انداز میں شروع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرمائش کروں کہ کیا کروں اور آخر کون سی چیز منگاؤں اس انکار کو اور مضبوطی عطا کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''وہاں کون سی چیز ہے کہ یہاں نہیں''۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرمائش کا سرا نہیں دم توڑ رہا ہے۔ لیکن غالب آم کے بغیر کیسے جی سکتے ہیں۔ انکار کرتے کرتے آخر کہہ ہی دیا کہ اگر میری دلچسپی جاننا چاہتے ہو تو جانتے ہو کہ آم مجھے کس قدر پسند ہیں۔ اس بات پر اضافہ کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ آم مجھے انگور سے کم عزیز تر نہیں ہے۔ پھر ایک منفی رویہ سامنے آجاتا ہے کہ یہ آم بمبئی اور صورت سے آخر یہاں پہنچے کیسے۔ اس جملے میں آم کی طلب تو ہے لیکن رسد کا مسئلہ۔

غالب آم کی قسموں پر آتے ہیں اور وضاحت کرتے ہیں کہ دلی میں مالدے کا نام ہی پیوندی اور ولایتی بن گیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ آم اچھا ہوتا ہے لیکن جوش طلب میں پھر ایک جملہ ادا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں: ''کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا''۔ مقصد واضح ہے کہ دلی میں جو آم دستیاب ہے اس سے بہتر آم گجرات اور رمہاراشٹر کے علاقے میں ہیں۔ اگلے جملے میں اس طلب کو پھر پیچھے ڈالتے ہیں کہتے ہیں کہ سورت سے آم دلی بھیجے جائیں یہ محض تکلف ہے۔ یہ بھی کیا بات ہوئی کہ ایک روپیہ کا آم لیا گیا اور ڈاک خرچ چوگنا ہوگیا اور منفی باتیں غالب یہاں جوڑتے ہیں کہتے ہیں کہ سو میں سے دس بھی صحیح سلامت شاید ہی یہاں پہنچے۔ بقیہ خراب ہوجائیں گے یا اڑا لیے جائیں گے۔ غالب پھر ایک آخری سخت تر اور منفی جملہ ادا کرتے ہیں: ''میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہیں کرنا'' یعنی شاگرد کو کہہ رہے ہیں کہ آم تو مجھے اچھے لگتے ہیں، دلی کے مقابلے شاگرد کے علاقے کے آم اور بہتر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود استاد کا فرمان کہ آم بھیجنے کا کبھی بھی ارادہ نہ کرو۔

غالب دہلی میں ملنے والے آموں کی تعریف میں ایک جملہ ادا کرتے ہیں لیکن پھر انھیں یاد آتا ہے کہ نواب رامپور اکثر اپنے باغ کے آم تحفے میں بھیجتے رہتے ہیں۔

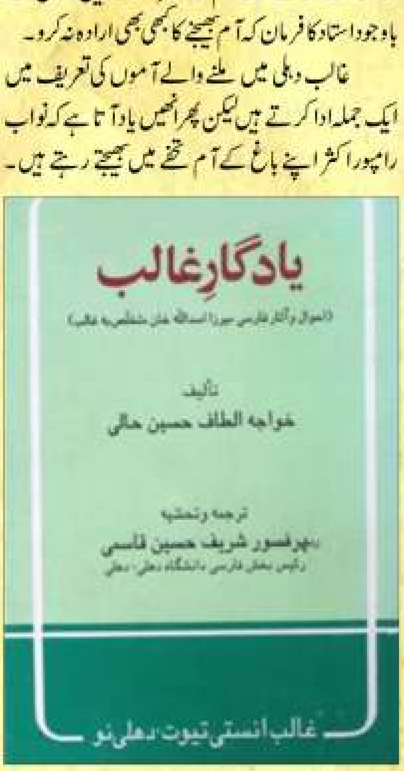

پھر بتاتے ہیں کہ آج ہی بریلی سے ایک دوست نے آموں کے دو ٹوکرے ارسال کیے۔ تفصیل آگے بھی دی جارہی ہے کہ ہر ٹوکرے میں سو سو آم تھے۔ داروغہ کی مدد سے وہ ٹوکرے غالب کے سامنے ہی کھولے گئے۔ دو سو میں محض 83 آم اچھے بقیہ سب سڑ گئے۔ جس طرح آموں کی گنتی کی گئی ہے غالب کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے۔ ایک دوسرے خط میں تحفے میں آئے ہوئے ٹوکروں کی گنتی کرنے کے بعد غالب نے ڈاک والوں پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے تین یا تیرہ آم چرا لیے۔ چونکہ وہ کل آم اچھے اور سڑے آم سب کا شمار کرتے ہیں۔

اس خط میں ایک جملے سے بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ غالب نے اپنے شاگرد سے آموں کی فرمائش کی ہے۔ اس کے برخلاف مختلف جملوں میں آم نہیں بھیجنے کی ہدایت اور اس کے اسباب رقم کیے گئے ہیں۔ لیکن جسے خط لکھا جارہا ہے اسے متن کی اس الٹ بانسی کا اندازہ ہے۔ غالب لفظوں میں جس سے انکار کررہے ہیں اصل میں شدومد کے ساتھ اسی بات کی فرمائش کررہے ہیں۔ شاعری میں 'حسن طلب' ایک صنعت ہے اور شعرا خاص طور پر عشق و عاشقی کے مرحلے میں اس سے خوب خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن نثر کا اتنا بڑا ٹکڑا مکمل طور پر حسن طلب کی مثال بن جائے، یہ کم دیکھا گیا ہے۔ غالب نے نثر میں اس ہنر سے اثر آفرینی کے دفتر سجا دیے ہیں۔ خطوط غالب اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ ادبی حسن پذیری کے ہزار نمونوں کی وجہ سے بھی لازوال تسلیم کیے گئے۔

'خطوط غالب' غالب کی اپنی زندگی اور ان کے زمانے کی داستان ہیں۔ ذاتی واردات کے بیان اور سرراہ لکھے گئے یہ خطوط اردو کی ادبی تاریخ کا وہ روشن باب ہیں جن کے بغیر اردو کی جدید نثر اپنی موجودہ شکل تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔ غالب نے ذاتی واقعات کو ایسی توجہ اور انہماک کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اسے اپنے آپ ایک عصری تناظر مل گیا ہے۔ دراصل اپنی ذاتی محرومیوں اور مصائب کو غالب نے اپنے عہد کی بدلتی صورتوں کے ساتھ کچھ اس طرح جوڑ دیا ہے کہ اب یہ پتا کرنا ایک ناممکن سی بات ہے کہ کب ذاتی زوال زمانے کے زوال سے مل گیا اور کب الگ ہے۔

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا، سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلم دان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں؟ پانچ چار دن سے فرصت ہے، مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک کام کی صورت نظر آئی۔ کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں''۔ (ایضاً)

یہ اقتباس برسات کے موسم میں غالب کے مکان کی صورت حال پر روشنی ڈالتا ہے۔ خطوط میں بظاہر کم اہم واقعات کا ذکر بھی غالب اکثر تفصیل سے کرتے ہیں۔ ٹوٹتے مکان، قرض خواری، شراب نوشی، جیسے معاملات پر غالب کا تفصیل سے بار بار لکھنا بعض بڑے مقاصد بھی رکھتا ہے۔ خط میں غالب کو محض کسی قدر بتانا ہے کہ برسات میں خستہ مکان میں رہنا ایک وبال ہے، لیکن حالات کی تصویر کشی اور اپنے آپ کو ظرافت کا نشانہ بنانا

غالب کے ایسے اوصاف ہیں، جن کو نظر میں رکھے بغیر اس خط کی ادبی خوبیوں کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔

غالب کے خطوط میں انسانی نفسیات کی گہری شناسائی کے اشارے ہیں۔ ماجرا اس قدر ہے کہ یوسف مرزا کے والد کی موت پر غالب کو تعزیت کرنی ہے تعزیت نامے اکثر درد و غم کے اظہار سے بھرے ہوتے ہیں اور ان میں اچھا خاصا تکلفانہ ماحول ہوتا ہے، لیکن اپنے زمانے کے عظیم شاعر اور نثر نگار اسد اللہ خاں غالب بھی اسی طرح سے تعزیت ارسال کریں تو کیا لطف ہوگا۔ موت کے تعلق سے غالب نے اپنی شاعری اور خطوط میں بار بار بے حد درد آمیز اشارے کیے ہیں۔ اکثر بہت اطمینان کے ساتھ وہ اپنی موت کا انتظار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

''کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر کرو؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا، مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کسی کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو''۔ (ایضاً)

غالب کے لیے مکتوب نویسی آخر زندگی کا سہارا کیوں بنی؟ تاریخ میں بہت کم مثالیں ہوں گی، جب کسی نے لوگوں کی خیریت طلبی کو نزدیک کا اتنا بڑا سرمایہ تصور کیا ہو۔ مرزا ہرگوپال غالب کے ایسے دوست ہیں، جنھیں وہ اپنی پونجی سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے مکتوب میں دہلی اور اس کے مضافات میں غالب نے اپنے تین دوستوں کی نشاندہی کی ہے، ان میں مرزا ہرگوپال بھی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے وہاں انھیں لفظ 'مسلمان' سے یاد کیا ہے یعنی مسلم ایمان رکھنے والا۔ اب جس سے ایسی محبت ہو اس کا خط نہ آئے، یہ کیسی بلا ہے؟ غالب اپنے دوست کو مختلف طریقے سے خط بھیجنے کی ذمہ داری کا واسطہ دیتے ہیں۔

غالب کے بعض ناقدین حیرت میں مبتلا رہتے ہیں کہ آخری زمانہ میں دو دہائیوں سے کم ہی وقت غالب کو اردو مکتوب نویسی کے لیے ملا۔ اس میں بھی پنشن کا مقدمہ، غدر کی تباہی، غالب کی معاشی تنگ دستی اور بڑھاپے کی طرح طرح کی بیماریاں اسی دور سے متعلق ہیں۔ اس کے باوجود غالب نے اس قدر بڑی تعداد میں کس طرح خط لکھ لیے؟

غالب بتاتے ہیں کہ انھیں دو چار خط روزانہ ضرور مل جاتے ہیں۔ اسے وہ خدا کا احسان مانتے ہیں۔ مزید تفصیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ڈاک کا ہرکارہ بھی دن میں دو دو بار آتا ہے اور ہر بار غالب کے نام چند نوشتے ضرور ہوتے ہیں۔ غالب کا کہنا ہے کہ ان خطوط سے ان کی دل لگی ہو جاتی ہے۔ ایک اور تفصیل وہ پیش کرتے ہیں: ''دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے''۔ ان تفصیلات سے قبل غالب کا وہ مشہور جملہ آ چکا ہے۔ جسے لوگ ان کی شعر کی طرح یاد رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں۔''

غالب کے خطوط میں انسانی نفسیات کی گہری شناسائی کے اشارے ہیں۔ ماجرا اس قدر ہے کہ یوسف مرزا کے والد کی موت پر غالب کو تعزیت کرنی ہے تعزیت نامے اکثر درد و غم کے اظہار سے بھرے ہوتے ہیں اور ان میں اچھا خاصا تکلفانہ ماحول ہوتا ہے، لیکن اپنے زمانے کے عظیم شاعر اور نثر نگار اسد اللہ خاں غالب بھی اسی طرح سے تعزیت ارسال کریں تو کیا لطف ہوگا۔ موت کے تعلق سے غالب نے اپنی شاعری اور خطوط میں بار بار بے حد درد آمیز اشارے کیے ہیں۔ اکثر بہت اطمینان کے ساتھ وہ اپنی موت کا انتظار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایام غدر نہ صرف غالب دلی کی پوری آبادی کے لیے سیاہی پھیلا گئے تھے۔ اسی اندھیرے اور مایوسی کے دور میں غالب نے سب سے زیادہ اپنے اردو خطوط لکھے۔ سبھی لوگ اپنے گھروں میں مقید ہو گئے تھے یا دوسرے مقامات میں محفوظ گھروں کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ غالب اندر سے بھی بہت پہلے سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس لیے اپنے جینے کا ایک نیا ڈھنگ انھوں نے مکتوب نویسی کو بنایا۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اسے ایک باضابطہ کام تصور کر رکھا ہے کوئی کہہ سکتا ہے کہ غالب کے پاس مکتوب نویسی کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں۔ منظر یہ ابھرتا ہے کہ غالب خطوط کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک خط آیا اور انھوں نے فوراً اس کا جواب لکھا۔ پھر دوسری بار ڈاک کے ہرکارے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اب پھر ایک خط آئے اور وہ اس کا جواب لکھیں۔

مکتوب نویسی کی ایسی مشغولیت شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔ دنیا کا کون ایسا آدمی ہوگا جس کے اوپر چند مکاتیب کا قرض نہیں رہ گیا ہو؟ غالب روپے پیسے کے قرض دار بھلے ہوں لیکن کوئی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان پر خط کا جواب واجب الادا ہے۔ غالب دوسروں سے بھی اپنی جیسی مستعدی تو نہیں لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہفتہ عشرہ میں ان کے شاگرد اور عزیز ان اپنی خیریت انھیں روانہ کرتے رہیں۔ اسی وجہ سے کسی کے خط کے آنے میں ذرا دیر ہو جائے اور ہفتہ دس روز گزر جائے تو غالب کی بے چینی دیکھنے بنتی ہے۔

مختصراً خطوط غالب میں ایک نہیں نثر کے کئی روپ نظر آتے ہیں اور ہر ایک ایسا جاذب نظر ہے کہ بار بار پڑھیے اور لطف لیجیے۔ کہیں سادہ سہل اسلوب اختیار کرتے ہیں، کہیں رنگینی و رعنائی سے بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں، کسی خط میں مقفی عبارت نظر آتی ہے، کہیں خالص علمی نثر ہے، کہیں استدلالی انداز اپنایا گیا ہے، کہیں افسانے کا رنگ ہے تو کہیں ڈرامے کا۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید اردو نثر کی تشکیل میں نام غالب کا ہے۔ اردو زبان کو فروغ دینے کے علاوہ خطوط غالب کا یہ کارنامہ ایسا ہے کہ ایک شہرۂ آفاق شاعر کی رنگا رنگ شخصیت ان صفات میں سمٹ آئی۔ سچ کہا گیا ہے کہ شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ اس سے فرار ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شعر شاعر کے چہرے پر نقاب ڈال دیتا ہے، اسے اٹھاتا نہیں لیکن خط اس نقاب کو ہٹانے میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ اگر خطوط غالب نہ ہوتے تو غالب کی پر پیچ، پہلو دار اور دلچسپ شخصیت اس طرح ظاہر نہ ہو پاتی۔ ان خطوط کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ ان میں غالب کے عہد کی دم توڑتی ہوئی تہذیب، اس تہذیب کے ڈھیر سے جنم لیتی ہوئی ایک نئی دنیا اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطوط ہمارے لیے انبساط کا سرمایہ بھی ہیں اور معلومات کا خزانہ بھی۔ اسی لیے غالب کو نئی اردو نثر کا بانی سمجھا جاتا ہے کہ غالب نے نثر کو نئی سمتوں اور جہتوں سے روشناس کرایا، جس سلسلے میں خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے۔

''مرزا غالب نے اردو شاعری ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں دیا، جدید اردو نثر کی بنیاد بھی اپنے بابرکت ہاتھوں سے قائم کی'' (یاد بود غالب)

کتابیات:

1۔ یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی
2۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری
3۔ غالب کے خطوط (جلد اول)، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم
4۔ غالب اور انقلاب ستاون ڈاکٹر معین الرحمان۔
5۔ یاد بود غالب، خواجہ احمد فاروقی۔

■

Dr. Shabnam Asad
Lane-2, House No 23,
Zakura Crossing, Hazrat Bal
Srinagar-190006 (J&K)

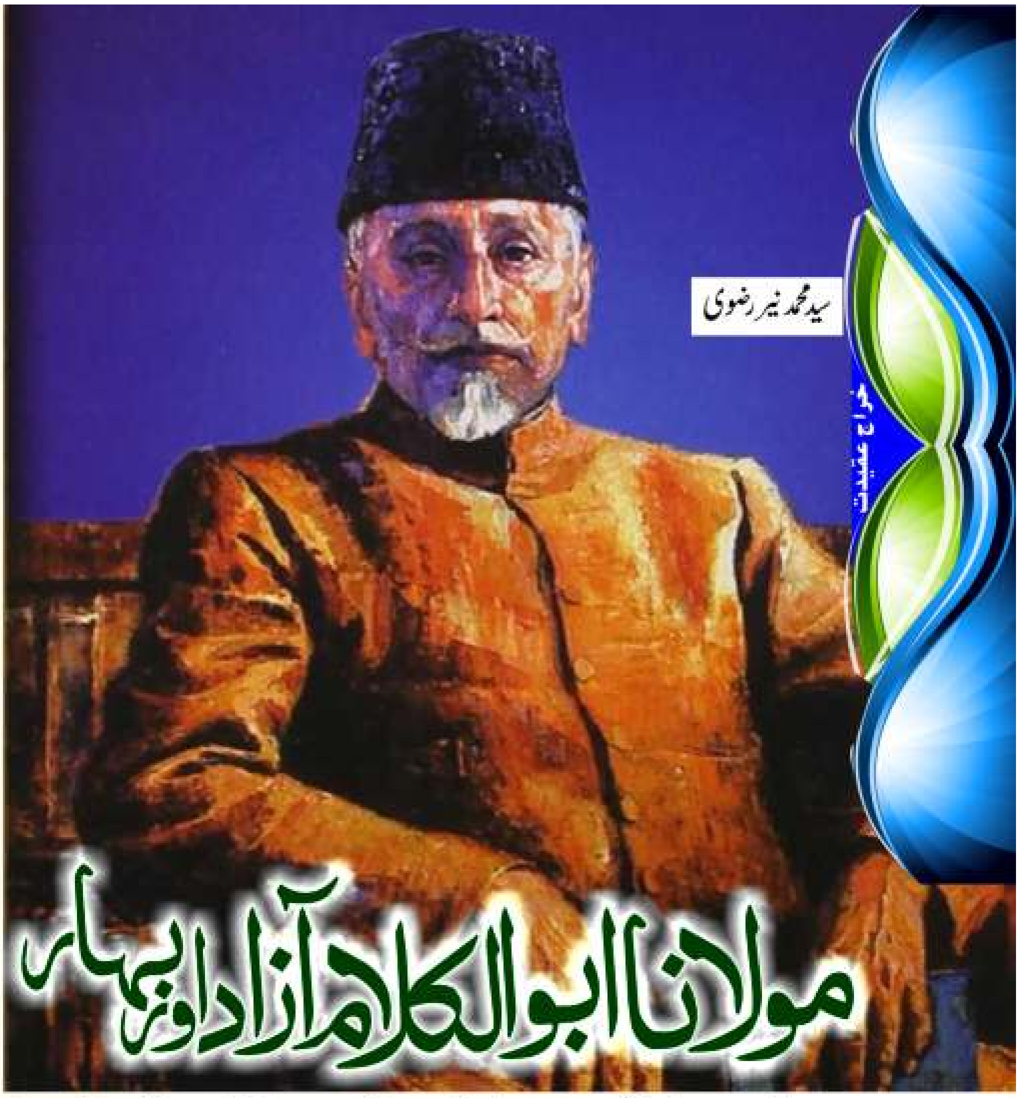

مولانا ابوالکلام آزاد اور بہار

سید محمد نیر رضوی

قومی اور بین الاقوامی سطح پر مولانا ابوالکلام آزاد کی قابل احترام شخصیت، ان کی ایمان افروز تقریریں، دلنشیں مواعظ اور اثر انگیز خطبات سے کون ہے جو واقف نہیں! سبھی واقف ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا طویل حصہ کولکتا اور دہلی میں گذرا اور اس سے کم حصہ جہاں گذرا، وہ اہم مقامات ہیں مکہ معظمہ اور غیر منقسم بہار کا شہر رانچی۔ عظیم مجاہد آزادی اور ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ایک وضعدار اور دیانت دار مرد مومن کی شان رکھتی ہے۔ آپ کا زمانہ سیاسی، ادبی اور علمی لحاظ سے بڑا تاریخ ساز زمانہ رہا ہے۔ آپ کے معاصرین میں ایک طرف مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل جیسی عظیم سیاسی شخصیتیں موجود تھیں تو دوسری جانب معاصر علما وفضلا میں فیاض المسلمین حضرت سید شاہ بدرالدین قادری پھلواروئیؒ، مولانا سید شاہ سلیمان قادریؒ، خواجہ حسن نظامی دہلویؒ، علامہ ابوالحسن خوشدل سہرامیؒ، حضرت احمد رضا خاںؒ اور حضرت مولانا جان خاں صاحب نقشبندی ابوالعلائی جیسی عظیم مذہبی، علمی اور ادبی شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد شہر مقدس مکہ معظمہ میں 11 نومبر 1888 کو اس دنیا میں تشریف لائے۔ ان کا نام 'محی الدین احمد' رکھا گیا اور تاریخی نام 'فیروز بخت' تجویز کیا گیا۔ علوم دینیہ میں ماہر ہونے کے سبب 'مولانا' کہلائے جب زور خطابت اور طلاقت بڑھا تو 'ابوالکلام' کہلائے اور شاعری میں 'آزاد' تخلص کرتے تھے۔ اس طرح حضرت محی الدین احمد 'مولانا ابوالکلام آزاد' کے اسم مبارک سے موسوم ہوئے اور اسی نام سے اپنی علمی، ادبی اور ملی وقومی خدمات کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مولانا خیر الدین تھا۔ مولانا کے آباد اجداد مغلیہ دور میں ہندوستان آئے تھے۔ مولانا کے دادا مولانا ہادی کا انتقال محض پچیس سال کی عمر میں ہوگیا۔ چنانچہ مولانا کے والد مولانا خیر الدین کی پرورش اُن کے نانا مولانا منور الدین نے کی۔ مولانا منور الدین کا زمانہ مغلیہ دور کے انحطاط اور برطانوی سامراجیت کے استحکام کا زمانہ تھا۔ ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ مولانا منور الدین نے اپنے نواسہ کے ساتھ ہندوستان چھوڑ کر مکہ معظمہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ بھوپال کے راستے جب ممبئی پہنچے تو مولانا منور الدین کا انتقال ہوگیا۔ مگر نواسہ مولانا خیر الدین نے سفر جاری رکھا اور مکہ پہنچ گئے۔ مولانا خیر الدینؒ نے یہاں اس قدر اعلیٰ تعلیم حاصل کی کہ حرم شریف میں واعظ مقرر ہوئے۔ یہ اعزاز کسی ہندوستانی عالم کے لیے پہلا اعزاز تھا۔ مدینہ منورہ کے مشہور مفتی شیخ احمد ظاہر وتری، مولانا خیر الدینؒ کی لیاقت سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بھانجی عالیہ بیگم کی شادی مولانا خیر الدین کے ساتھ کردی۔ اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان میں عظیم ہندوستان اور مقدس عرب کے ذی وقار خاندانوں کی شاخیں جمع ہو گئی تھیں۔ مولانا خیر الدینؒ نے 1898 میں مکہ کو خیرباد کہا اور اپنے وطن ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی غرض سے کولکتا آ گئے۔ یہیں کولکتا میں مولانا آزاد کا بچپن گذرا۔ مولانا ابوالکلام آزاد پانچ بھائی بہن تھے (دو بھائی اور تین بہنیں)۔ مولانا کی سب سے بڑی بہن کا نام زینب تھا جو صغر سنی میں وفات پا گئیں۔ دوسرے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین تھے۔ وہ شاعر تھے۔ 'آہ' تخلص تھا۔ حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ دوسری بہن کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ وہ بھی شاعرہ تھیں اور 'آرزو' تخلص کرتی تھیں جن کی شادی بھوپال میں ہوئی تھی۔ فاطمہ بیگم کی پانچ اولادیں تھیں۔ مولانا آزاد کی تیسری بہن کا نام حنیفہ بیگم تھا۔ وہ بھی شاعرہ تھیں اور 'آبرو' تخلص کرتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، اپنے والد جید عالم دین مولانا خیر الدینؒ کے دوسرے بیٹے اور چوتھی اولاد تھے۔ اس طرح مولانا کا خانوادہ نہایت علمی وادبی، مہذب، اعلیٰ وارفع اور مذہبی خانوادہ تھا۔ مولانا آزاد کی بہتر پرورش و پرداخت اسی مہذب، عالمانہ، مذہبی اور شعروشاعری کے اعلیٰ وارفع ماحول میں ہوئی۔

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد ابھی محض گیارہ برس کے تھے کہ شاعری جیسے مشکل فن میں زور آزمائی شروع کردی۔ واقعہ یوں ہے کہ ان دنوں ان کے گھر میں سہسرام کی رہنے والی ایک خادمہ سینے پرونے کا کام کیا کرتی تھیں۔ ان کے بھائی عبدالواحد خان، سہسرامی تھے جو شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور کولکتا کے مشاعروں میں شریک ہونے اور اپنی بہن سے ملنے سہسرام سے کولکتا اکثر و بیشتر جایا کرتے تھے۔ یہاں یہ گیارہ سال کا کم عمر بچہ سہسرام کے شاعر عبدالواحد خان سے کافی گھل مل گیا اور ان کی محبتوں کی وجہ سے اس بچہ کے اندر شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور یہ ذوق بہت تیزی سے ترقی کرتا گیا۔ شاعر حضرت عبدالواحد خان ہی نے ان کا تخلص 'آزاد' رکھا۔ چنانچہ حضرت عبدالواحد خان ہی کی وجہ سے اس بچہ میں شاعری کا ذوق اس حد تک بڑھا کہ کم عمری میں ہی نہایت موزوں کلام کہنا شروع کردیا۔ کیا خوب دسترس حاصل کی کہ محض 13 سال کی عمر میں 1901 میں جب حکیم عبدالحمید فرخ کی ادارت میں ممبئی سے شایع ہونے والے رسالہ 'پنج بہادر' میں ایک گلدستہ بنام 'ارمغان فرخ' نکلا تو

پہلی مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرحی غزل اس میں شایع ہوئی۔ وہ غزل ملاحظہ کیجیے۔

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

اور اس غزل کا مقطع دیکھیے ! کیا خوب مقطع تھا:

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

اس غزل کو دیکھ کر مرزا غالب کے شاگرد عزیز نادر خان شوخی رامپوری کے حیرت و استعجاب کا ٹھکانہ نہ رہا۔ نادر خان شوخی رامپوری مقیم کولکتا کے اس حیرت و استعجاب کی تفصیلات تذکروں میں محفوظ ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے بڑا دلچسپ واقعہ خود ہی بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی، کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین بتلائی "یاد نہ ہو، شاد نہ ہو"

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد چاق ہونی چاہیے۔

میں نے ایک شعر اور کہہ دیا:

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی، یاد نہ ہو

کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔"

اس طرح شاعری کے بہتر ذوق کی جانب ذہنی اور طبعی میلان پیدا ہوا۔ پھر مولانا نے اپنی دو غزلیں شاعر امیر مینائی کو دکھلائیں۔ پھر کچھ غزلیں داغ دہلوی کو بھی روانہ کیں۔ مگر مطمئن نہیں ہوئے اور مولانا کی حقیقت شناس طبیعت ایک بار پھر بہار کے استادِ فن شاعر علامہ ظہیر احسن شوق نیموی کی جانب مائل ہوئی اور نظر انتخاب اس لیے پڑی کہ وہ علامہ شوق نیموی کی تصانیف 'ازاحة الاصلاح' اور 'سرمہ تحقیق' کا مطالعہ کر چکے تھے۔ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے شاعری کے اصول و ضوابط اور رمز و کنایات سے بھی واقف ہوگئے تھے۔ علامہ شوق نیموی بلند پایہ محدث بھی تھے۔ چنانچہ ابھرتا ہوا یہ شاعر ان سے بہت متاثر تھا۔ مولانا نے علامہ شوق نیموی سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ 1901 سے جاری یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب علامہ شوق نیموی کا انتقال نومبر 1904 میں ہوگیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی تصنیف 'آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی' میں جہاں مولانا آزاد کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے وہیں علامہ شوق نیموی سے مولانا آزاد کی اصلاح لینے کی تفصیلات بھی رقم کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شعر گوئی تو صغر سنی میں ترک کردی مگر شاعری کی بنیاد اس قدر مضبوط تھی اور اس قدر لگاؤ تھا کہ شاعری کا ذوق تاحیات قائم رہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو جب انگریزی پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ایک بار پھر ان کی نظر انتخاب صادق پور پٹنہ کے ساکن مولوی محمد یوسف جعفری پر پڑی۔ وہ بھی شاعر تھے اور 'رنجور' تخلص کرتے تھے۔ ان دنوں مولوی محمد یوسف جعفری بورڈ آف اکزامنیشن، کولکتا میں 'چیف مولوی' کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے والد کا نام مولانا یحییٰ علی صادق پوری ہے۔ مولوی محمد یوسف جعفری صاحب "الدُّر المنثور بموسوم تذکرۂ صادقہ" مولانا عبدالرحیم صادق پوری کے بھانجے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے محمد یوسف جعفری رنجور ہی کی استدعا پر "الدُّر المنثور بموسوم تذکرۂ صادقہ" پر تقریظ تحریر کی۔ مولانا کی یہ تقریظ، نثر نگاری میں ان کی ابتدائی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ثابت ہوئی۔ مولانا اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' میں فرماتے ہیں کہ:

"جب سرسید احمد خان کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا، تو جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات کا میرے اوپر بہت اثر ہوا، اور میں نے محسوس کیا کہ جب تک کوئی شخص جدید سائنس، فلسفہ اور ادب کا اچھا مطالعہ نہ کرے وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتا، میں نے طے کیا کہ میرے لیے انگریزی پڑھنا ضروری ہے۔ مولوی محمد یوسف جعفری سے میں نے اس کا تذکرہ کیا، وہ اس زمانے میں مشرقی علوم کے صدر ممتحن تھے، انھوں نے مجھے انگریزی کی ابجد سکھائی اور پیارے چند سرکار کی 'فرسٹ بک' پڑھائی اور جیسے ہی مجھے زبان کی شد بد ہوئی، میں نے انجیل پڑھنا شروع کر دیا۔"

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت، اعلیٰ علمی و ادبی ذوق و شوق کو نکھارنے، صلاحیتوں میں مزید اضافہ کرنے اور ملی و قومی خدمات کے جذبہ مقدس کو راغب بہ عمل ہونے میں جہاں یقیناً بہت سارے عوامل کارفرما تھے وہیں صوبہ بہار نے بھی اس ضمن میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ مولانا نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ انھوں نے اپنے والد سے اجازت لے کر لوگوں کو تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ دوران سبق تقریر کرنے لگے اور اس میں انھیں بڑا لطف آنے لگا۔ پھر کتابوں کا مطالعہ بھی کرنے لگے۔ ان کے بستر پر کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور دیر شب تک موم بتی کی روشنی میں اردو، فارسی، انگریزی اور عربی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس طرح مولانا کی علمیت اور لیاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ ڈسپلن اور کردار سازی تو گھر کے ماحول کا ایک لازمی اور فطری پہلو تھا۔ والدہ عربی النسل تھیں جنھوں نے ان کی اخلاقی تعلیمات، مذہبی تربیت اور عربی زبان و ادب کی درس و تدریس میں اہم کردار نبھایا۔ آپ کی والدہ مدینہ منورہ کے ایک نہایت ہی معزز اور قابل احترام گھرانے سے تھیں۔ وہ مشہور محدث شیخ احمد ظاہر وتری کی بھانجی تھیں جو مدینہ منورہ میں مفتی تھے۔ مولانا آزاد کے سلسلہ نسب میں نامور علمائے کرام اور قابل قدر بزرگان دین کی ایک لمبی فہرست کی تاریخ موجود ہے۔ آپ ہی کے سلسلہ نسب عالیہ میں ممتاز عالم و فاضل بزرگ شیخ جمال الدینؒ تھے جنھوں نے مغل بادشاہ اکبر کے زمانہ میں اُس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کی بدولت بادشاہ اکبر کو 'دین الٰہی' کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مولانا کی شادی محض بارہ برس میں چھ سال کی زلیخا بیگم سے ہوئی تھی جو بغداد شریف کے ایک شریف خاندان سے وابستہ حضرت آفتاب الدینؒ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت آفتاب الدین کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا کر ملتا ہے۔ حضرت آفتاب الدین، مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدینؒ کے مرید تھے جنھوں نے پیدا ہوتے ہی اس بچی کو اپنے پیر کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ پیر و مرشد نے اس حسین و جمیل بچی کا نام زلیخا رکھا اور بعد میں اپنے بیٹے مولانا ابوالکلام آزاد سے شادی کر دی۔ زلیخا بیگم نہایت وفا شعار بیوی ثابت ہوئیں۔ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھیں۔

زلیخا بیگم نے ہمیشہ ہر قدم پر مولانا کا ساتھ دیا۔ جب وہ علیل ہوئیں تو ڈاکٹروں کے مشورے پر غیر منقسم بہار کے ایک خوبصورت شہر رانچی آئیں اور یہیں صحت یاب ہوئیں۔ مولانا خود فرماتے ہیں:

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ 41ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گذرا تھا۔ مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلی آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام

سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آرہی تھی۔''

الغرض مولانا ابوالکلام آزاد کی بہتر پرورش و پرداخت اور موزوں ترین تعلیم و تربیت میں ان کے والدین کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام جیسے مولانا محمد یعقوب، مولانا محمد ابراہیم، مولانا محمد عمر، مولانا سعادت حسین اور مولانا محمد شاہ محدث نے اہم کردار نبھایا وہیں صوبہ بہار کے اساتذہ کرام نے بھی مولانا کی شخصیت سازی میں بڑا اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی حقیقی شخصیت اب نکھرنی شروع ہوگئی۔ مولانا نے جب پوری طرح ہوش سنبھالا تو اپنے ملک ہندوستان کو برطانوی سامراجیت کی زنجیروں میں مقید پایا اور دوسری طرف عامۃ الناس بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی صورت حال کو نہایت ابتر پایا۔ مولانا کی شخصیت سازی میں روز افزوں ترقی ہو رہی تھی۔ وہ اب قیادت کے لائق ہوگئے اور بہت جلد اپنی لیاقت و صلاحیت کی بناً پر صحافی، مقرر اور خطیب ہوگئے۔ مولانا نے اب شاعری ترک کر دی تھی لیکن اپنے نام کے ساتھ تخلص 'آزاد' کو برقرار رکھا جو ان کے نام کا ایک حصہ بن گیا۔ مولانا کے مضامین اس وقت کے معروف و مقبول اور معیاری رسالوں جیسے 'لاہور کے مخزن' اور 'کولکتا کے 'احسن الاخبار' میں مسلسل شائع ہونے لگے۔ انہوں نے 'المصباح' نامی ایک ہفتہ وار رسالہ بھی جاری کیا اور لکھنؤ سے نکلنے والے 'خدنگ نظر' ندوۃ العلما کے رسالہ 'الندوہ' امرتسر سے نکلنے والے 'وکیل' اور کولکتا سے نکلنے والے 'دارالسلطنت' کی ادارت بھی کی۔ شخصیت مزید نکھرتی گئی۔ صحافت کے ساتھ ساتھ مختلف فعال انجمنوں سے وابستگی اور مختلف منعقدہ جلسوں میں شرکت شروع ہوئی۔ مولانا نے خود ایک انجمن 'الاصلاح' قائم کی جس کے ذریعہ لوگوں میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنے، ان میں تحریر و تقریر کا شوق پیدا کرنے اور انہیں متحد ہونے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ مولانا روشن خیال اور روشن ضمیر تھے۔ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس طرح کے مدارس اسلامیہ کے قیام کے آرزومند تھے جہاں دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم دونوں کا نظم بہتر پایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ کے ایک گاؤں چنگری پوتا میں 'دارالارشاد' کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح مولانا کے اندر کم عمر میں ہی ہر لحاظ سے پختگی آگئی۔ 1908 میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ صدمہ تو بہت ہوا مگر والد کی تربیت میں آغاز کردہ مولانا کا سفر جاری رہا۔ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد نوعمر تھے۔ مگر نہایت ذہین تھے۔ قوم وملت کا درد، وطن کی آزادی کا جنون اور ان کی روشن خیالی نے انھیں کم عمری ہی میں ایک ایسا ذی صلاحیت صحافی بنا دیا تھا جو اہل نظر بھی تھا اور اہل خبر بھی تھا۔ انہوں نے بلند حوصلے اور استحکام کے ساتھ 20 نومبر 1903 کو کلکتہ سے اپنا پہلا ماہنامہ 'لسان الصدق' نکالا جو بہت جلد ہی مقبولیت کے مدارج طے کرنے لگا۔ لوگ مولانا کی منعکس ہوتی ذہنی کیفیات، تنقیدی شعور، پرکشش اسلوب اور صالح اور اصلاحی جذبات کی عکاسی کی وجہ سے اسے قابل قدر اور قابل اعتنا سمجھنے لگے۔ مولانا نے اس طرح خود کو نہ صرف ایک ذی صلاحیت اور تجربہ کار صحافی کے طور پر متعارف کرایا بلکہ اپنے اظہار خیال سے یہ احساس بھی دلا دیا کہ وہ قومی سطح پر ملک وملت کی رہنمائی کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور وطن کو آزادی دلانے کے جذبے سے پوری طرح سرشار ہیں۔ اس کا آخری شمارہ اپریل۔ مئی (مشترکہ) 1905 میں نکلا۔ چنانچہ یہ ماہنامہ محض ڈیڑھ سال تک جاری رہا اور اس مدت میں 'لسان الصدق' کے کل 13 نمبر ہی منظر عام پر آسکے۔ 'لسان الصدق' تو بند ہو گیا مگر مولانا کا سیاسی شعور پوری طرح بیدار کر گیا۔ مولانا اب برطانوی سامراج کے خاتمہ کے لیے جدوجہد آزادی کی سمت میں نمایاں طور پر عملی قدم بڑھا چکے تھے اور چاہتے تھے کہ عام عوام بالخصوص مسلمان بھی اب خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے 1912 میں اپنا نجی پریس قائم کیا تا کہ ملک کی خدمت اور عامۃ المسلمین کی اصلاح میں کامیاب ہوسکیں۔ چنانچہ دیگر مختلف عملی اقدامات کے ساتھ ساتھ انھوں نے پھر ایک بامقصد ہفت روزہ اخبار 'الہلال' نکالنا شروع کیا جس کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912 کو منظر عام پر آیا۔ یہ اخبار نہیں تھا بلکہ مولانا کی معنی خیز شعلہ بیانی تھی جو رفتہ رفتہ حق کی صدائے بازگشت بن گئی۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہفتہ بھر میں ہی گیارہ ہزار کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ اس وقت تک مولانا نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک اسلامیہ میں بھی مقبول ہو چکے تھے۔ چنانچہ اب جو یہ 'الہلال' نکلا تو عالم اسلام کا بھی نمائندہ اخبار بن کر نکلا۔ مولانا کی بصیرت و بصارت، روشن خیالی اور سیاسی و اصلاحی نظریہ کی ترویج و اشاعت اب بین الاقوامی سطح پر ہونے لگی۔ شام و فلسطین، عراق و ایران اور دیگر ممالک جیسے مصر اور ترک میں بھی 'الہلال' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہونے لگی۔ 'الہلال' نے جس طرح مسائل کی عکاسی شروع کی اس سے اس کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ معاشرے میں فطری تقاضوں کے تحت مخالفین نے بھی سر اٹھایا۔ مگر اشاعت حق کا فطری تقاضہ بھی یہی ہے کہ اختلافات جس قدر بڑھتے جاتے ہیں مقبولیت بھی اسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ مولانا کے ساتھ بھی یہی ہوا یہاں تک کہ 1913 کے پہلے چند مہینوں میں 'الہلال' کی اشاعت تقریباً بیس ہزار ہوگئی۔ ملک میں ہلچل مچ گئی اور حکومت برطانیہ تک اس کی صدائے بازگشت پہنچ گئی۔ برطانوی حکومت نے 'الہلال' کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزاد کی آواز کو دبانا چاہا مگر حکومت کو کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ مولانا آزاد نے اپنی علمی اور ادبی خدمات کو جاری رکھتے ہوئے صحافتی اور فلاحی اقدامات کو بھی جاری رکھا۔ انھوں نے سیاست میں مضبوطی کے ساتھ قدم رکھ دیا تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ وقت ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا تھا لہٰذا ان کی زندگی میں بھی مجاہدہ شروع ہوا اور مولانا بہت جلد قومی تحریک اور جدوجہد آزادی کے صف اول کے رہنما بن گئے۔ ہندوستان میں مسلط ظالم و جابر حکومت برطانیہ سے 'الہلال' کی مقبولیت برداشت نہ ہوسکی اور اس نے 'الہلال' کو بند کرنا چاہا۔ چنانچہ جب حکومت 'الہلال' کی آواز کو بند نہ کرسکی تو اس نے 'الہلال' پریس کو ہی بند کر دیا۔ حکومت نے ستمبر 1913 کو دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جسے فوراً ادا کر دیا گیا۔ اس فوری ادائیگی سے حکومت گھبرا گئی۔ مگر حکومت نے اس ضمانت کو بھی ضبط کر لیا اور مزید دس ہزار روپے کی ضمانت پھر طلب کر لی۔ اب مولانا نے حالات کا بخوبی اندازہ لگاتے ہوئے اسے بند ہی کر دینا مناسب سمجھا اور اس طرح 18 نومبر 1914 کو 'الہلال' کا آخری شمارہ منظر عام پر آیا۔ مولانا نے سال بھر کے وقفے کے بعد 12 نومبر 1915 کو 'البلاغ' جاری کیا۔ 1914 میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی اور برطانیہ اس جنگ میں شامل تھا۔ وہ اپنی فتح کے لیے ہر قسم کی مزاحمتوں کو دور کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ 'البلاغ' کا اجرا ہوئے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ یہ اخبار بھی برطانوی حکومت کے جبر و استبداد کا شکار ہوگیا اور صرف ساڑھے چار مہینے کے بعد یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔ اس کا آخری شمارہ جو 17، 24 اور 31 مارچ 1916 پر مشتمل تھا اپنی اشاعت کے بعد بند ہوگیا۔ مولانا کو بھی 28 مارچ 1916 کو قانون تحفظ ہند کے تحت محض چار دن کے اندر کولکتا چھوڑ دینے کا حکم ہوگیا۔ مولانا کو کولکتا چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ کولکتا چھوڑ کر کہیں بھی جا سکتے تھے مگر ان کی نظر انتخاب امن کے علمبردار گوتم بدھ، مہاویر، مخدوم جہاںؒ اور پیر مجیبؒ کی سرزمین صوبہ بہار پر پڑی۔ مولانا نے کولکتا چھوڑ دیا اور اپنے زمانہ کے غیر منقسم بہار میں واقع ضلع رانچی (فی الوقت جھارکھنڈ کی راجدھانی) میں نظر بند ہونا پسند کیا۔ مولانا نے کولکتا چھوڑنے سے قبل 'البلاغ' کی اگلی اشاعت کا انتظام کر دیا تھا۔ اس وقت تک 'الہلال' اور 'البلاغ' کی خدمات کے علاوہ جو اہم کام مولانا کے

توسط سے منظم طور پر انجام پا چکا تھا اور ثمر آور بن چکا تھا ان میں "مدرسہ دارالارشاد میں باضابطہ تعلیم و تعلم اور تربیت اصحاب استعداد کا کام" "قرآن شریف کے ترجمے کا کام" اور "شاہ ولی اللہ مرحوم کی سوانح حیات مکمل کرنے کا کام" وغیرہ کارہائے گراں قدر قابل ذکر ہیں۔ رانچی میں نظر بند ہوتے ہی یہ تمام سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں۔ قوم کی سرد مہری کا بھی یہ عالم تھا کہ مولانا کی کولکتا سے روانگی کے بعد وہاں کی تمام تر علمی، سیاسی، مذہبی، سماجی اور فلاحی سرگرمیاں بھی ماند پڑنے لگیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا رانچی میں قیام اپریل 1916 سے دسمبر 1919 تک رہا۔ اس دوران اقدار عالیہ کے پرستار، حب وطن میں جاں نثار اور مسلک انسانیت کے پیروکار مولانا ابوالکلام آزاد نے مصلحتاً سرگرم سیاست سے براہ راست کنارہ کشی اختیار کر لی مگر علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ فلاحی خدمات انجام دیتے رہے۔ فیاض المسلمین حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین قادریؒ پھلواروی کے مرید و خلیفہ اور عظیم ادبی شخصیت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ نے مولانا کی قلمی تصویر یوں پیش کی ہے:

"سرو قد، دوہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سفید چھوٹی داڑھی، آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی و ظرافت۔ دہلی کے رہنے والے ہیں، ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں، مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں! قوم سید، پیشہ آزادی اور بے نیازی، حافظے کی قوت بے مثال تصور کی طاقت، چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی۔ تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ، نازک مزاجی میں تانا شاہ، سیاست دانی میں ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے!! بیرون ہند کے مسلمانوں میں اور امریکیوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں!

یوروپین مورخ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو یوروپین کیوں کر ثابت کیا جائے....!!"

اس طرح جب مولانا ابوالکلام آزاد کی ظاہری اور باطنی شبیہ اُبھر کر اور نکھر کر سامنے آ چکی تو بہار میں واقع ضلع رانچی میں نظر بند کر دیے گئے۔ مولانا نے 8 اپریل 1916 کو بہار کے نامور جید عالم دین اور خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، بہار میں تربیت یافتہ اور جید عالم دین سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں رانچی آمد کا تذکرہ یوں کیا ہے:

"میں سر دست رانچی آ گیا ہوں۔ البلاغ جاری رہے گا۔ آپ اور تو کچھ نہیں کر سکتے کم سے کم اتنا کیجیے کہ ہر دو ہفتہ میں ایک مضمون بقدر آٹھ کالم کے بھیج دیا کیجیے..."

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو سید سلیمان ندوی کی شخصیت اور ان کی علمی صلاحیت پر بڑا اعتماد تھا۔ مولانا کو نظر بندی کے دوران سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا مگر اس مرد شجاع کا عزم مقدس کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ مولانا خود اپنی تصنیف 'تذکرہ' میں فرماتے ہیں:

"دنیا نے فراغ و آزادی کے زمانوں کے کاموں کا کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے بہتر ہے کہ جلاوطنی و نظر بندی کے بند و قید میں کام کرنے کا بھی ایک نمونہ دکھلایا جائے کہ اصل آزمائش گاہ عمل یہی ہے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کو اب تک بہار نے بہت کچھ دیا۔ اب مولانا کی باری تھی۔ لہٰذا مولانا نے اس بار ایسا فیض دیا کہ تمام مورخین نے ان کے قیام رانچی اور ان کی نظر بندی کے دور کو تاریخ میں سنہرے حروف سے پر رقم کر دیا ہے۔ مولانا 'تذکرہ' میں فرماتے ہیں:

"جس مقام پر مقیم ہوں، شہر یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ رمضان المبارک میں جمعہ کے دن، جامع مسجد گیا، چند صفوں سے زیادہ مجمع نہ تھا۔ لوگوں نے خطبہ و امامت کے لیے سخت اصرار کیا۔ مجبوراً خطبہ دینا پڑا، ان بیچاروں نے اب تک خطبہ کے یہی معنی سمجھا تھا کہ عربی کی کوئی چھپی ہوئی کتاب پڑھ دی جائے، یہاں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ اچھی خاصی ہے، مگر ایک گمنام گوشے میں پڑ جانے کی وجہ سے حد درجہ تباہی و بدحالی میں مبتلا ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے رانچی قیام کے دوران زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف کی تحریر اور مقامی خدمات انجام دینے میں صرف کیا۔ انھوں نے 'تذکرہ'، 'ترجمان القرآن' اور 'جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم مساجد' بالترتیب تحریر کی اور ترتیب دی۔ مولانا نے یہاں فلاح و بہبود کا دوسرا سب سے بڑا متبرک کام یہ کیا کہ رانچی میں انجمن اسلامیہ اور مدرسہ اسلامیہ کی تشکیل کی۔ اس طرح قیام رانچی کے دوران کی گئی مولانا ابوالکلام آزاد کی مقدس کاوشوں سے نہ صرف رانچی، بہار اور ہندوستان بلکہ عالم اسلام کو فائدہ پہنچا۔

تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ کتاب ان کے سوانحی واقعات اور ان کے اجداد کی خدمات پر مشتمل ایک نہایت مستند، معیاری اور شاہکار تصنیف ہے جسے مولانا نے اپنے قیام رانچی کے دوران مرتب کی تھی۔ مولانا نے یہ تصنیف مولوی فضل الدین مرزا کے اصرار پر تحریر کی جو ان کے دوست بھی تھے اور عقیدت مند بھی۔ مولانا نے اس کتاب کا آغاز مغل بادشاہ اکبر کے عہد کے ایک ممتاز عالم شریعت اور قابل احترام صاحب طریقت حضرت شیخ جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی کے احوال سے کیا ہے جو ان کے پردادا حضرت شاہ محمد افضل کی ننیہال میں

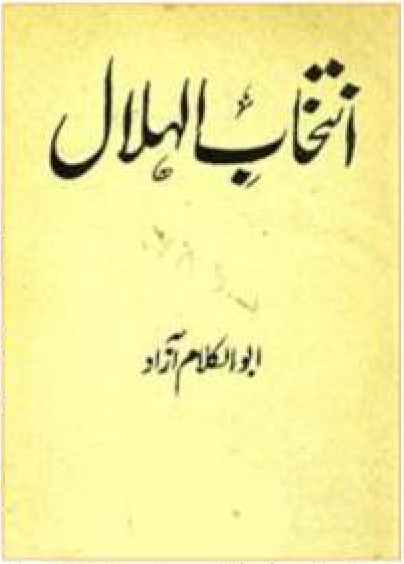

ایک بلند پایہ بزرگ گذرے ہیں۔ مولانا نے پوری کتاب کے لیے اسی احوال مقدس کو سانچہ بنا ڈالا اور اس کتاب میں حق صداقت کے جس سانچہ کو پیمانہ بنا کر مولانا نے مختلف علما اور مشائخین کے احوال مرتب کیے ہیں ان میں صوبہ بہار سے شیخ علائی اور مخدوم الملکؒ کا بھی تذکرہ بطور خاص رقم کیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ رانچی میں مولانا کی آمد اور یہاں کے احوال و آثار پر مشتمل ہے۔

ترجمان القرآن: مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی میں نظر بندی سے قبل ترجمان القرآن کے آٹھ پاروں کی تفسیر لکھ چکے تھے اور تفسیر کا کام سورۃ النساء تک ہو چکا تھا مگر ظالم حکومت نے جب کولکتا اور رانچی میں ان کی رہائش گاہوں کی تلاشی لی تو بہت سارے کاغذات، مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ساتھ تفسیر و ترجمہ کے ان آٹھ پاروں کو بھی ضبط کر لیا۔ مولانا نے ہمت نہیں ہاری اور دوبارہ نویں پارہ سے ترجمہ کا کام شروع کیا اور رانچی قیام کے دوران ہی 1918 میں اسے مکمل کیا۔ افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ مکمل ترجمان القرآن موجود نہیں ہے۔ حالانکہ محققین کی رائے ہے کہ مولانا نے قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کو مکمل کیا ہے۔ مولانا کی زندگی میں ترجمان القرآن کی دو جلدیں شائع ہوئیں۔ پہلی جلد، سورۃ فاتحہ کی تفصیلی تفسیر کے ساتھ قرآن شریف کی چھٹی سورۃ کا ترجمہ تک اور دوسری جلد، سورۃ المومنون کے ترجمہ تک۔ ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۃ فاتحہ کو قرآن کا دیباچہ قرار دیا اور 'ترجمان القرآن' اس اجنبی شخص کے نام معنون کر دیا جو مولانا سے قرآن سمجھنے کے لیے سرحد پار سے رانچی آیا تھا اور جس سے مولانا واقف بھی نہیں تھے۔ ترجمان القرآن کے انتساب کا متن اس طرح ہے:

"غالباً دسمبر 1918 کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو

ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا:

آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں۔

کہاں سے؟

سرحد پار سے۔

یہاں کب پہنچے؟

آج شام کو پہنچا، میں بہت غریب آدمی ہوں۔

قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے، انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔

افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟

اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا اک اک حرف پڑھا ہے۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور یکا یک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپے دوں گا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اسی کے نام سے منسوب کرتا۔''

12 ستمبر 1931 ابوالکلام

کلکتہ

جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد:

مولانا ابوالکلام آزاد کسی فرقہ سے وابستہ نہیں تھے وہ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی تقریر کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دلائل و براہین کی راشنی میں جوشیلی ضرور ہوتی تھی مگر اشتعال انگیز نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا جب رانچی میں نظر بند تھے اس وقت انھیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے سوامی شردھانند کو جامع مسجد دہلی میں داخل ہونے اور تقریر کرنے پر اعتراض کیا ہے تو انھیں سخت رنج پہنچا اور انہوں نے سد باب کے طور پر دلائل اور براہین کی روشنی میں ایک نہایت عالمانہ اور بصیرت افروز مضمون تحریر کیا جو مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوتا رہا جسے سید سلیمان ندوی متوطن ضلع نالندہ نے جمع کیا اور "جامع الشواهد فی دخول غیر مسلم فی المساجد" نام دے کر رسالے کی شکل میں شائع کرا دیا۔

انجمن اسلامیہ کی تشکیل اور مدرسہ اسلامیہ کا قیام:

مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی میں اپنی نظر بندی کے دوران نہایت شدت سے محسوس کیا کہ یہاں مسلمان تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے نہایت پسماندہ ہیں جس کی

مولانا ابوالکلام آزاد کسی فرقه سے وابسته نہیں تھے وہ ہمیشه ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی تقریر کی خصوصیت یه تھی که وہ دلائل و براہین کی راشنی میں جوشیلی ضرور ہوتی تھی مگر اشتعال انگیز نہیں ہوتی تھی۔ چنانچه مولانا جب رانچی میں نظر بند تھے اس وقت انہیں معلوم ہوا که مسلمانوں کے ایک طبقه نے سوامی شردھا نند کو جامع مسجد دھلی میں داخل ہو نے اور تقریر کرنے پر اعتراض کیا ہے تو انہیں سخت رنج پہنچا اور انہوں نے سد باب کے طور پر دلائل اور براہین کی روشنی میں ایک نہایت عالمانه اور بصیرت افروز مضمون تحریر کیا جو مختلف اخبارو رسائل میں شائع ہوتا رہاجسے سید سلیمان ندوي متوطن ضلع نالنده نے جمع کیا اور "جامع الشواهد فی دخول غیر مسلم فی المساجد" نام دے کررسالے کی شکل میں شائع کرا دیا۔

وجہ سے جہالت اور غیر اسلامی رسم و رواج کا زبردست شکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے صحیح العقیدہ دینی شعور بیدار کرنے کی غرض سے فلاحی اور اصلاحی اقدامات کے طور پر ایک انجمن قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ کی تحریک پر 15 اگست 1917 کو انجمن اسلامیہ، رانچی کا قیام عمل میں آیا اور اس سعی خاص میں مولانا نے البلاغ پریس کی ساری رقم خرچ کردی۔ پہلی ستمبر 1917 کو اس مولانا کی سرپرستی اور مولوی عبدالکریم کی صدارت میں انجمن کی پہلی نشست منعقد ہوئی جس میں انجمن کے زیر اہتمام رانچی میں ایک مثالی مدرسہ، مدرسہ اسلامیہ قائم کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ 24 فروری 1918 کو مدرسہ کی باضابطہ سنگ بنیاد رکھی گئی۔ اس موقع پر عظیم الشان جلسہ کا اہتمام بھی کیا گیا جس کی صدارت مہاراجا بہادر یعنی راتو مہاراج نے کی۔ مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی اس قدر مقبولیت تھی کہ اس جلسے میں دس ہزار سے زائد کا مجمع موجود تھا۔ یہ جلسہ! یہ مجمع ہندو مسلم اتحاد کا ایک حسین منظر تھا۔ لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سننے کو بے تاب تھے۔ مولانا سب سے اخیر میں کھڑے ہوئے اور نہایت پرجوش انداز میں اس مجمع کو خطاب کیا جس کی گونج یہاں مدتوں سنائی دی۔ محی الدین احمد اس مدرسہ کے پہلے طالب علم تھے اور مولوی محمد ذکریا متوطن بھاگلپور، اس مدرسہ کے پہلے پرنسپل تھے جو مولانا کے بہت عزیز تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے 24 خطوط مولوی محمد ذکریا کے نام موجود ہیں۔ ان میں 19 خطوط ملفوف روانہ کئے گئے ہیں جبکہ 5 پوسٹ کارڈ پر بھیجے گئے ہیں۔ مولانا شہباز بھاگلپوری کے نام سے بھی مولانا کے خطوط موجود ہیں۔

انجمن اسلامیہ کا دوسرا عظیم الشان جلسہ 24 اکتوبر سے 26 اکتوبر 1919 تک منعقد ہوا جس میں سید سلیمان ندوی، شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سجاد حسن اور جناب یونس بیرسٹر جیسی دیگر ذی وقار ہستیوں نے جلسہ کو وقار بخشا تو مقامی سطح پر بھی یہاں کی عظیم شخصیتوں نے بھی شرکت کی۔ مولانا نے اس جلسہ کی عظیم الشان کامیابی کا سہرا بالعموم رانچی کے عوام اور بالخصوص رانچی کے ہندو بھائیوں کے سر باندھا۔ مولانا نے اس عظیم الشان جلسہ کی تیاری کے سلسلہ میں جو خط مولوی محمد ذکریا کو لکھا ہے اس کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اس جلسہ کے انعقاد کے تئیں کس قدر سنجیدہ اور کوشاں تھے۔ اس خط سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صوبہ بہار کے تمام خطوں اور تمام معتبر شخصیتوں سے بھی واقف تھے۔ اس خط کا متن دیکھیے:

''(1) جلسہ کے خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر، رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔

(2) بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کا نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر بالمشافہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلسہ اور اس بات پر ضرور زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے.... پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرادیے جائیں۔

(3) اس کے بعد فوراً بانکی پور جایئے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹر ایٹ لا سے ملیے... بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات بہار کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے۔

(4) وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جاسکتے ہیں، نیز مظفرپور اور مونگیر وغیرہ.... مظفرپور میں ریاض الحسن صاحب رئیس شہر ہیں ان سے مدد ملے گی۔

(5) ہر مقام پر گروہ علما و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علما پر ظاہر کرنی چاہیے.... اس جلسہ میں صوبہ بہار کے وعاظ و مقررین کی خاصہ ضرورت ہے، یہ جلسہ تین دن تک ہوگا.....''

ایک اور خط دیکھیے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی محمد ذکریا کو کس قدر عزیز رکھتے تھے:

''باسمہ تعالی

عزیزی وصدیقی! السلام علیکم

آپ کے لیے ایک صورت نکلی ہے، کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اس میں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لیے ہیں روپیہ کی ایک جگہ ہے وہ آج کل خالی ہے میں نے سیکریٹری کو کہہ کر آپ کے لیے گنجائش نکالی ہے،

اور بیس کی جگہ پچیس منظور کرا لیا ہے۔ مکان بھی رہنے کو مفت ملے گا۔ بقیہ وقت میں اور اشغال جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر چہ اس جگہ کے لیے انگریزی شرط نہیں ہے لیکن مجھ کو ایسا یاد پڑتا ہے کہ آپ نے انگریزی بھی پڑھی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی یہ کہہ دیا تھا۔ منتظمین یتیم خانہ مذہبی اعتقادات میں ناواقف ہیں اور حنفیت کے عاشق، سابق معلم کو اس جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام کے مخالف تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی طریق میں بیعت کردہ ہیں۔ بس ان جزئیات کا خیال رہے۔ آپ فوراً بھاگلپور سے روانہ ہو کر سیدھے کلکتہ پہنچیں اور مرزا احمد علی سکریٹری یتیم خانہ کمیٹی نمبر 30 لور چیت پور روڈ سے جا کر ملیں اور میرا خط دکھلائیں۔

بحالت موجودہ یہ جگہ غنیمت ہے اسے منظور کر لیجیے اس کے بعد انشاءاللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا ہو اور تمام امور عمل میں آئیں۔ والامر بیدہ سبحانہ وتعالیٰ

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ،

رانچی، بہار

22 ذی قعدہ 34ھ"

بہر حال مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر بندی 31 دسمبر 1919 کو ختم ہوئی اور اس طرح مولانا یہاں رانچی میں تقریباً پونے چار سال کی مدت گذار کر رہا ہوئے اور اپنے مشن میں پہلے سے زیادہ توانائی کے ساتھ فعال ہو گئے۔ رہا ہوتے ہی 18 جنوری 1920 کو سب سے پہلے گاندھی جی سے ملے۔ ان دنوں ملک نہایت پر آشوب دور سے گزر رہا تھا۔ مولانا نے علمی اور ادبی سرگرمیوں کو بہت حد تک ملتوی کر دیا۔ تحریک آزادی میں شامل ہوئے اور سیاسی تقریر و تحریر، خطابات و مواعظ اور قید و بند کی صعوبتوں وغیرہ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ عالم بے عمل اور مفکر اسلام مولانا ابوالکلام آزاد نے بہار میں 'امارت شرعیہ' قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ان ہی کی ایما پر 26-25 جون 1921 کو جمعیۃ العلمائے ہند کا جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا کو کرنی تھی مگر علالت کی وجہ سے وہ اس جلسہ میں شریک نہیں ہو سکے۔ مولانا کی اجازت سے جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ میں باضابطہ امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا اور اسی جلسہ میں فیاض المسلمین مولانا سید شاہ بدرالدین قادری، سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ امیر شریعت اول منتخب کیے گئے جن کے وصال کے بعد ان کے منجھلے بھائی مولانا سید شاہ قمرالدین قادریؒ امیر شریعت ثانی منتخب کیے گئے تھے۔ کانگریس سے وابستگی کے بعد کانگریس کی ہر کامیابی میں مولانا کی بھی شرکت تسلیم کی جاتی تھی۔ وہ 1923 میں محض 34 سال کی عمر میں پہلی بار کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ جب بہار میں مولانا سجادؒ نے اوقاف کو زرعی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو مولانا ابوالکلام آزاد پٹنہ تشریف لائے اور مولانا سجادؒ کے مطالبہ کو درست اور جائز قرار دیتے ہوئے اوقاف کو زرعی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ مولانا 1939 نے جب غیر منقسم بہار کے ضلع رام گڑھ کے 53ویں اجلاس میں تاریخی خطبہ دیا تو کانگریس کے اس اجلاس میں وہی قراردادیں منظور کی گئیں جنھیں مولانا نے اپنے خطبہ میں بیان کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو اس دوران کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ وہ خود 'غبار خاطر' میں فرماتے ہیں:

"قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ 1916 میں پیش آیا تھا، جس مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر 1921، 1931، 1940، میں..... پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے 53 برس گذار چکے ہیں۔ ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانے کے اندر گذرا۔"

تمھارے ترکش مژگاں سے لاکھوں تیر آتے ہیں
لیے جاتا ہوں سینے پر بلا کی سخت جانی ہے

مصنف امداد صابری کی تصنیف 'امام الہند مولانا آزاد' (صفحہ 34-132) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ان کے رانچی قیام کے حوالے سے دو مستند مضامین دستیاب ہوئے۔ پہلا مضمون مولانا ابو محمد مصلح کا اور دوسرا مضمون سہیل عظیم آبادی کا ہے۔ یہ دونوں مضامین قیام رانچی کے حوالے سے دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا ابو محمد مصلح کے مضمون میں پھلواری شریف، بہار کی ایک ذی وقار شخصیت شاہ وارث امام پھلواری کا تذکرہ شامل ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے نہایت قریب دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ مولانا ابو محمد مصلح کے مضمون کی وہ تراشیدہ عبارت دیکھیے جسے مصنف امداد صابری نے صوبہ بہار کی راجدھانی پٹنہ سے نکلنے والے 'الکلام' کے 22 فروری 1960 کے شمارے سے اخذ کیا ہے:

"رانچی میں مولانا نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ایک اسلامی مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائی اور ہندوستان کے نامور علما اور مشاہیر کو بلا لیا اور ایک بڑا افتتاحی جلسہ منعقد کیا۔

دوسرا اہم کام جو مولانا نے رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں انجام دیا، وہ ان کی کتاب 'تذکرہ' کی ترتیب پانا ہے۔ اس کتاب کو ایک طرح سے مولانا کی سوانح عمری کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ معلوم نہیں 'تذکرہ' کس طرح کتابی شکل پا سکا۔ شاہ وارث امام پھلواری (میرے پھلواری بھاگلپور سنٹرل جیل کے رفیق) جو کچھ دنوں مولانا کے ہاں رہے ہیں، کہتے تھے کہ مولانا کے ساتھ ایک صندوق بھی رہتا ہے جس پر لکھا ہوا ہے "بوقت فرصت" ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جدوجہد رنگ لائی اور انہوں نے 47 سال قبل اپنے تخلص سے جو پہلی غزل کہی تھی اور جس کا مقطع تھا کہ 'آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ - پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی' اس مقطع کی تعبیر 15 اگست 1947 کو یہ نکلی کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ مجاہدہ منزل مقصود کو پہنچا۔ کامیابی نقطہ عروج پر منتہی ہوئی۔ مولانا نے بطور وزیر تعلیم بھی ملک و ملت کی بے پناہ خدمات انجام دیں۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی گئی ان کی تمام تر خدمات پر ملک کو ناز ہے۔ بالآخر بشری تقاضے کے تحت وقت تمام ہوا اور وقت آ کر آ گیا۔ دہلی میں اُن پر 19 فروری 1958 کی صبح اچانک فالج کا حملہ ہوا۔ ہر ممکن طبی امداد پہنچائی گئی مگر خدا کا بندہ خدا کو لبیک کہہ چکا تھا! 22 فروری 1958 کو دو بج کر دس منٹ پر مولانا نے آخری سانس لی۔ اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سازی کا جو سفر مکہ معظمہ سے شروع ہوا تھا، وہ دہلی اور کولکتا سمیت دیگر کئی اہم مقامات کے ساتھ ساتھ صوبہ بہار سے بھی نہایت کامیابی کے ساتھ گذرتا ہوا اپنی آخری منزل کو جا پہنچا۔ تدفین جامع مسجد دہلی کے قریب عمل میں آئی۔ آہ! امام الہندؒ! متحدہ بہار میں تحریر کردہ معرکۃ العرا تصانیف 'تذکرہ' اور 'ترجمان القرآن' کا شہر گواہ، شہر رانچی یتیم ہو گیا!

ضبط نالہ کریں تو سینہ پھٹا جاتا ہے
نہ کریں گریہ تو دل غم سے جلا جاتا ہے

مراجع ومصادر:

(1) مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی، ادبی، قومی، ملی خدمات: ڈاکٹر منظر حسین
(2) مولانا آزاد کی کہانی: ڈاکٹر ظفر احمد نظامی
(3) مولانا ابوالکلام آزاد: محی الدین احمد
(4) مولانا ابوالکلام آزاد: بہار اردو اکادمی
(5) خطبات آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد
(6) مولانا ابوالکلام آزاد (افکار و نظریات): ڈاکٹر احسان عالم
(7) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ: پروفیسر عبدالستار دلوی
(8) مولانا ابوالکلام آزاد (مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد: مولانا ضیاء الدین اصلاحی
(9) مولانا ابوالکلام آزاد: احمد حسین کمال
(10) سہ ماہی مجلہ المجیب، اکتوبر۔دسمبر 2013، مدیر: ڈاکٹر فتح اللہ قادری

■

Sayyed Mohd Nayyer Rizvi
Deputy Director, R.O.B, Wazarat Ittelaat wa Nashriat, Bharat Sarkar
Ranchi - 834002 (Jharkhand)
Mob.:08987582814

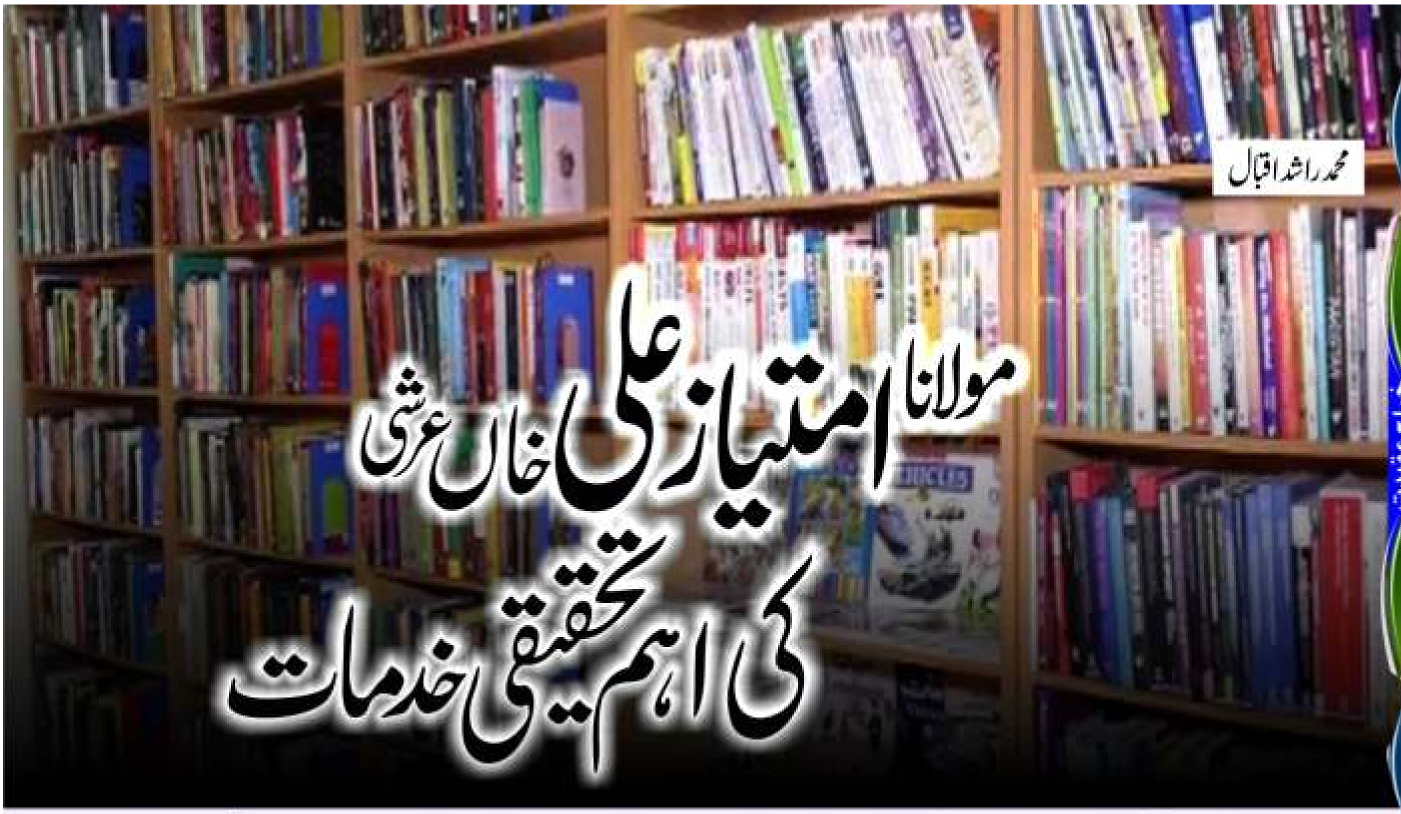

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی اہم تحقیقی خدمات

محمد راشد اقبال

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا شمار صف اول کے محققین اور ماہر غالبیات میں ہوتا ہے۔ آپ کا تعلق افغانی النسل یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ حاجی خیل سے تھا۔ آپ کے آبا و اجداد پشتہا پشت سے ریاست رام پور میں آباد تھے، یہیں آپ اپنے آبائی مکان واقع محلہ پچلوار میں بروز جمعرات مطابق 8/دسمبر 1904 کو پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مولانا اکبر علی خاں بن رحم باز خاں مشہور عالم اور محدث تھے۔ والد ممتاز علی خاں رام پور کے سرکاری مویشی اسپتال کے افسر تھے۔ آپ نے عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ مطلع العلوم اور مدرسہ عالیہ رام پور میں حاصل کی۔ 1924 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی، فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ذاتی مشق و مطالعہ کے ذریعے انگریزی سے اچھی طرح واقفیت بہم پہنچائی۔ 1926 میں صرف انگریزی کا امتحان بھی دیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کے سفیر کی حیثیت سے مقرر ہوئے، لیکن عزت نفس کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جلد ہی اس ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے بعد تجارت شروع کی، لیکن آپ کا مزاج تجارت کے لیے موزوں نہ تھا۔ بالآخر اسے بھی ترک کر دیا۔

دراصل آپ کو ابتدا ہی سے مطالعۂ کتب اور علمی تحقیقات کا شوق تھا، اس لیے آپ کا زیادہ تر وقت کتب خانہ میں بسر ہونے لگا۔ اس زمانے میں ایک انگریز مسٹر چیمپن (Mr.Champan) کتب خانے کے ناظم تھے، انھوں نے عرشی صاحب کی صلاحیتوں اور علمی ذوق کو دیکھ کر کتب خانے میں اپنی نیابت کے لیے راضی کر لیا۔ باقاعدہ ملازمت کے بعد آپ نے کتب خانے کی مطبوعات و مخطوطات کو مسٹر چیمپن کی نگرانی میں بڑی جانفشانی کے ساتھ مرتب کیا اور پھر مسٹر چیمپن کے بعد آپ ان کی جگہ ناظم کتب خانہ مقرر ہوئے۔ آپ نے 31 جولائی 1932 کو یہ عہدہ سنبھالا اور پھر پوری زندگی علمی مشاغل اور کتب خانے کی دیکھ بھال میں صرف کر دی۔

آپ نے تحقیق اور تدوین متن میں گراں قدر کارنامے انجام دیے، اور اپنی ادبی کاوشوں کو تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی تحقیق کا دائرہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کی ادبیات سے متعلق ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و تحقیقی مقالات بھی ہیں۔

1961 میں آپ کی تحقیقی خدمات کے اعتراف میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1972 میں صدر جمہوریہ ہند شری وی۔وی۔ گری نے آپ کی عربی کی قابلیت کے اعتراف میں' سرٹیفکیٹ آف آنرز' سے نوازا۔ اردو تحقیق و تدوین میں گراں قدر ذخیرے کا باعث بننے والا نابغۂ روزگار محقق کاتب تقدیر کے احکامات کی بجا آوری میں 25/فروری 1981 بمقام رام پور اس دارفانی سے رخصت ہو گیا۔

اردو ادب میں آپ کا نام ماہر غالبیات کی حیثیت سے سرفہرست ہے۔ آپ نے غالبیات کے شعبے میں نت نئے اضافے کیے، جن میں مکاتیب غالب، انتخاب غالب، فرہنگ غالب اور دیوان غالب (نسخہ عرشی) شامل ہیں۔ آپ نے کثیر تعداد میں علمی و تحقیقی مضامین و مقالات بھی لکھے، جو مختلف رسائل و مجلات میں شائع ہوئے۔ 1970 میں آپ کے

مقالات کا ایک مجموعہ 'مقالات عرشی' کے نام سے مجلس ترقی ادب، لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔ مضامین و مقالات کے علاوہ آپ نے دوسروں کی نادر و نایاب تصانیف کو عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ ترتیب دینے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ آپ کی اہم تحقیقی خدمات کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مکاتیب غالب:

یہ کتاب غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو غالب نے نوابان رامپور اور وابستگان دربار کو لکھے تھے۔ یہ خطوط محکمہ عالیہ دارالانشا، ریاست رام پور میں موجود تھے۔ لیکن لمبے عرصے سے پڑے ہونے کی وجہ سے ان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ عرشی صاحب نے تحقیق و تدوین کے جدید اصولوں کی روشنی میں اس سرمایے کو دست برد حوادث سے محفوظ کرکے اسے ادب کے قدر دانوں تک پہنچایا۔ ان خطوط سے غالب کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے نت نئے گوشے اور پہلو پہلی مرتبہ لوگوں کے سامنے آئے۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ 1937 میں مطبع قیمہ ممبئی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں مکاتیب کی تعداد 115 ہے۔ لیکن خطوط کے نمبروں کے تحت ایک فارسی قصیدہ اور ایک قطعہ بھی درج کیے گئے ہیں، جن کی وجہ سے مجموعی تعداد 117 ہو گئی ہے۔ عرشی صاحب نے اس کے متن کی صحت پر بڑا زور صرف کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کے شروع میں مبسوط دیباچہ اور آخر میں محققانہ حواشی لکھے ہیں۔ اس ایڈیشن میں جن شخصیات کے نام غالب کے خطوط شامل ہیں، ان کے نام مع تعداد خطوط درج ذیل ہیں۔[1]

(1) نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام 41 خطوط
(2) نواب کلب علی خاں کے نام 64 خطوط
(3) نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے نام 2 خطوط
(4) منشی سیلچند (میر منشی دارالانشا) کے نام 6 خطوط
(5) خلیفہ شیخ احمد علی احمد رام پوری کے نام 1 خط
(6) مولوی محمد حسین خاں (ایڈیٹر اخبار دبدبہ سکندری) کے نام 1 خط

متذکرہ بالا ایڈیشن کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے، اور مکاتیب کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس مجموعہ کا چھٹا ایڈیشن 1949 میں سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ، ریاست رام پور کی جانب سے شائع ہوا۔ اس میں خطوط کی تعداد 115 سے بڑھ کر مجموعی طور پر 130 ہو گئی ہے۔ عرشی صاحب نے اس ایڈیشن میں دیباچے کو بھی مزید مفصل کر دیا ہے، اور محققانہ حواشی میں بھی اضافے کیے ہیں۔ جن کی وجہ سے مجموعے کی ضخامت بھی بڑھ گئی ہے، اور کتاب پہلے سے بہتر بھی ہو گئی ہے۔ اس ایڈیشن میں جن شخصیات کے نام غالب کے خطوط شامل ہیں، ان کے نام مع تعداد خطوط درج ذیل ہیں۔[2]

> ”اردو ادب میں آپ کا نام ماہر غالبیات کی حیثیت سے سرفہرست ہے۔ آپ نے غالبیات کے شعبے میں نت نئے اضافے کیے، جن میں مکاتیب غالب، انتخاب غالب، فرہنگ غالب اور دیوان غالب (نسخہ عرشی) شامل ہیں۔ آپ نے کثیر تعداد میں علمی و تحقیقی مضامین و مقالات بھی لکھے، جو مختلف رسائل و مجلات میں شائع ہوئے۔“

(1) نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام 44 خطوط
(2) نواب کلب علی خاں کے نام 73 خطوط
(3) نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے نام 2 خطوط
(4) صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بہادر کے نام 2 خطوط
(5) منشی سیلچند (میر منشی دارالانشا) کے نام 7 خطوط
(6) خلیفہ شیخ احمد علی احمد رام پوری کے نام 1 خط
(7) مولوی محمد حسین خاں (ایڈیٹر اخبار دبدبہ سکندری) کے نام 1 خط

انتخاب غالب:

غالب نے 1866 میں نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر خود اپنے اردو، فارسی کلام کا الگ الگ انتخاب کتابی شکل میں نقل کرا کے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ انتخاب تقریباً 80 برسوں تک گمنامی میں رہا۔ یہ بھی کتب خانے کے انبار میں ردی کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ان کے بھی تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ عرشی صاحب نے گوشۂ خمول میں پڑے ہوئے اس انمول خزانے کو ڈھونڈ نکالا اور پھر اسے زیور طباعت سے آراستہ کرکے ارباب ذوق کے لیے وقف کر دیا۔ یہ مجموعہ 1942 میں مطبع قیمہ ممبئی سے شائع ہوا۔ کتاب کے شروع میں بشیر حسین زیدی صاحب کی پانچ صفحات پر مشتمل 'تقریظ' ہے۔ پھر 31 صفحات پر مشتمل عرشی صاحب کا مبسوط دیباچہ ہے۔ اس کے بعد 318 صفحات اردو، فارسی کلام پر مشتمل ہیں۔ آخر میں 'عرشی صاحب کا 'شرح غالب' کے عنوان سے 25 صفحات پر مشتمل محققانہ حواشی اور 'اشاریہ' ہے۔ اس مجموعے کی مجموعی ضخامت 379 صفحات ہے۔[3]

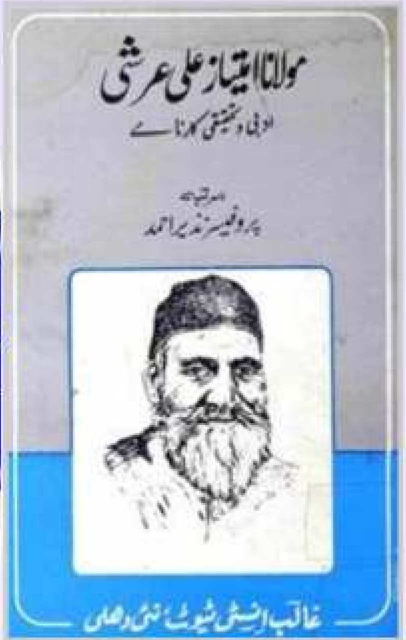

فرہنگ غالب:

یہ کتاب خود میرزا غالب کے اپنے الفاظ میں اردو، ہندی، سنسکرت، ترکی، فارسی اور عربی لغات کی تحقیق و تشریح پر مشتمل ہے۔ عرشی صاحب نے اسے نہایت ہی عرق ریزی سے ترتیب دیا۔ یہ کتاب مطبع ناظم برقی پریس، رام پور کی جانب سے 1947 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی جمع و ترتیب سے جہاں عرشی صاحب کی محنت، کاوش اور جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس کے دیباچے سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو الفاظ، زبان اور قواعد پر کس قدر عبور تھا۔ انھوں نے 23 صفحات پر مشتمل اپنے دیباچے میں ہندوستانی لغت نویسوں کی فہرست اور ان کے کام کا جائزہ بھی لیا ہے۔ دیباچے کے بعد 7 صفحات پر مشتمل 'استدراک' ہے۔ اس کتاب میں حصہ اول 'فارسی' 259

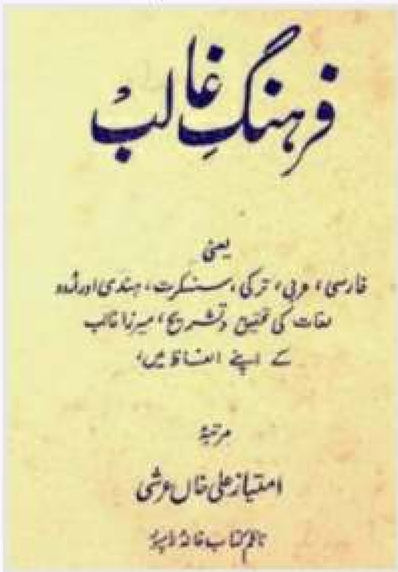

صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر حصہ دوم 'اردو' 26 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد 7 صفحات پر مشتمل 'اشاریۂ' ہے۔ اس کتاب کی مجموعی ضخامت 313 صفحات ہے۔[4]

دیوان غالب:

عرشی صاحب نے غالب کے قدر دانوں کے لیے ایک بڑا ادبی تحفہ مکمل 'دیوانِ غالب' (نسخۂ عرشی) کی شکل میں پیش کیا۔ یہی دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کہلاتا ہے۔ عرشی صاحب نے اس کی تدوین میں تاریخی ترتیب اور منشائے مصنف کا جو التزام کیا ہے وہ تحقیق کے باب میں ایک سنہرا اضافہ ہے۔ انھوں نے شروع میں عالمانہ مقدمہ اور آخر میں مبسوط حواشی لکھے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ 1958 میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی مجموعی ضخامت 632 صفحات ہے۔[5] اس کا دوسرا ایڈیشن 1982 میں انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی کی جانب سے شائع ہوا۔[6] دیوان غالب' (نسخۂ عرشی) تین حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے کا نام 'گنجینۂ معنی' رکھا گیا ہے۔ اس میں غالب کے وہ تمام اشعار ہیں جو انھوں نے شروع میں کہے اور شائع کیے، لیکن پھر ان میں سے بیشتر 1841 کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں کیے۔

دوسرے حصے کا نام 'نوائے سروش' ہے۔ اس میں غالب کا وہ متداول کلام ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں متعدد مرتبہ چھپوا کر تقسیم کیے۔

تیسرے حصے کا نام 'یادگار نالہ' ہے۔ اس حصے میں غالب کا وہ کلام ہے جو ان کے دیوان کے کسی نسخے کے حاشیے یا خاتمے یا ان کے کسی خط میں یا کسی بیاض میں یا ان کے نام سے کسی رسالے میں شائع ہوا ہے۔

”

عرشی صاحب نے تنہا غالب ہی پر جو کچھ لکھا ہے وہی ان کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے کافی ہے، مگر ان کے ذوق کے تنوع اور طبیعت کی رنگا رنگی نے انہیں کسی ایک ہی وادی میں محصور نہیں رکھا، بلکہ ان کے قلم کی گلکاریوں کے نمونے ایک سے بڑھ کر ایک تینوں زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں منظر عام پر آئے۔

“

اس طرح غالب نے اپنی زندگی میں اردو میں جتنے اشعار کہے وہ سب اس ایڈیشن میں مل جاتے ہیں جس کو عرشی صاحب نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور تقریظ میں لکھتے ہیں:

''زیر نظر ایڈیشن جو اردو کے مشہور محقق اور ماہر غالبیات جناب امتیاز علی عرشی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے، بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت، نسخوں کے اختلاف کی نشاندہی، شرح اور ضروری حواشی کے لحاظ سے اب تک کی ساری کاوشوں پر بھاری اور اردو میں ادبی تحقیق اور عالمانہ نظر کا ایک قابل فخر اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔''[7]

عرشی صاحب نے تنہا غالب ہی پر جو کچھ لکھا ہے وہی ان کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے کافی ہے، مگر ان کے ذوق کے تنوع اور طبیعت کی رنگا رنگی نے انھیں کسی ایک ہی وادی میں محصور نہیں رکھا، بلکہ ان کے قلم کی گلکاریوں کے نمونے ایک سے بڑھ کر ایک تینوں زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں منظر عام پر آئے۔

ان کے ادبی کارناموں میں ایک اہم اور خاص 'نادرات شاہی' ہے۔ یہ کتاب مغلوں کے سولہویں فرمانروا شاہ عالم ثانی آفتاب (1728-1806) کے اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کلام پر مشتمل ہے۔ عرشی صاحب نے اسے ترتیب دے کر 60 صفحات پر مشتمل مبسوط دیباچے اور آخر میں 17 صفحات پر مشتمل 'اختلاف الفاظ' اور 'اشاریۂ' (اشخاص و مقامات) لکھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1944 میں ہندوستان پریس، رام پور کی جانب سے شائع ہوئی۔[8] اس کا دوسرا ایڈیشن لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی صاحب (افسر بکار خاص، رضا لائبریری) کے پیش لفظ کے ساتھ 2006 میں رضا لائبریری، رام پور سے شائع ہوا۔[9]

انھوں نے اردو زبان وادب کے قواعد سے متعلق حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی کی کتاب 'دستور الفصاحت' کو بھی مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1943 میں ہندوستان پریس، رام پور کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔[10]

عرشی صاحب کے کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ امام سفیان ثوری (متوفی 161ھجہ) کی تفسیر القرآن الکریم کی اشاعت ہے۔ یہ تفسیر ناپید تھی۔ اکثر لوگوں کو اس کے وجود کا بھی علم نہیں تھا، لیکن عرشی صاحب نے رضا لائبریری میں اس کا ایک ناقص نسخہ ڈھونڈ نکالا اور اسے اپنے عالمانہ مقدمے اور محققانہ حواشی سے مزین کر کے 1965 میں شائع کیا۔ یہ سورہ بقرہ تا سورہ طور کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

عرشی صاحب کے کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ امام سفیان ثوری (متوفی 161ھجہ) کی تفسیر القرآن الکریم کی اشاعت ہے۔ یہ تفسیر ناپید تھی۔ اکثر لوگوں کو اس کے وجود کا بھی علم نہیں تھا۔ لیکن عرشی صاحب نے رضا لائبریری میں اس کا ایک ناقص نسخہ ڈھونڈ نکالا اور اسے اپنے عالمانہ مقدمے اور محققانہ حواشی سے مزین کر کے 1965 میں شائع کیا۔ یہ سورہ بقرہ تا سورہ طور کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ فارسی میں 'وقائع عالم شاہی' (مصنف: کنور پریم کشور فراقی)[11]، 'تاریخ محمدی' (مصنف: میرزا محمد' تاریخ اکبری' معروف بہ تاریخ قندھاری (مولف: حاجی محمد عارف قندھاری)[12] وغیرہ کو مرتب کر کے شائع کیا۔

حواشی:

1. مکاتیب غالب، اشاعت اول 1937 مطبع قیمہ، بمبئی ص1 تا 121
2. مکاتیب غالب، اشاعت ششم 1949 کتاب خانہ، ریاست رام پور، ص1 تا 118
3. انتخاب غالب، اشاعت اول 1942 مطبع قیمہ، بمبئی
4. فرہنگ غالب، اشاعت اول، 1947 مطبع ناظم برقی پریس، رام پور
5. دیوان غالب نسخۂ عرشی، اشاعت اول 1958 انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
6. دیوان غالب نسخۂ عرشی، اشاعت دوم، 1982 انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی
7. دیوان غالب نسخۂ عرشی، (تقریب) اشاعت اول 1958 انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
8. نادرات شاہی، اشاعت اول 1944 مطبع ہندوستان پریس، رام پور
9. نادرات شاہی، اشاعت دوم، 2006، رضا لائبریری، رام پور
10. دستور الفصاحت، اشاعت اول، 1943 مطبع ہندوستان پریس، رام پور
11. وقائع عالم شاہی، 1949، مطبع ہندوستان پریس، رام پور
12. 'تاریخ اکبری' معروف بہ تاریخ قندھاری، 1962 ہندوستان پرنٹنگ ورکس، رام پور

■

Mohd Rashid Iqbal
Room No.: 75, Aftab Hostel, Aftab Hall
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:8410517510

اجتبیٰ رضوی اور مرد فقیر

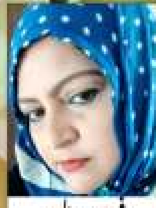

فرحت نادر

لفظوں کا معنویت کے ساتھ عجیب و غریب رشتہ ہے، الفاظ وہ صوتی سالمات ہیں جو سامع کے ذہن کے پردوں پر اس کے تجربی انکشافات کی بنیاد پر مختلف نقوش مرتب کرتے ہیں جن کے نتیجے میں اس کی حسی درکی سطحوں پر مختلف النوع ارتعاشات مرتب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یکساں صوتی سالمات کا qualifire impact مختلف اذہان کے لیے مختلف ہوتا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے کہ جس قدر اس رشتے کی صراحت و وضاحت اور تفسیر و تفہیم کی کاوش کی جاتی ہے اسی قدر یہ معاملہ الجھتا چلا جاتا ہے، محققین حیران ہیں کہ وہ کن ضابطوں کے تحت اس معاملے کو پرکھیں، غالب جیسا شاعر لفظوں کے معنی کے ساتھ تضاد تاثر کا احساس کرتا اور کہتا ہے۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اسکو دم ایجاد نہیں

دوسری طرف مرتضیٰ اظہر رضوی ترسیل معنی کو لفظوں سے پرے لہجوں کے زیر و بم کا رہین منت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

بات لفظوں میں کہاں پوری ادا ہوتی ہے
کچھ تو لہجوں ہی میں رہتی ہے مقالوں سے پرے

سائنس الفاظ کی معنویت کے امکانات کو اس حد تک محدود کرنا چاہتی ہے کہ ہر ذہن ایک متن سے ایک ہی نتیجہ اخذ کرے، اس کے برعکس ادب و شاعری الفاظ کے تفہیمی امکانات کو کھول دینا چاہتے ہیں۔ شاعری اسی عرصۂ امکان میں رم آہوئے فکر ہے، الفاظ جتنے بڑے بازیگر کی نطق فسوں ساز کے حوالے سے ترسیلی قالب میں ڈھلیں گے، ان کی تفہیمی جہات اسی قدر ہمہ گیر ہوں گی، الگ الگ حسی درکی سطحوں پر ان تاثرات کی شدت بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ ادب و شاعری کا حسن یہی ہے کہ ادنیٰ ترین ذہنی استعداد سے اعلیٰ ترین ذہنی استعداد رکھنے والے سامعین کے لیے ان کی اپنی مخصوص تجربی سطحوں پر کسب انبساط کے مواقع فراہم کرتی رہے۔

علامہ اجتبیٰ رضوی کی نظم مرد فقیر بہ ظاہر ایک بہت سہل و سادہ سی نظم ہے، شاعر نے بعض لفظی علامتوں کے حوالے سے ایک فکر پیش کی ہے۔ شاعر کی ذاتی تجربی سطح کا عمق، نظم کی دلکشی اور لفظوں کے اس طلسم کدے کی تاثیر پر کہیں اثر انداز نہیں ہوتا جو سامع کو چند لمحوں کے لیے خود سے بیگانہ کر دیتا ہے، تلاش و جستجو کی تڑپ، وقت گزراں کے زیاں کا کرب، خلقت کی بے حسی و غفلت کا احساس، ان تمام عناصر کی یکجائی سے شاعر کے درون کی بے چینی اور کرب کی شدت ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر شدید داخلی کرب کا شکار ہے، اس کرب نے محیط ہو کر اسے اپنے اطراف و جوانب سے یک گونہ بیگانہ کر رکھا ہے۔ مرد فقیر کی صورت میں وہ ایک عندلیب گلشن نا آفریدہ کی طرح اس باغ ہستی سے گزر رہا ہے، تلاش و جستجوئے مسلسل کی بے قراری سے پائے بیتاب کو تھمنے کا یارہ نہیں ہے، زندگی کی گنی ہوئی چند سانسیں اور بس.... عنقریب یہ سورج ڈوبنے والا ہے، یہی اس کی کل بضاعت ہے، یہی عرصۂ جستجو ہے، وہ کسی طرح منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے، مگر دنیا اپنے بکھیڑوں سے فرصت ہی نہیں دیتی، ہر قدم پر رونق بازار زنجیر پا ثابت ہوتی ہے۔ دنیا اسے کم فہم اور دیوانہ گردانتی ہے کہ وہ بے مول ملتی اس نعمت عظیم کو ٹھکراتا چلا جا رہا ہے، کون جانے اس کی منزل کہاں ہے؟ وہ کس درد کا اسیر، کس حسن کا تماشائی، کس عشق میں دیوانہ اور کیسی دولت کے حصول کے لیے بیتاب ہے۔ دنیا اس کی غفلت پر حیران ہے اور وہ اہل دنیا کی بے خبری پر ششدر۔ وہ رنجور ہے اور شاکی بھی۔

فطرت کو دل تپاں بنایا ہوتا
درد آگہہ و ہم زباں بنایا ہوتا
جس بزم کا میہماں بنایا ہم کو
اس کو تو مزاج داں بنایا ہوتا

الفاظ کی سطح سے ان کی نظم مرد فقیر جس قدر سہل و سادہ ہے تفہیم کی سطح سے اسی قدر مشکل، ہم اس نظم کے طلسم کو محسوس تو کرتے ہیں مگر اس طلسمی تاثیر کا تجزیہ کرتے ہوئے عجز بیان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاثیر کا سیل رواں وسیلہ ترسیل کی دسترس سے پرے ہے، اس کاوش میں شاعر کی فکر ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور الفاظ کف افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔

عجز بیان اور وسیلہ اظہار کی یہی کم مائیگی اکثر مبصرین وناقدین کو اجتبیٰ رضوی کی شاعری کے حوالے سے خاموشی یا محتاط گفتاری پر مجبور کرتی ہے، اجتبیٰ رضوی صاحب نے حسب معمول مردفقیر میں الفاظ کو ان کے وسیع ترین فکری پس منظر میں پیش کیا ہے، ہر ایک لفظ مخصوص تاثیر پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بازار، ستا بازار، تاجر، نیلامی مال، بھیڑ، مردفقیر...ایک ایک لفظ مخصوص صفات کا علامیہ ہے اور اجتبیٰ رضوی کے مخصوص مدھم مدھم لب ولہجے میں ڈھل کر یہ الفاظ تاثیر کا ایک سیل رواں بن جاتے ہیں۔

اب اگر ان کی تفہیم کی کوئی صورت نکالی جائے تو امر یقینی ہے کہ ترسیل معنی کے حوالے سے ان کا لفظی تجزیہ اصل نظم سے زیادہ ادق صورت اختیار کر جائے گا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقیع فکر اور ایک ادق خیال کو سہل ترین صورت میں برتنے کی ایک نہایت کامیاب کاوش مردفقیر کے حوالے سے شاعر نے کی ہے اور یہ بھی کہنا بجا ہوگا کہ اس مشکل فکر کو شاید اس سے زیادہ سہل وسادہ انداز میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ قارئین کے لیے یہاں اجتبیٰ رضوی صاحب کی مکمل نظم پیش کی جارہی ہے تا کہ تجزیاتی منازل میں اس کے حوالے سے گفتگو کا لطف حاصل کریں:

عجز بیان اور وسیلہ اظہار کی یہی کم مائیگی اکثر مبصرین و ناقدین کو اجتبیٰ رضوی کی شاعری کے حوالے سے خاموشی یا محتاط گفتاری پر مجبور کرتی ہے، اجتبیٰ رضوی صاحب نے حسب معمول مرد فقیر میں الفاظ کو ان کے وسیع ترین فکری پس منظر میں پیش کیا ہے، ہر ایک لفظ مخصوص تاثیر پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بازار، سستا بازار، تاجر، نیلامی مال، بھیڑ، مرد فقیر... ایک ایک لفظ مخصوص صفات کا علامیہ ہے اوراجتبیٰ رضوی کے مخصوص مدھم مدھم لب و لہجے میں ڈھل کر یہ الفاظ تاثیر کا ایک سیل رواں بن جاتے ہیں۔

ہم کو کل احباب نے آ کر بازاروں کے حال سنائے
کچھ نیلامی مال کے تاجر راہ پہ تھے اک بھیڑ لگائے
مال یہیں لو بڑھ نہ چلو ان لوگوں کا اصرار یہ تھا
خلقت تھی افلاس کی ماری اور ستا بازار یہ تھا
اتنے میں اس راہ گزر پر آ نکلا اک مردفقیر
سوز کلیم و برق تجلی جس کے لب جنباں میں اسیر
دیس کی دھن میں پردیسی بیتاب تھا چلتا جاتا تھا
دور بہت جانا تھا اسے اور سورج ڈھلتا جاتا تھا
بھیڑ پکاری سب ٹھہرے ہیں تم بھی یہیں ٹھہرو بابا
اس نے کہا چلنا ہے مجھے چلنے کا رستہ دو بابا

بنیادی فکر سے قطع نظر نظم مردفقیر کی لفظیات ایک الگ تاثراتی جہت کی حامل نظر آتی ہیں یہاں ہر لفظ محض ایک مخصوص قسم کی ذہنیت کی ہی عکاسی نہیں کرتا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک مضراب کی طرح ہماری فکر کے الگ الگ تاروں کو الگ الگ انداز میں اس طرح چھیڑتا ہے کہ ہر بار ایک منفرد نغمہ بیدار ہوتا ہے۔

اس نظم میں لفظ 'بازار' اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ اس طلسم کدہ ہستی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور اس طرح اس ایک لفظ کی مدد سے اس نظم میں وہ تمام ہنگامے اور عالم رنگ و بو کے پرفریب بہلاوے سمٹ آئے ہیں جن کے حصول کی تگ ودو میں عمر تمام ہوتی ہے، اس بازار کے ساتھ ساتھ بازار کی رونقیں بھی ہیں اور ہجوم بے خبراں کا اژدہام بھی، خرید وفروخت کی چیخ و پکار بھی ہے، اور افلاس زدہ خلقت کی تباہ حال صورت بھی.....غرض محض ایک لفظ ایک مکمل منظرنامے کی تشکیل کر رہا ہے۔

نیلامی مال۔ یہ لفظ فکر وعقائد سے وابستہ ان تمام فرسودہ اور ناقابل اعتبار و عمل مذہبی حوالوں سے متعلق اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جو بدلتے ہوئے فکری سانچوں اور جدید ذہنی ضروریات کی تکمیل سے ہر چند قاصر ہیں مگر پھر بھی چونکہ ان کا حصول بہ ظاہر سہل نظر آتا لہٰذا ایک خلقت ابھی بھی ان کی افادیت کی حامی و مداح نظر آتی ہے اور اپنی اس کوتاہ فہمی اور تن آسانی میں دوسروں کو بھی شریک کر کے ان کی تلاش وجستجو کے در بھی بند کردینے کو بہتر اور منافع بخش عمل تصور کرتی ہے، فرسودہ نظریات وعقائد کی اسیر یہ افلاس فکر کی حامل مخلوق بازار کی پرفریب رونق کی جانب پکار پکار کر بہ اصرار اوروں کو بھی متوجہ کر رہی ہے کہ آگے کی فکر چھوڑو اور یہیں ستا سودہ خریدو، کہاں تلاش وجستجو کی الجھنوں میں پڑو گے۔ اجتبیٰ رضوی نے اپنی شاعری کے حوالے سے متعدد مقامات پر اس ذہنی صورتحال پر کڑی تنقید کی ہے اور فکر انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

چٹخے ہوئے پیمانوں میں کب تک پینا
ماضی کی ذکات پر کہاں تک جینا
پھینکو بھی اتار کر یہ میراث قدیم
دامان قبائے کہنہ کب تک سینا

نظم مردفقیر میں لفظ 'تاجر' ان لذت فروشوں سے متعلق علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے جو مختلف حوالوں سے اپنے مال کی عظمت وافادیت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ انھیں بھی اپنے دعووں کے کھوکھلے پن کا اندازہ ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ خلقت کو اس کی افلاس فکر کا احساس دلا کر مزید تگ ودو سے باز رکھنا چاہتے ہیں، مبادہ یہ کاوش ان فرسودہ عقائد کے بھرم چکنا چور نہ کر ڈالے، جنھیں ایک عرصے سے سجا سنوار کر وہ ہر نئی نسل کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں، اور اپنی دوکان پر سستے مال کا اعلان نامہ لگا

کر اپنی بوسیدہ فکر کی دیمک زدہ بنیادوں کو جدید تصورات کی مضبوط بنیادوں کے بالمقابل بہتر اور سودمند ثابت کرتے رہتے ہیں۔

لفظ بھیڑ اس ہجوم بے خبراں کی نمائندگی کرتا ہے جو ان لذت فروشوں کے دام فریب میں گرفتار ہوکر بے غل و غش اس عرصۂ حیات کا زیاں کر رہا ہے جسے اسے تلاش و جستجو میں صرف کر کے قافلہ حیات کے ارتقا میں اپنے حصے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تھا، اور افلاس وہ ذہنی بد حالی ہے جس کی شکار یہ ساری کی ساری خلقت ہے جو سستے مال کا سودہ کر کے خوش ہے۔

مردفقیر اپنے انداز میں وہ تمام آن بان اور شان رکھتا ہے جو اس کی فقیری پر دلالت کرتی ہے، اس کی بے نیازی و درویشی اگر ایک جانب بازاری مال کی کم قیمتی و بے مائیگی کو ظاہر کرتی ہے تو دوسری جانب اس کی سرعت خرام رخش عمر کی تیز گامی اور منزل حیات کی بے بضاعتی، ان دونوں حقیقتوں کی جانب ایک لطیف اشارہ رکھتی ہے۔ یہ وہ مرد توانا ہے جو اپنی خودی پر قانع ہے، اور بازاری اجناس اور سکے دونوں اس کی نگاہ میں بے وقعت ہو چکے ہیں۔

ایک اچھا شاعر ایک اچھا مصور بھی ہوتا ہے، وہ لفظوں سے صفحۂ قرطاس پر کچھ خطوط کھینچتا ہے، کچھ نقطے ثبت کرتا ہے اور کچھ رنگ چھڑکتا ہے جس کے نتیجے میں کچھ مناظر ابھرتے ہیں اور کچھ صورتیں بول اٹھتی ہیں، مرد فقیر کا چہرہ رعب و تمکنت و شفقت کی ایک ایسی آمیزش رکھتا ہے جو اسے شان عیسیٰ عطا کرتا ہے، اس چہرے سے ایک آواز اور لہجہ بھی وابستہ ہے جس میں اگر ایک طرف سوز کلیم کی دلگدازی و دلنشینی ہے تو دوسری جانب برق تجلی کی وہ کڑک بھی جو تیرہ بختوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مرد فقیر کی منظر پر آمد سے قبل بھی نظم کے کینوس پر انسان تھے مگر ان انسانوں کے چہرے نہ تھے، یہ ہجوم بے چہرہ تھے جن کی کوئی شناخت نہ تھی، جبکہ مرد فقیر کا ایک چہرہ تھا جو اپنی صفات کے سبب مرد فقیر کو اس ہجوم بے چہرہ سے ممیز و ممتاز کر رہا تھا۔

'دیس کی دھن' کی تفصیل اور اس کا مفہوم پردیس کے درد کو ابھار دیتا ہے، روح کی شرافت اور خون کی حدت نے ہر نفس کے اندر اس کے دیس کے لیے بہ قدر پیمانۂ تخیل جس قدر بیتابی رکھی، اس پردیس میں وہ اسی قدر بے تاب و مضطرب نظر آیا۔ مرد فقیر کی بے تاب تیز گامی اور ہجوم بے خبراں کی گزارشیں اور حصول دنیا کے لیے ان کا اصرار اور مرد فقیر کا واضح مطمح نظر کہ 'چلنا ہے مجھے' اور بس..... فکر کی دو انتہاؤں کی خبر دیتا ہے۔

اس نظم کا طلسم رفتہ رفتہ اپنے حصار وسیع کرتا ہے اور بڑے سہل انداز میں ایک نقطے سے پھیل کر مکمل منظر پر محیط ہو جاتا ہے۔ نیلامی مال کے انبوہ گراں سے اس منظر کی ابتدا ہوتی ہے نظر اس نقطے سے ذرا بلند ہوتی ہے تو ان تاجروں کی بھیڑ پر ٹھٹھکتی ہے جس نے آگے بڑھنے کی راہ مسدود کر رکھی ہے۔ اس منزل پر شاعر بصارت کے ساتھ ہماری سماعت کو بھی بیدار کرتا ہے اور ایک بتدریج بڑھتا ہوا شور ہمارے اندر بازار کی گہما گہمی اور افراط و تفریط کا احساس بیدار کر دیتا ہے۔

> **مرد فقیر اپنے انداز میں وہ تمام آن بان اور شان رکھتا ہے جو اس کی فقیری پر دلالت کرتی ہے ,اس کی بے نیازی و درویشی اگر ایک جانب بازاری مال کی کم قیمتی و بے مائیگی کو ظاہر کرتی ہے تو دوسری جانب اس کی سرعت خرام رخش عمر کی تیز گامی اور منزل حیات کی بے بضاعتی. ان دونوں حقیقتوں کی جانب ایک لطیف اشارہ رکھتی ہے. یہ وہ مرد توانا ہے جو اپنی خودی پر فاتح ہے ,اور بازاری اجناس اور سکے دونوں اس کی نگاہ میں بے وقعت ہو چکے ہیں.**

ہم کو کل احباب نے آ کر بازاروں کے حال سنائے
کچھ نیلامی مال کے تاجر راہ میں تھے اک بھیڑ لگائے
مال یہیں لو بڑھ نہ چلو ان لوگوں کا اصرار یہ تھا
خلقت تھی افلاس کی ماری اور سستا بازار یہ تھا

اسی مقام سے بازار کی دوا دوش کا احساس بڑھتا ہے ایک طرف سستے معتقدات، فرسودہ مسلمات اور پر فریب نظریات کا ذخیرہ ہے جن کا حصول سہل ترین بھی ہے۔ تن آسانی فکر کے حمایتی اسی ذخیرے کو وقیع ترین ثابت کرنے پر مصر ہیں اور ایک خلقت ہے کہ عالم بدحواسی و تن آسانی کے سبب سنی سنائی کو درست سمجھتے ہوئے ہر ایک جانب لپکتی ہے، کبھی ادھر جھکتی ہے کبھی ادھر راغب ہوتی ہے، افلاس فکر اسے غور فکر کرنے اور ذاتی کاوش سے نتائج اخذ کرنے سے باز رکھتا ہے۔

نظم کا منظر نامہ بازار کی چیخ و پکار اور افراط و تفریط سے روز محشر کا نقشہ پیش کر رہا ہے معاً اس شور و غوغا کے درمیان اس منظر نامے پر ایک مرد فقیر کا وجود ابھرتا ہے یہ گویا طلوع آفتاب کا منظر ہے، مرد فقیر وہ آفتاب ہے جو اس منظر نامے کے کسی گمنام گوشے سے مدھم مدھم سی کرنیں لیے طلوع ہوتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورا منظر نامہ اس کی شعاؤں سے جگمگا اٹھتا ہے۔

ایسے میں اس راہ گزر پر آ نکلا اک مرد فقیر
سوز کلیم و برق تجلی جس کے لب جنباں میں اسیر
دیس کی دھن میں پردیسی بے تاب تھا چلتا جاتا تھا
دور بہت جانا تھا اسے اور سورج ڈھلتا جاتا تھا
بھیڑ پکاری سب ٹھہرے ہیں تم بھی یہیں ٹھہرو بابا

مگر درویش کے لیے اس پکار پر لبیک کہنا ممکن نہ تھا، کیونکہ وہی تو محرم راز ہستی تھا، اسے منزل پکار رہی تھی اور سورج تھا کہ ڈھلتا جا رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے پائے استقامت تھکن کا احساس کے بغیر رواں دواں تھے۔ سو اس نے بس اتنا ہی کہا...

اس نے کہا چلنا ہے مجھے چلنے کا رستہ دو بابا

یہ منزل نظم کا نقطۂ کمال بھی ہے اور نقطۂ تکمیل بھی... یہی وہ منزل ہے جس تک پہنچانے کے لیے شاعر نے زندگی کی دوا دوش سے پُر یہ منظر نامہ ترتیب دیا تھا۔ جس سہولت کے ساتھ شاعر نے اس دقیق فکر کی ترسیل کی ہے اور سامعین کے ذہن کے تاروں کو جس لطافت کے ساتھ چھیڑ کر نغمے بیدار کیے اور تلاش و جستجو کی اہمیت منکشف کی ہے لائق تحسین ہے۔ شاعر کی نگاہ میں زندگی کی اصلیت تلاش و جستجو میں مضمر ہے، حق وہ نہیں جو بتایا جائے بلکہ حق صرف اور صرف وہی ہو سکتا ہے جو سعی اور تلاش مسلسل کے نتیجے میں منکشف ہو، حقیقت انفرادی حیثیت کی حامل ہوتی ہے نہ کہ اجتماعی، اجتماعی نظریات و مسلمات محض راہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں مگر اس راہ کی صعوبتیں انفرادی سطح پر برداشت کیے بغیر حقیقت کا روئے روشن نہیں دیکھا جا سکتا۔

> **شاعر کی نگاہ میں زندگی کی اصلیت تلا ش و جستجو میں مضمر ہے. حق وہ نہیں جو بتا یا جائے بلکہ حق صرف اور صرف وہی ہو سکتا ہے جو سعی اور تلاش مسلسل کے نتیجے میں منکشف ہو. حقیقت انفرادی حیثیت کی حامل ہوتی ہے نہ کہ اجتماعی. اجتماعی نظریا ت و مسلمات محض راہ کی نشاندھی کر سکتے ہیں. مگر اس راہ کی صعوبتیں انفرادی سطح پر برداشت کیے بغیر حقیقت کا روئے روشن نہیں دیکھا جاسکتا.**

علامہ اجتبیٰ رضوی کی فکر ایک خط مستقیم پر چلتی ہے، خواہ نظم ہو نثر ہو یا رباعی یا پھر ان کی ذاتی زندگی، انہوں نے زبان و عمل سے ہمیشہ اندھا دھند قسم کی تقلید کو ناپسند کیا ہے اور تلاش و جستجو کا حوصلہ پیدا کرنے کی تحریک دی ہے:

یہ کہنہ تن آسانی تقلید کی راہ
لا حول و لا قوۃ الا باللہ
تشکیک کی ذمہ داریوں سے ڈر کر
ڈھونڈی گئی فرسودہ عقائد کی پناہ

یہ کانٹوں سے پر رہگزر تھی جس سے وہ اپنی عملی زندگی میں گزرتے رہے۔ بعض ناقدین نے جلد بازی میں ان کو متشکک قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا مگر ان کی ہمت امکاں گیر ہر نقش میں کوشش نقش دگر کے امکانات کی متلاشی رہی۔

اس آدم اکبر کی ہے جویا تقدیر
خلاق ہو جس کی ہمت امکاں گیر

■

Dr. Farhat Nadir Rizvi
E-246 /1 Upper Ground Floor
Allama Shibli Nomani Road Abul Fazal Enclave
Part 2 Shaheen Bagh
New Delhi- 110025
Mob.: 7903693295

غالب کی ایک غزل

ابوظہیر ربانی

مرزا غالب کا شمار انیسویں صدی کے بدلتے ہندوستان کے ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جن کی گرفت ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں ہے۔ غالب کی شاعری کی جڑیں تینوں زمانوں میں پیوست ہیں۔ گویا غالب ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عہد اور ایک تہذیب کی علامت بھی ہیں۔ یوں تو نظیر اکبرآبادی کی طرح غالب کو بھی اپنے جیتے جی ناموری حاصل نہیں ہونے کا افسوس رہا لیکن بعد کے دنوں میں ان کی مقبولیت نے اردو شاعری کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ دراصل غالب کے ہمعصر شاعروں کا کلام بڑی حد تک روایتی موضوعات کا پابند تھا اور قاری اسی انداز کو پسند کرتے تھے لیکن غالب کی شاعری کا انسانی زندگی کے معمولی اور غیر معمولی رویوں کے ساتھ ایک گہرا رشتہ بھی استوار تھا جو دیگر شعرا کے یہاں ناپید تھا۔ لیکن حالات تو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی جذبات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ قاری کے سوچنے سمجھنے کے انداز بھی بدلتے ہیں۔ قاری کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ عظیم شاعری تو وہی ہوسکتی ہے جس میں تجربۂ حیات و کائنات اور رموز محسوسات کی نشاندہی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھی اور سچی شاعری قاری کی گوناگوں نفسیات کے تقاضے پوری کرتی ہے۔ غالب کے اشعار فکر کی گہرائی اور زندگی کے وسیع و عمیق تجربوں کی ترجمانی پر دال ہیں۔ اپنی شاعری کی معنویت سے متعلق غالب اپنے ایک شعر میں یوں اشارہ کرتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب! مرے اشعار میں آوے

اگر غالب کی شاعری صرف حسن و عشق تک محدود ہوتی تو ان کی شاعری سے قاری کی دلچسپی نہیں بڑھتی۔ غالب نے انسانی قلوب کی وہ کیفیات بیان کی ہیں جو چشم عالم سے پنہاں تھیں۔ دراصل غالب کی شاعری زندگی کی ہزار داستان بیان کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دو صدی گزر جانے کے بعد بھی غالب کی تخلیقی بساط قابل قدر اور قابل فخر ہے اور غالب فہمی میں تبدیلئ زمانہ کے ساتھ روز افزوں نو بہ نو جہات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جتنے قارئین، ناقدین اور شارحین ہیں اتنے ہی رنگ میں غالب ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ بقول غالب۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب کے عشق نے نہ جانے کتنے روپ بدلے، جن کے ہزاروں رنگ ان کی غزلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں لیکن وہ عشق کے لیے ذات کی فنا میں یقین نہیں رکھتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے اپنے عشق کی تکمیل چاہتے ہیں۔ زندگی کے مختلف مسائل اور حالات سے پوری واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں اور قارئین کو اپنا شریک سفر بناتے ہیں۔

عشق میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ غالب کی دیوانگیٔ عشق کی بھی یہی کیفیت ہے۔ زیرِ عنوان غزل کے مطلع سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دیوانگی سے، دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہمارے جَیب میں اک تار بھی نہیں

عشق کی حالت میں عاشق کو زنار کا پہننا لازمی ہے لیکن عشق کے جنون کا یہ عالم ہے کہ اس کے دوش پہ زنار بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنا گریبان بھی چاک کر دیتا ہے اور ایک تار بھی باقی نہیں رکھتا۔ اگر ایک تار (دھاگا) بھی باقی رہ جاتا تو وہی زنار کا کام دیتا۔

اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ عشق کے جنون میں عاشق اپنا زنار توڑ کر پھینک دیتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے گریبان کی بھی پروا نہیں کرتا اور اس کے بھی اتنے پرزے اڑا دیتا ہے کہ ایک تار بھی گریبان میں باقی نہیں رہتا۔ مرکزی خیال یہی ہے کہ غالب کے نزدیک عاشق کا مذہب صنم پرستی ہے اس لیے اس کے لیے زنار پہننا از روئے مذہب عشق لازمی ہے۔

غالب کی شاعری میں جذبات اور خیالات غیر منقسم اور لاینفک ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان پر گزرا انہوں نے بیان کردیا۔ غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ کیجیے۔

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

عاشق نے اپنے محبوب کے دیدار کی آرزو میں اپنے دل کو گھلا گھلا کر برباد کردیا ہے، لیکن بعد میں اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دیدار کی طاقت بھی نہیں ہے۔ وہ خود کو کوستا ہے۔ اپنے وقت کے برباد ہونے کا ماتم کرتا ہے لیکن اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرتا ہے جو ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

غالب کے بعض اشعار کو سمجھنے کے لیے ہمیں ذہنی ورزش کرنی پڑتی ہے۔ الفاظ کے لفظی معانی کے بجائے اس کے مجاز اور الفاظ کی ترتیب پر غور کرنا ضروری ہے۔ اسی بات کو نہ سمجھنے کی بنا پر غالب کی شاعری کو غالب کی مشکل پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بقول غالب۔

یا رب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

غالب کے ہاں سہل ممتنع کی بھی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ شعر دیکھیے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ، دشوار بھی نہیں

یہاں آسان اور دشوار جیسے ضدین کے استعمال سے تھوڑی دیر کے لیے شعر کا حل کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہے اور کہتا ہے اے محبوب! اگر مجھ سے ملنے میں دشواری ہوتی ہے یعنی تیرا ملنا آسان نہیں تو اس حالت میں صبر کرلیتا اور ملنے کی آرزو اور کوشش سے باز آجاتا۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اغیار کے لیے دشوار نہیں

صرف میرے لیے ہی دشوار ہے۔اس لیے شوق وصال کبھی ختم نہیں ہوتا۔اس شعر کو حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

اگلا شعر ملاحظہ کیجیے۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

غالب کے نزدیک زندگی بغیر عشق کے بدمزہ اور بیکار ہے۔عشق کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے لیکن عشق میں جو اذیتیں اور تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں اس کا بھی ہر انسان کو اندازہ ہوتا ہے۔عشق کی تکلیف برداشت کرنا یہاں عاشق کے لیے مشکل ہو رہا ہے لیکن عشق کے بغیر بسر کرنا بھی اسے گوارہ نہیں۔ آخر اس کا ازالہ ہو تو کیسے ہو؟ عشق نہیں کریں تو بھی مصیبت اور کریں تو سہا بھی نہیں جائے۔ یہ شعر انسان بطور عاشق کی داخلی کشمکش کو واضح کرتا ہے۔

اب غزل کا پانچواں شعر ملاحظہ کیجیے جس میں عاشق کو مختلف حالات سے گزرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر، وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

دیوانگی عشق کوئی اچھی چیز نہیں۔ عاشق عشق میں دیوانہ ہوگیا ہے۔ شدت جنوں نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔اس کی زندگی دوبھر ہوگئی ہے۔ وہ صحرا میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عشق کے جنون میں اس کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ سر بھی کندھوں پر بوجھ معلوم ہو رہا ہے۔ وہ اپنا سر پھوڑ کر مرجانا چاہتا ہے۔ وہ مجبوری کی حالت میں خدا سے مخاطب ہے کہ اگر صحرا میں کوئی دیوار نظر آتی تو میں اپنا سر پھوڑ کر سر سے نجات پا جاتا۔ یعنی دیوانگیٔ عشق میں انسان کہیں کا نہیں رہ جاتا ہے۔اس تعلق سے غالب کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں، یا رب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

اب چھٹا شعر ملاحظہ کیجیے۔

گنجائشِ عداوتِ اغیار، یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

جوانی کا زمانہ جوش وولولے کا ہوتا ہے۔اس عہد میں انسان ہر چیز کے انجام دینے پر قادر ہوتا ہے۔ جب انسان جوانی سے ضعیفی کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو اس کے تمام اعضا جواب دینے لگتے ہیں۔ چنانچہ عاشق کا دل بھی ضعف کی وجہ سے کمزور ہوگیا ہے وہ کسی کام کو انجام دینے سے قاصر ہے۔ یہاں تک کہ اس میں کثرت ضعف سے محبوب کی ہوس بھی باقی نہیں رہی۔ جب اسے سب سے عزیز چیز محبوب سے ملنا بھی ناگوار گزرتا ہے تو ایسی حالت میں اپنے دشمنوں سے عداوت کا خیال کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جوانی کے زمانہ میں انسان جو چاہتا ہے وہ کرسکتا ہے۔ اسی لیے تو حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جوانی کی عبادت جلد قبول ہوتی ہے۔ غزل کا ساتواں شعر دیکھیے۔

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

گریہ وزاری، نالہ وفریاد، شکوہ عاشق کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اس شعر میں عاشق اپنے محبوب کی بے توجہی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اپنا حال دل بیان کرتا ہے لیکن معشوق کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر اس بات کی یاد دہانی کراتا ہے کہ تجھے میرے نالہ ہائے زار سے ڈرنا چاہیے اور خدا سے خوف کھانا چاہیے کیونکہ میرے نالے مرغ گرفتار کی آواز نہیں کہ اثر نہ کریں۔ وہ ضرور اثر کریں گے۔ اسی بات کو اقبال نے یوں کہا ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

آٹھواں شعر ملاحظہ کیجیے۔

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

عاشق میں اب پہلی سی طاقت، جوش وخروش اور ولولہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ضعف سے اس کا برا حال ہے۔ یہاں تک کہ وہ کانٹے کی خلش بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارتا اور صفِ مژگاں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے (یہاں صفِ مژگاں کنایہ ہے اس سے مراد عشق کے میدان میں اترنا ہے) مذکورہ بالا شعر کے حوالے سے نظر علامہ اقبال کے اس مصرعہ کی طرف جاتی ہے یعنی ''پیری شباب ہے اگر تمنا جواں رہے۔'' اگلا شعر ملاحظہ کیجیے۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے، اے خدا!
لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

عاشق اپنے محبوب کی سادگی پر فدا ہے۔ اس بات کا احساس اسے شب وصل میں ہوتا ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے سے لڑنا شروع کردیتے ہیں۔ یہاں لڑنے سے مراد اختلاط میں ہاتھا پائی ہے۔ عاشق کو یہ ادا بہت پسند ہے۔ اس لیے وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے خدا! محبوب کی سادگی پر کون نہ مرجائے کہ وہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ (ہاتھ میں تلوار کا نہیں ہونا کنایہ ہے نزاکت جسمانی) شعر کا مرکزی خیال محبوب کی ادائے عشق پر قربان ہونا ہے۔

غالب کی شاعری میں خیالات ونظریات کے علاوہ جذبات واحساسات کا تجربہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یعنی غالب دل اور دماغ دونوں کے شاعر ہیں۔ ایسے مقام پر غالب نفسیات سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیے۔

دیکھا اسد کو خلوت وجلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

اس شعر میں غالب اپنی نفسیاتی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی وہ دیوانہ ہے یا ہوشیار کے اختلاف کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود جواب دیتے ہیں کہ اگر آپ مجھے دیوانہ نہیں کہہ سکتے چونکہ میں اپنے ساتھ ایک مقصد رکھتا ہوں، تو مجھے ہوشیار بھی نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ مجھے خلوت اور جلوت یعنی محفلوں اور تنہائی دونوں جگہوں میں پایا گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مجھے دیوانہ نہیں کہہ سکتا تو مجھے ہوشیار بھی کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ میری ساری زندگی حماقتوں سے پُر ہے۔

غالب کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ہمارے دل ودماغ دونوں کی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ وہ ہر بار ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے یہاں بلند مضامین سے لے کر عام زندگی کے موضوعات تک کا اظہار ملتا ہے جس طرح ان کی شادمانی کا ایک معیار ہے، اسی طرح ان کے غم کا بھی ایک معیار ہے۔ انسانی جذبات واحساسات کے ان گوشوں کو ابھارنے کی کوشش ان کی شاعری میں ملتی ہے جو ہر نسل اور ہر طبقے میں مشترک ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ غالب کے مشکل اشعار سے بھی قاری کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہوگا کہ غالب کی شاعری ہر زمانے میں بامعنی اور پرکشش رہے گی اور حالات کے مطابق ہر عہد میں اپنی شعری اہمیت کا احساس دلاتی رہے گی۔

مختصر یہ کہ غالب نے اردو غزل کو نازک اور لطیف احساسات وجذبات کے ساتھ تفکر اور تفلسف نیز زندگی کے گہرے سوالات سے روشناس کرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے فنکاروں نے فکری اور ذہنی طور پر ان سے فیض حاصل کیا ہے اور آج بھی نئی نسلوں پر ان کی شاعری کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہی۔ کہہ سکتے ہیں کہ آج جب بھی سنجیدگی سے ان کی شاعری پڑھی جائے گی گنجینۂ معنی کا ایک نیا دفتر ہمارے سامنے وا ہو جائے گا۔

■

Dr. Abu Zaheer Rabbani
Dept of Urdu, Dyal Singh College
Lodhi Rd, Pragati Vihar
Delhi 110003

غلام نبی کمار

اردو زبان میں سائنسی صحافت

(صورتِ حال، تقاضے اور امکانات)

ہندوستانی اخبارات وجرائد میں مختلف موضوعات کا خزینہ ہوتا ہے۔ بعض اخبارات میں موضوعات مختص رکھے جاتے ہیں۔ ان اخبارات میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی خبریں، انسانی زندگی سے متعلق تمام خبریں، سیاست، تہذیب وتمدن، اداریے، تعلیم، ملازمت، پیدائش وموت، تقریب یوم پیدائش، جرائم، کارٹون، اشتہارات، مضامین، سیاسی، سماجی اور معاشی خبریں، ادبی و مذہبی مضامین، طب، سائنس، ٹکنالوجی، فلموں اور کھیلوں کی خبریں، شہروں اور مختلف اضلاع کی سرگرمیاں، زرعی خبریں، سیمینار، جلسے، موسم کے حالات، تجارت اور صنعت وحرفت کی خبریں وغیرہ شائع ہوتی ہیں۔ غرض کہ اخبارات میں زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اردو صحافت وہ چاہے اخباری صحافت ہو یا مجلاتی صحافت، میں سائنسی موضوعات کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اردو صحافت سائنسی مضامین سے یکسر خالی ہے۔ سائنسی موضوع کو علمِ ریاضی کی طرح خشک موضوع سمجھا جاتا ہے اس لیے شاید سائنسی موضوع میں کم دلچسپی کی یہ بھی ایک وجہ رہی ہو۔ تاہم اخبارات میں شاذ و نادر ہی سہی سائنسی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ سائنسی مضامین جن ہندوستانی اخبارات میں نظر سے گزرتے رہتے ہیں ان میں انقلاب، راشٹریہ سہارا، کشمیر عظمیٰ، میرا وطن، قومی تنظیم، ہمارا سماج، نیا نظریہ، اخبار مشرق، سیاست، منصف، صحافی دکن، اودھ نامہ، آگ، صحافت، تاثیر، سیاسی تقدیر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ راقم الحروف کے مشاہدے میں آیا ہے کہ بیرونی ممالک میں سائنس کے حوالے سے جو تحقیق ہوتی رہی ہے اُس کی رپورٹیں بعد میں اُن ممالک کے سفارت خانوں کے توسط سے یو این آئی، آر این آئی اور دیگر نیوز ایجنسیوں کے ذریعے ہندوستانی اردو اخبارات میں ترجمے کے ساتھ شائع ہوتی آئی ہیں۔ اس کے علاوہ ماحول، صحت، جغرافیۂ طبعی، غذا، امراض، آلودگی، شکاریات، جنگلاتی وسائل، توانائی، آب و ہوا، آبی ذخائر، سائنسی ایجادات، کیمیات، طبعیات، حیاتیات، نباتات، ریاضی، قدرتی فلسفہ اور دوسری کارآمد سائنسی معلومات وغیرہ سے متعلق مضامین بھی اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ اب بعض اخبارات نے دیگر موضوعات کی طرح سائنسی موضوع کے لیے بھی اخبار کا ایک صفحہ مختص کرلیا ہے۔

اردو میں سائنسی صحافت کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں بھی صورتِ حال زیادہ بہتر نہیں ہے۔ البتہ کچھ مخصوص رسالے سائنس کے حوالے سے شائع ہوتے ہیں جن سے سائنسی صحافت کو فروغ ملا اور سائنسی میدان سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور قلم کاروں کو سائنس کے مختلف النوع موضوعات پر لکھنے کی ترغیب ملی۔ اس قسم کے رسائل و جرائد میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کا ماہ نامہ سائنس، سائنس کی دنیا، اسلم پرویز کی ادارت میں شائع ہو رہا رسالہ سائنس، ہمدرد صحت، رسالہ ہندوستانی، رسالہ خدنگِ نظر، روحانی سائنس، سائنس کی کائنات، رسالہ طبعی سائنس، رسالہ خاتون، رسالہ کیمکل سوسائٹی، طبیہ کالج میگزین، رسالہ حیوانیات (شعبہ حیوانیات علی گڑھ مسلم یونی ورٹی)، سائنس اور کائنات ٹائمز، سائنس اور کائنات، آیات وغیرہ شامل ہیں۔

ہندوستان کے وہ قدیم اردو رسائل جن میں سب سے پہلے سائنسی مضامین شائع کیے جاتے تھے اور ترجیح دی جاتی تھی اس میں پندرہ روزہ رسالہ 'فوائد الناظرین' بھی قابل ذکر ہے جس کے ایڈیٹر دہلی کالج کے استاذ اور علم ریاضی کے امام ماسٹر رام چندر تھے۔ 'فوائد الناظرین' میں علمی، تاریخی اور سائنسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس میں سلسلہ مضامین طبیعات، بیان پن چکی کا، علم ہیئت، بیانات حیوانات کا، انسان کی عقل کا بیان، حال جانوروں عجیب کا، معرفت طبعی، مقناطیس بنانے کی ترکیب، حال ستارہ مشتری کا، مریخ ستاروں کا بیان، وجود کیڑوں کا پانی میں وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت مضامین کی اشاعت ہوتی رہتی تھی۔ رسالہ ''خیر خواہ ہند اور محبّ ہند'' کو بھی ابتدائی رسائل میں سائنسی صحافت کے حوالے سے اولیت حاصل ہے۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر ہی تھے۔ 'محبّ ہند' میں بھی سیاسی، تاریخی اور سائنسی معلومات کے علاوہ ہم عصر شعرا اور اساتذہ کا منتخب کلام ملتا ہے۔

اردو کی ادبی صحافت ہو یا سائنسی صحافت سر سید احمد خاں کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔ سر سید احمد خان کا نام اردو کی سائنسی صحافت کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے

جنھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے سائنس جیسے سنجیدہ اور بہت ہی مفید موضوع کو عام کیا۔ یہ رسالہ دسمبر 1870 کو جاری ہوا۔ 'تہذیب الاخلاق' میں علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سائنسی نیز دیگر مضامین کے شائع ہونے سے اردو صحافت میں انقلاب پیدا ہوا۔ اس رسالے میں سائنسی علوم وفنون پر مضامین کو اہمیت کے ساتھ جگہ دی گئی اور اس موضوع پر لکھنے والوں میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، عنایت اللہ، محمد ابوالحسن وغیرہ شامل تھے۔ یکم ربیع الثانی سنہ 1312ھ کے شمارے میں عنایت اللہ کا سائنسی موضوع پر لکھا گیا ایک مضمون بعنوان 'نیچرل سینٹر کے عجائبات' کے تحت شائع ہوا۔ جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''ہم اپنی دوربینوں کے ذریعہ سے جواب کمال کے درجے کو پہنچ گئی ہیں چاند کی مفصل کیفیت اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں اور اس کا ایسا امتحان کر سکتے ہیں جیسے زمین پر کسی دور کی چیز کو دیکھیں۔ اس لیے ہم ایک خاص حد تک اس کی طبعی کیفیت کو بخوبی معلوم کر سکتے ہیں۔''[1]

'تہذیب الاخلاق' کے سائنسی موضوعات اور مواد کے حوالے سے پروفیسر شافع قدوائی لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق کا اجرا مسلمانوں کی جدید سائنس کی جانب بے رغبتی کو ختم کرنے کے لیے ہوا اور اس نے سائنسی اصولوں اور نئی دریافتوں سے متعارف کروایا۔ اس کا سائنسی دریافتوں پر اصرار لمبے وقفے تک مسلمانوں میں سائنس وٹکنالوجی کے تئیں رغبت پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ تہذیب الاخلاق کے مطابق سائنسی علوم سے روشناسی تعلیمی، تہذیبی اور دانشوری کو نئی زندگی عطا کرنے میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔''[2]

سرسید کی کاوشوں اور سائنس کے تئیں ان کی عملی جستجو سے تہذیب الاخلاق باضابطہ طور پر پہلا رسالہ بنا جس میں سائنسی تعلیم اور سائنس سے متعلق کئی اہم موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔ ہندوستان کے سربرآوردہ اردو شاعر اور معروف سائنسی صحافی پنڈت گلزار زتشی دہلوی اپنے ایک تحریر کردہ مضمون 'اردو سائنسی صحافت ایک سرسری جائزہ' میں سرسید کی سائنسی صحافتی خدمات کا اعتراف نہایت ہی نفیس اور شائستہ الفاظ میں کرتے ہیں:

''آخر مردے از غیب بروں آمد' کی مصداق سرسید احمد خاں' اس بسیط صحرائے ادب میں نخلستانِ سائنس کی دریافت کو نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس ضمن میں اُس دور کے حالات و وسائل اور اقدار و روایات، عقیدے اور نظریوں کے موجود ہجوم میں اور توہم پرستی کے دور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ کچھ کتابیں سائنسی علوم پر تصنیف وتالیف کرائیں۔ کچھ تراجم ہوئے، چند سائنسی مضامین لکھے گئے اور ان کے رسالے 'تہذیب الاخلاق' میں سائنسی موضوعات وعلوم پر کچھ قلم آزمائی کی گئی۔ اس طرح سید احمد خاں نے اردو والوں کو ایک نئی ڈگر پر ڈالا اور سائنسی تحریروں پر کچھ توجہ کرنے کی بسم اللہ ہوئی۔''[3]

گلزار دہلوی نے اس مضمون میں ماقبل آزادی اور بعد از آزاد ہندوستان کی سائنسی صحافت کے بارے میں ہر ممکن تحقیقی جانکاری فراہم کردی ہے جو کسی بھی محقق کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ انھوں نے دونوں وقتوں میں ہندوستان میں سائنسی صحافت کی صورتِ حال سے مکمل طور پر آگہی دلائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ 1917 سے لے کر 1947 تک سائنسی صحافت کے تعلق سے نظام حیدرآباد کے ایماء پر دارالترجمہ اور دارالاشاعت' حیدرآباد فرخندہ باد سے ایک منظم، اعلیٰ پیمانے اور بلند معیار کی ایک اہم پہل ہوئی۔ جہاں زبان وفلسفہ کے علمی و ادبی، عالی دماغ جمع کیے گئے، وہیں اس کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم وکتب کا ترجمہ اور اصطلاحات سائنس کا ترجمہ بڑے پیمانے پر عمل پذیر ہوا۔ کیمیا، طبیعات، نباتات، ادویات، نجوم، ہیئت، ریاضی، حساب و ہندسہ، جغرافیہ، علم الارض، علم الحیوانات، انجینئرنگ وغیرہ بے شمار علوم کے نصابی ترجمے کیے گئے اور اصطلاح سازی ہوئی۔ آٹھویں سے ایم۔اے تک بلکہ پی۔ایچ۔ڈی تک اردو ذریعہ تعلیم کا کامیاب ترجمہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ مختلف اخبارات اور رسائل میں سائنسی مضامین لکھے جانے کی روایت کا آغاز ہوا اور ملک کو اور اردو معاشرے کو اردو سائنسی صحافت اور اردو سائنسی ذریعہ تعلیم ومطالعہ کی طرف راغب کیا گیا۔

ماسٹر رام چندر، سرسید اور نظام حیدرآباد کے بعد سائنسی صحافت کو فروغ دینے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمات کو بھی قطعی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ساتھ مشترکہ اور غیر منقسم ہندوستان میں پہلے اورنگ آباد اور حیدرآباد اور پھر 1938-1939 سے 1947 تک انجمن ترقی اردو (ہند) دلّی سے اردو میں سائنس کا کام کیا اور ایک خالص سائنسی رسالہ 'سائنس' شائع کیا۔ جس کے ذریعے بہت عرصے تک سائنسی مضامین شائع کیے گئے اور دیگر سائنسی علمی و ادبی سرگرمیوں کی اشاعت وتشہیر ہوتی رہی۔ آزاد ہندوستان میں اردو سائنسی صحافت کی باقاعدہ شروعات مجلّہ 'سائنس کی دنیا' سے ہوئی۔ جس کا پہلا شمارہ 20/جون 1975 میں شائع ہوا اور راشٹر پتی بھون میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند کے بدست اس کا اجراء عمل میں آیا۔ 'سائنس کی دنیا' سہ ماہی رسالہ ہے جس کے پہلے مدیر پنڈت زتشی گلزار دہلوی تھے۔ یہ ایک سائنسی رسالہ ہے جس میں اردو داں عوام وطلبہ کے لیے مفید عوامی اور دلچسپ سائنسی معلومات، سائنس وتکنیکی ترقیاں، نئی نئی ایجادوں، عام طالب علموں اور جستجو کاروں کے لیے بہترین مضامین شائع ہوتے ہیں۔ سائنسی خبریں، عوام کی سائنس، سائنسی مشغلے، جرائم اور سائنس، سائنسی کہانیاں، سائنسی ادارے وغیرہ اس کے موضوعات ہوتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں بہترین سائنس داں، دانشور، ماہر تعلیم، ریسرچ کرنے والے اور سائنسی فکر کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ مجلّہ آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

ماہنامہ 'سائنس' دہلی سے اسلم پرویز کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے جو سائنسی خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اس سائنسی جریدے کے بانی ومدیر ہیں اور یہ رسالہ انھی کی فکر اور سوچ کا نتیجہ ہے جو اتنے برسوں تک بغیر کسی سرکاری معاونت کے شائع ہو رہا ہے۔ اس جریدے میں ہر قسم کے سائنسی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اردو سائنسی صحافتی سرگرمی کو برقرار رکھنے اور اسے جاودانی عطا کرنے میں ماہنامہ 'سائنس' ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے 'سائنس' کے پچیس سال مکمل ہوتے ہی ڈاکٹر محمد کاظم کی کتاب 'اشاریہ ماہنامہ سائنس' کے اجرا کے موقعے پر غالب اکادمی، دہلی میں رسالے کے اغراض ومقاصد کے حوالے سے کہا تھا کہ یہ ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ اردو میں سائنس کو فروغ دینے کی ایک اہم تحریک ہے۔ جس کا مقصد مکمل علم اور دین

کی دعوت دیتا ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی سائنسی علوم سے دوری پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ قرآن کی چند آیتوں ہی کو مکمل اسلام سمجھے ہوئے ہیں۔ جب کہ قرآن مسلمانوں کو کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ جب قانون دین میں شامل ہے تو قانونِ فطرت علم دین سے الگ کیسے ہوسکتا ہے؟۔ ڈاکٹر عزیر اسرائیل نے 'اشاریہ ماہنامہ سائنس' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد کاظم کا اقتباس نقل کیا ہے جس سے قارئین 'سائنس' کے موضوعات و مشمولات سے آگاہ ہوسکتے ہیں:

''سائنس اور ماحولیات سے متعلق ایسے کون سے موضوعات ہیں جن پر یہاں مضامین شامل اشاعت نہیں ہوئے۔ بلکہ روزمرہ میں پیش آنے والی بیماریوں کی وجوہات اور ان کا علاج، ہمارے ماحول کا بدلتا مزاج اور اس کے اثرات، سائنس خبرنامہ، سائنس کوئز، ستاروں کی دنیا، روشنی کی باتیں، روشنی کا جھکاؤ، روشنی کی واپسی، روشنی کی نظر بندی، زمین کے اسرار، سفیران سائنس، عظیم ایجادات، سمندری حیات، مچھلیوں کی دلچسپ باتیں، جانوروں کی دلچسپ کہانیاں، جانوروں کی عادات و اطوار، بلیک ہول، قرآن اور سائنس، نفسیاتی مسائل ورک شاپ، وزن کے مسائل، انسانی حس اور اس کا اظہار، مشینوں کی بغاوت، صفر سے سو تک، علم کیمیا کیا ہے؟ علم نجوم، غذا میں چکنائی، غذا کی اہمیت، ہمارا جسم، طب، ریاضیات، پانی، زراعت، معلومات عامہ، کمپیوٹر، مقناطیسیت، کیا آپ جانتے ہیں؟ کب کیوں اور کیسے؟ سوال و جواب اور اس طرح کے بہت سارے موضوعات اور مسائل پر نہ صرف ایک سے زیادہ مضامین اور اندراجات موجود ہیں بلکہ وقفے وقفے سے ان موضوعات پر سلسلہ وار مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔''[4]

اس اقتباس سے اردو کے عہد ساز ماہنامہ 'سائنس' کے مزاج و منہاج کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس رسالے کی سائنسی صحافتی خدمات کو تاریخ کے سنہرے پنوں میں مرقوم و محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں اس کے علاوہ متعدد ادبی و نیم ادبی رسالے ہیں جن میں بسا اوقات سائنسی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں ماہنامہ آجکل، اردو دنیا، بچوں کی دنیا، ماہنامہ امنگ، نیا کھلونا، تعمیر فکر، ذہن جدید وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہنامہ 'آجکل' ایک معیاری اور مستند رسالہ مانا جاتا ہے۔ اس میں سائنسی مضامین کے شائع ہونے کی روایت سے متعلق مشہور محمد خلیل ایک مضمون 'آجکل میں سائنسی ادب' کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''اس مشہور رسالہ کے بارے میں مجھے سب سے

اردو کے جن سائنسی صحافیوں نے سائنسی معلومات کو عام کیا اور اپنی زندگی سائنس کی تشہیر و تبلیغ میں گزار دی اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ان میں ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں، مولانا ابولکلام آزاد، گلزار دهلوی، ڈاکٹر اسلم پرویز، محمد خلیل، منظو الامین، پروفیسر عبد المعز شمس، ڈاکٹر عبید الرحمان، اسعد فیصل فاروقی، احمد علی برقی اعظمی (سائنسی نظمیں)، انیس الحسن صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پہلے مرحوم چچا جان (پروفیسر محمد شفیع عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں) نے بتایا اور اس میں مجھے سائنس پر لکھنے کی توجہ دلائی۔ اُس زمانہ میں اردو کے کئی رسالے کھلونا، پیام تعلیم، گل بوٹے کئی اور بچوں کے مشہور رسالے تھے۔ جب کہ 'آجکل'، 'یوجنا'، 'نیا دور'، 'سب رس'، 'کتاب نما'، 'قومی راج' بڑوں کے لیے تھے۔ لیکن اُن میں کبھی کبھی کوئی مضمون سائنس پر بھی ہوتا تھا۔ اس طرح سائنس کے مواد کو آجکل اردو نے شروع سے ترجیح دی ہے۔ اسی زمانہ میں مدیر شہباز صاحب کی ادارت میں اکتوبر۔ نومبر 1978 کا خصوصی شمارہ 'جنگلی جانوروں' پر شائع ہوا تھا جو رمیش بیدی، ڈاکٹر سالم علی، نند کشور وکرم، ریحان احمد عباسی اور کئی دوسری شخصیات کے مضامین سے آراستہ تھا۔ جسے اردو قارئین نے بے حد سراہا تھا۔''[5]

محمد خلیل کے مضمون سے لیا گیا درج بالا اقتباس اس بات کا ثبوت ہے کہ آجکل میں بھی سائنسی مضامین کی اشاعت کی روایت رہی ہے۔ یہ بھی کہ آجکل میں ایک اہم سائنسی موضوع جنگلی جانوروں کے بعنوان خصوصی شمارہ بھی شائع ہوا تھا۔ آجکل کے ڈائمنڈ جوبلی نمبر میں محمد خلیل کا مضمون 'آجکل میں سائنسی ادب' میں مذکورہ خصوصی شمارے کے تقریباً تمام مضامین کا بے حد عمدگی اور شائستگی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

جس کثرت سے اردو اخبارات اور رسائل و جرائد میں دیگر علمی و ادبی اور سیاسی و سماجی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں یا بحث و مباحثے ہوتے ہیں، برعکس اس کے سائنسی میدان میں فی الوقت تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ، ریاضی، کیمیا، خلائی سائنس، نیوکلیر ایزجی، بعض مہلک بیماریوں اور آلودگیوں وغیرہ سے متعلق ہمارے یہاں کتب کی عدم دستیابی پریشانی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اس لیے ہندوستان کے سائنس دانوں اور سائنسی علوم کے ماہرین کو اس ضمن میں پیش قدمی کرنی چاہیے تاکہ اس شعبے میں موجود خلا کو دور کیا جاسکے۔ راقم الحروف نے اس مضمون میں جن سائنسی رسائل کا نام لیا ہے۔ ان میں بیشتر کی مدتِ اشاعت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

اردو کی سائنسی صحافت کا اہم اور قابل ذکر پڑاؤ برقی صحافت کا ہے۔ جس میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن ایک ناقابل فراموش کردار ادا کر رہا ہے۔ ان دونوں نشریاتی اداروں کے ذریعے مختلف موضوعات پر اردو کے سائنسی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے جاتے ہیں۔ جس سے سائنس کی معلومات سماج کے ہر فرد تک بذریعہ ٹی۔ وی اور ریڈیو کے مختلف چینلوں اور اسٹیشنوں کی وساطت سے پہنچ جاتی ہے۔ ان دونوں کے توسط سے صحت، معاش، زراعت، ٹکنالوجی اور سائنس کے مختلف شعبہ ہائے جات سے متعلق آگہی اور معلومات کی ترسیل عام و خاص دونوں طبقوں تک بہ آسانی ہوجاتی ہے۔ مزید ان دونوں مذکورہ نشریاتی اداروں سے ڈاکٹر آن لائن، کرشی درشن، ڈسکوری چینل، ماہرین کے مختلف سائنسی موضوعات پر لیکچرس، صحت اور امراض سے متعلق مختلف پروگرامز وغیرہ براڈ کاسٹ کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام پروگرام اردو میں بھی ہوتے ہیں اور دوسری زبانوں میں بھی۔ اس طرح ان تمام کے ذریعے سائنسی پیغامات اور سائنسی جانکاری کی کامیاب ترسیل ممکن ہو پاتی ہے۔

اردو کے جن سائنسی صحافیوں نے سائنسی معلومات کو عام کیا اور اپنی زندگی سائنس کی تشہیر و تبلیغ میں گزار دی اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ان میں ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، گلزار دہلوی، ڈاکٹر اسلم پرویز، محمد خلیل، منظو الامین، پروفیسر عبدالمعز شمس، ڈاکٹر عبیدالرحمان، اسعد فیصل فاروقی، احمد علی برقی اعظمی (سائنسی نظمیں)، انیس الحسن صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حوالہ جات

(1) بحوالہ علی گڑھ کے جرائد کا تاریخی اور صحافتی مطالعہ از اسعد فیصل فاروقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی طبع دوم 2017، ص 39

(2) ایضاً

(3) اردو صحافت از مرتب انوار دہلوی، مشمولہ اردو کی سائنسی صحافت از گلزار زتشی دہلوی، اردو اکادمی دہلی طبع چہارم 2009، ص 285

(4) بحوالہ: اردو ریسرچ جرنل، جلد 3، شمارہ 10، جنوری تا جون 2017، ص 67

(5) بحوالہ ماہنامہ آجکل، ڈائمنڈ جوبلی نمبر، جلد 75، شمارہ 12، جولائی 2017، ص 24۔

■

Ghulam Nabi Kumar
Kumar Mohalla, Charari Sharief,
Budgam-191112 (J&K)
Mob: 7053562468

قیسم اختر

غلام محمد یحییٰ

اپنی ذات میں ایک انجمن

غلام محمد یحییٰ ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے سماجی اور ادبی سطح پر بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ دوسری طرف وہ ایک صوفی اور ولی بھی تھے۔ ہمارے لیے غور وفکر کی بات یہی ہے کہ انھوں نے ایک طرف اپنے مالک حقیقی سے پورے طور پر لو لگائے رکھا اور دوسری طرف ادب اور سماج کی خدمت میں بھی بھرپور طور پر مصروف عمل رہے۔ ایسی شخصیتیں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں فراموش کرنا ناسپاسی اور ناقدری ہوگی۔

غلام محمد یحییٰ کو ہم سے جدا ہوئے بہت دن نہیں ہوئے۔ یہی کوئی سات سال۔ ان کی یادیں آج بھی بہت سے دلوں میں بالکل تازہ ہوں گی اور رہیں گی۔ چونکہ غلام محمد یحییٰ کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ انھیں فراموش کردیا جائے۔

غلام محمد یحییٰ یکم جنوری 1951 کو بیگانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ والد نے ان کا نام شمس الضحیٰ محمد یحییٰ رکھا تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنا نام خود غلام محمد یحییٰ رکھ لیا اور اسی نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔ ان کے والد منشی توحید حسین بذات خود ذی علم اور باشعور انسان تھے۔ مدرسی ان کا پیشہ تھا اور اپنی علمی لیاقت وصلاحیت کی بدولت علاقے میں مشہور تھے۔ غلام محمد یحییٰ کی والدہ ماجدہ کا نام زینب تھا اور وہ نواب غلام شہید (اندھوا کولہا) کی دختر نیک تھیں۔ غلام یحییٰ کے بڑے ابا جوان کے خسر بھی تھے حکیم تجمل حسین پورنیہ کشنری کے معروف حکیم اور صوفی تھے۔ ان کے مریدوں کا سلسلہ بہار، بنگال اور نیپال تک پھیلا ہوا ہے۔ حکیم تجمل حسین کے بعد غلام محمد یحییٰ سجادہ نشیں ہوئے۔ غلام یحییٰ کی شخصیت کی تعمیر وتربیت میں تجمل حسین کا بڑا عمل دخل تھا۔ غلام یحییٰ کے بھائی ماسٹر ظہیر انور بھی ایک معروف شاعر ہونے کے ساتھ سماجی کارکن بھی ہیں۔ یہ بات آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ اس شجر ثمر آور سے مزید گل بوٹے کھلنے والے ہیں کیوں کہ ان کے صاحبزادے خالد مبشر ایک نامور شاعر اور ناقد کی حیثیت سے اردو دنیا میں متعارف ہیں اور وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو میں پروفیسر ہیں۔

غلام محمد یحییٰ کی شخصیت پر جن دو شخصیات کا گہرا اثر پڑا، وہ ہیں نامور شاعر مایۂ ناز ناقد اور ناول نگار شمس بمن گرامی جو ان کے استاد تھے اور دوسرے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ان کے بڑے ابا سجادہ نشیں حکیم تجمل حسین۔ ان دو شخصیات کے زیر سایہ تربیت پاکر غلام محمد یحییٰ ایک شجر ثمر آور بنے تھے۔ سیمانچل کی تاریخ میں وہ ایک ایسی معتبر شخصیت کے طور پر جانے اور رمانے جاتے ہیں جنھیں فراموش کرنا سیمانچل کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ غلام محمد یحییٰ ایک شاعر ادیب اور صوفی ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک انقلاب کے نقیب بھی تھے۔ سیمانچل کی معروف اور کامیاب عوامی تحریک سماج سدھار کرانتی سمیتی کے وہ روح رواں بھی تھے جس کی بدولت سیمانچل میں ایک بڑا کام ہوا۔ غلام محمد یحییٰ بھی معلمی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ انھیں علم عروض میں مہارت حاصل تھی اور مدرسے میں علم عروض پڑھایا کرتے تھے اور وہ ایک معتبر اور مقبول استاد تھے۔ غلام محمد یحییٰ کے اندر ایک خوبی اور تھی اور وہ تھی حکیمی۔ اس فن میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ لیکن قضا کسے چھوڑتی ہے۔ غلام محمد یحییٰ بھی 27 فروری 2011 کو اس دار فانی سے کوچ کرکے مالک حقیقی سے جا ملے۔

غلام محمد یحییٰ نے بھرپور انداز میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نعت، حمد، رباعی اور سانیٹ کے فن سے بھی ان کا واسطہ رہا۔ خصوصاً نعتیہ کلام میں خوب جوہر دکھائے ہیں۔ غلام یحییٰ کی شاعری پر علامہ اقبال کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ خود ایک صوفی تھے اور انسانیت کی فلاح وبہبود چاہتے تھے تو وہ بھلا اقبال سے کیوں متاثر نہ ہوتے۔ ہر شاعر اپنی استعداد کے مطابق بڑی شخصیتوں سے متاثر ہوتا ہے اور اثرات بھی قبول کرتا ہے۔ لیکن دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کیا غلام

> غلام محمد یحییٰ ایک شاعر ادیب اور صوفی ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک انقلاب کے نقیب بھی تھے۔ سیمانچل کی معروف او رکامیاب عوامی تحریک سماج سدھار کرانتی سمیتی کے وہ روح رواں بھی تھے جس کی بدولت سیمانچل میں ایک بڑا کام ہوا۔ غلام محمد یحییٰ بھی معلمی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ انہیں علم عروض میں مہارت حاصل تھی اور مدرسے میں علم عروض پڑھایا کرتے تھے اور و ہ ایک معتبر اور مقبول استاد تھے۔ غلام محمدیحییٰ کے اندر ایک خوبی اور تھی اور وہ تھی حکیمی۔ اس فن میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے۔

محمد یحیٰ نے اقبال کی تقلید محض کی ہے یا ان کے پاس اپنا بھی کچھ تھا۔ آیئے ان کی نظم 'باطل کے مقابل میں' کے دو بند ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اقبال سے متاثر ہونے کے باوجود وہ کس طرح ان سے الگ ہیں۔

اے صاحب اسرار خداوند ذوالجلال
آتی ہے صدا پردۂ گردوں سے دمادم
تو وہ کہ تیری زندہ ضمیری تھی بے مثال
تو وہ کہ بصد حیف ترا آج یہ عالم
توحید کی لے سے ہیں تیری مسجدیں خالی
تومست سجانے میں ہے محراب کی جالی
آجائے کسی روح کو لرزش تو کہاں سے
کچھ تیری اذانوں میں نہیں سوز بلالی

ان اشعار کو پڑھ کر اقبال کا اثر محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن ذرا ٹھہریئے کہ بظاہر دمادم اور ضمیری جیسے الفاظ میں اقبال کا رنگ ہے لیکن اس کی روح میں غلام محمد یحیٰ کے دل کی کسک بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ اقبال کے عہد سے نہیں بلکہ اپنے عہد کے حالات سے نالاں ہیں۔ اقبال اگر کہتے کہ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی تو غلام یحیٰ اس سے آگے بڑھ کر یہ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہم نے خود روباہ کو یہ موقع فراہم کیا ہے وہ زمام کار سنبھالے۔ یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تیرگی صبح ثقافت کی جگہ لیتی ہے
قوم آوارہ شرافت کی جگہ لیتی ہے
شیر جب نیند کی مستی میں ہوا ہوتا ہے
روبہی مفت امامت کی جگہ لیتی ہے

غلام محمد یحیٰ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے اور انسانوں کی حالت زار سے ان کا دل پیچ وتاب کھاتا تھا۔ آپ وہ واقعہ یاد کریں جب پولیس نے بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مویشی کے تاجروں پر گولی باری کردی تھی۔ یہ ایک ظالمانہ انکاؤنٹر تھا۔ اس وقت تحریک سماج سدھار کرانتی سمیتی شباب پر تھی اور غلام محمد یحیٰ سرگرم عمل تھے۔ انھوں نے ان حالات سے متاثر ہو کر بڑے اچھے انداز میں پولیس کی یکطرفہ کارروائی پر انگشت نمائی کی تھی۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ اقبال کی وہ لفظیات ترک کر چکے ہیں جو ان کی پہچان ہے بلکہ غلام یحیٰ کا قلم ان کی زبانی ان کے دل کی ترجمانی کر رہا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گولیاں سینۂ انساں پہ چلانے والو
خون اس امن کی دھرتی پہ بہانے والو
یک بہ یک تم کسی وحشت پہ نہ اترے ہوتے

غلام محمد یحییٰ اپنے سینے میں ایک در دمند دل رکھتے تھے اورانسانوں کی حالت زار سے ان کا دل پیچ و تاب کھاتا تھا. آپ وہ واقعہ یاد کریں جب پولیس نے بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مویشی کے تاجروں پر گولی باری کردی تھی.یہ ایک ظالمانہ انکاونٹرتھا.اس وقت تحریک سماج سدھار کرانتی سمیتی شباب پرتھی اور غلام محمدیحییٰ سر گرم عمل تھے. انھوں نے ان حالات سے متاثر ہوکر بڑے اچھے انداز میں پولیس کی یکطرفہ کارروائی پر انگشت نمائی کی تھی.یہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ اقبال کی وہ لفظیات ترک کرچکے ہیں جو ان کی پہچان ہے بلکہ غلام یحییٰ کاقلم ان کی زبانی ان کے دل کی ترجمانی کر رھاہے.

ہم اگر قتل سے پہلے ہی یہ سوچے ہوتے
جانے بیوہ کی شب زیست کیوں کر بسر ہوگی
درد فرزند میں روتوں کی کیوں کر سحر ہوگی

ہم تو سمجھے تھے محافظ ہو حفاظت ہوگی
کیا خبر تھی کہ تمھیں ہم سے عداوت ہوگی
تو تو رکشک کے لبادے میں لٹیرے نکلے
صبح کے روپ میں راتوں کے اندھیرے نکلے

غلام محمد یحیٰ کے یہاں رومانی شاعری بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں وہ رومانیت کی جھلک ملتی ہے جو اسرار الحق مجاز اور ساحر لدھیانوی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی جوش ملیح آبادی کا سا انداز تکلم بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

تیرا ملبوس وفا تیری ادا شرح نیاز
تیرے ہر انگ میں آدم کی تمنا کا گداز
حسن اول کی ودیعت پہ نظر ساز دمک
تیرے ہر سانس میں مریم کے تقدس کی مہک
تیرے عارض، تیری آنکھیں، تیری سیمائے حسیں
صبح کا ذکر کیا جائے تو تو یاد آئے
برق گرتی ہے تیرے جسم کی انگڑائی سے
تیری ہستی سے فروزاں ہے شبستان وجود
تو اگر چھیڑ دے شائستہ سا اگر نغمہ کوئی
دفعتاً ٹوٹ کے رہ جائے زمانے کا جمود
تو اگر اپنی نمائش نہ کرے عام تو پھر
ساری دنیا تیری عفت کے ترانے گائے
حسن کا نام لیا جائے تو تو یاد آئے

یہ بند دیکھیں جس میں جوش کا انداز تکلم اور لفظیات کا عکس دکھائی دے گا۔

جان من صورت حال مگر ٹھیک نہیں
آہوئے شوق ہے محصور تقاضائے حیات
چاہ کی راہ میں ہے کاہش دوراں حائل
کشتۂ درد ہو ممکن ہے محبت کی برات
کاش دریا کے کناروں کو میسر ہو ملن
ڈوبتی ناؤ کسی طور بھنور سے نکلے
ہوں دعا گو کہ اتر جائے حوادث کا گہن
پیار کا چاند اندھیروں کے اثر سے نکلے

س سے پتہ ملتا ہے کہ غلام محمد یحیٰ اپنے آخری دنوں میں شکیل بدایونی سے متاثر تھے۔ انہوں نے بہادر گنج کے ایک نوعمر شاعر جہانگیر نایاب سے کلیات شکیل بدایونی منگائی تھی اور اس کا مطالعہ کیا تھا۔ ان دنوں وہ صاحب فراش تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو رہے تھے۔ شکیل کے معروف مصرعہ

مرے ہم نفس میرے ہم نوا مجھے درد دل کی دوا نہ دے

کی تضمین کی تھی۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

میرا حال نہ پوچھ بے وفا مجھے بولنے کی سزا نہ دے
مجھے ضبط غم نے گھلا دیا میرا غم کسی کو خدا نہ دے

ان باتوں سے الگ ہٹ کر غلام محمد یحیٰ کے کلام میں ان کا دردمند دل موجود نظر آتا ہے۔ اور ان کا اپنا انداز بھی ہے۔ اور ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔ کیوں کہ کسی بھی شاعر کی یہ پہچان نہیں ہوتی کہ اس نے کس بڑے شاعر کی پیروی کی ہے۔ یوں تو غالب نے بھی بیدل کا طرز اختیار کرنا چاہا۔ میر کی استادی کی داد بھی دی۔ ابتدائی دنوں میں غالب نے یہ بھی کہا کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

لیکن بعد میں غالب نے اس راہ بر کو پالیا۔ وہ خود اس کی اپنی ذات تھی۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غلام محمد یحیٰ کے یہاں مختلف استاد شعرا کا رنگ گاہے گاہے نظر آتا ہے لیکن ان کا اپنا ایک رنگ بھی ہے اور ان کا اپنا انداز ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ وہ ایک سماجی کارکن بھی تھے اور اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ جو انہیں اپنے عہد کے حالات اور مسائل پر غور وخوض کرنے، سوچنے سمجھنے اور عملی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اسی سبب سے انھوں نے سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی

غلام یحییٰ کی شاعری کی خوبی ان اشعار میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو خالص مسائل اور غم حیات پرمبنی ہیں۔ یا وہ مقامات جہاں گنگا جمنی تہذیب پرورش پاتی ہے ، ان کی آبیاری میں بھی غلام یحییٰ ایک خاص ہنر سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شاعری میں اسے موضوع بھی بنایا۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

فلک دہشت زدہ ہے آج پھر یحییٰ نہ جانے کیوں
یقیناً پھر کوئی سرکش کہیں بارود بوتا ہے

تو یہ خالص ان کے عہد کا مسئلہ ہوتا ہے اور یہ صرف اور صرف ان کا انداز ہوتا ہے۔ یہی وہ رنگ ہے جس سے غلام یحییٰ کی پہچان ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ یہ بند ملاحظہ فرمائیں جس میں ان کا پرسوز دل گاتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ اک بیابان خاک ہے محتاج التفات
شاید کہ واشگاف ہو عکس غم حیات
دیکھا کہ میرے سامنے ہے ایک گلستاں
ہے جس کے درمیان کا منظر دھواں دھواں
خون بہار سے در و دیوار نوحہ خواں
رہ رہ کے جابجا سے ابھرتی ہیں سسکیاں

غلام یحییٰ کی غزلوں میں ان کا شاعرانہ تیور بھی ملاحظہ کرتے چلیں جس میں معشوق سے نوک جھونک اور اس کی بے التفاتی کا شکوہ ہے۔

بے رخی میں نے ہی کی یہ سچ نہیں
آپ کا تیور بھی تھا بدلا ہوا
بجلیاں نظروں سے برسانے کے بعد
مسکرا کر پوچھتے ہیں کیا ہوا

غلام محمد یحییٰ کا اصل جوہر غزلوں میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں بے ساختگی، برجستگی اور انوکھاپن نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی منفرد انداز انہیں ایک شناخت دلاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک غزل کے دو تین اشعار دیکھیں جس میں ان کی جدت طرازی محسوس کی جاسکتی ہے۔

کل تک نہ تھی کسی کو بھی اس بات کی خبر
رنگین شام لائے گی سہمی ہوئی سحر
صد چاک پیرہن بھی بدن سے اتر نہ جائے
چھیڑا کرے مجھے یونہی عفریت وقت اگر
پت جھڑ کی رت شکست انا کی دلیل ہے
ایسی کہاں بہار کی چبھتی ہوئی نظر

ان اشعار میں سہمی ہوئی سحر، صد چاک پیرہن کے بدن سے اترنے کی بات، پت جھڑ کی رت کا شکست انا کی دلیل ہونا اور بہار کی چبھتی ہوئی نظر وہ ترکیبیں ہیں جو غلام محمد یحییٰ کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے کی دلیل ہیں۔ ان کے یہاں اس طرح کے بہت سے اشعار موجود ہیں۔ اسی سلسلے میں ان کے یہ اشعار سماعت پر بھاری نہ ہوں گے کہ

حصار غم سے نکل کے آ
خوشی کے سانچے میں ڈھل کے آ
نہ ڈگمگا یوں قدم قدم
یہ کوئے دل ہے سنبھل کے آ
سلگ رہا ہے قرار دل
تو موم ہے تو پگھل کے آ
حساب سود و زیاں نہ کر
بہ ایک جنبش مچل کے آ

یہاں قافیہ اور ردیف کا انتخاب اور چست بندشیں کسی معتبر اور ہنر مند شاعر کا پتہ دیتی ہیں۔

غلام یحییٰ کی شاعری کی خوبی ان اشعار میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو خالص مسائل اور غم حیات پرمبنی ہیں۔ یا وہ مقامات جہاں گنگا جمنی تہذیب پرورش پاتی ہے، ان کی آبیاری میں بھی غلام یحییٰ ایک خاص ہنر سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غلام یحییٰ سوالیہ انداز میں کہتے ہیں۔

کیا میں گدائے بے نوا اپنے وطن میں ہوں
حق اپنا کیوں بصورت صدقہ ملا مجھے
ظالم سزا تو دے چکے لیکن سوال ہے
کیا میں قصوروار تھا سچ سچ بتا مجھے

یا دیر و حرم میں یکساں طور پر الفت کی شمع جلانے والوں کے لیے یہ پیغام محبت بھی سنا جاسکتا ہے۔

یحییٰ حرم ہو، دیر ہو، الفت کے ہیں مقام
ان میں نہ کوئی خطبۂ نفرت سنا مجھے

غلام محمد یحییٰ کے رنگ کی تصدیق ان کی حمد سے بھی ہوتی ہے۔ اپنی ایک نظم حمد باری تعالیٰ میں وہ جس طرح اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے لیے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ حمد کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

خلا فضا ہوا دوا جزا سزا وفا جفا
بلا شفا حیا ادا غذا مزا صبا صدا
ذکی غبی غنی گدا، چمن بدن عبا قبا
یہ جلوہ ہائے خوشنما، بہت حسین و دلربا
یہ جس کی قدرتیں ہیں سب وہ بالیقیں خدا کا ہی ہے

اس مصرع میں 'کا' کا زائد ہے۔ اصل مصرع یوں ہوگا

یہ جس کی قدرتیں ہیں سب وہ بالیقیں خدا ہی ہے
وہ لم یزل و لایزال ذات کبریا ہی ہے

اسی طرح جب وہ نعت کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں بھی اپنی قادر الکلامی کا لوہا منواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نعت کا فن ایک ایسا فن ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مساوی ہے۔ بالیقیں اس راہ سے سب کے لیے گزرنا آسان

غلام محمدیحییٰ کے رنگ کی تصدیق ان کی حمد سے بھی ہوتی ہے۔ اپنی ایک نظم حمد باری تعالیٰ میں وہ جس طرح اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں اوراس کے لیے الفاظ کاانتخاب کرتے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔

نہیں۔ کیونکہ ایک طرف نبی رحمت ﷺ کی مرتبت اور عظمت کا خیال رکھنا ہوتا ہے دوسری طرف حد اعتدال بھی لازم ہوتا۔ اس سلسلے میں غلام محمد یحییٰ کی ایک نعت کے دو تین اشعار ملاحظہ فرمائیں جس سے یہ بات آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنا انداز بیان رکھتے ہیں بلکہ نعت کہنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ وہ ایسے معانی بھی پیدا کرتے ہیں جو خود شاعر کے لیے راحت جاں ہے۔ یہ اشعار یقیناً ملاحظہ کے قابل ہیں۔

وہ نور حق سکون جاں وہ دُرِ بحرِ لامکاں
سرور اولیں وہی نشاط آخریں وہی
وہی جمال زندگی بہار عالمیں وہی
انھیں کے صدقے ایں و آں
انھیں کے صدقے روح و جاں
جو وہ نہیں تو کچھ نہیں نہ یہ زمیں نہ آسماں

یہ وہ شاعری ہے جو یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ غلام محمد یحییٰ نے اپنا خون جگر صرف کرکے ان اشعار میں اپنے دل کی صدا قید کردی ہے۔ ہماری یہ کوتاہی اور ناقدری ہوگی کہ ہم انہیں فراموش کردیں۔

■

Dr. Quaseem Akhtar
At. Bahader Pur
Po.- Amour, Dist. Purnea
Pin.854315
Mob.9470120116
E-mail: qaseemakhtar786@gmail.com

اردو او سی آر: بصری حرف شناسی

مکرم نیاز

بصری حرف شناسی - تعریف

OCR بمعنی Optical character recognition یعنی بصری حرف شناسی یا آسان الفاظ میں متن کی بصری شناخت دراصل وہ الکٹرانک یا میکانیکی طریقہ کار ہے جس کے ذریعے تصویر میں موجود قابل مطالعہ متن کو کمپیوٹر کی تحریری شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ اب چاہے یہ متن کسی کتاب کے صفحے پر مبنی امیج میں ہو، یا اسکین شدہ دستاویز میں، یا قدرتی منظر والی تصویر میں، یا سائن بورڈ کی تصویر میں یا ٹیلیوژن نشریہ کی تصویر میں موجود کیپشن کی شکل میں ہو۔

تصویر میں موجود متن کو تحریری شکل میں اخذ کر کے ٹکسٹ فائل بنانے سے کئی بنیادی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

- تصویری فائل کی بہ نسبت ٹکسٹ فائل کا حجم کئی گنا کم ہوتا ہے۔
- ٹکسٹ فائل میں لفظ/فقرہ کی تلاش ممکن اور آسان ہوتی ہے۔
- ٹکسٹ کی حسب ضرورت تدوین وترمیم کی جا سکتی ہے یعنی رد و بدل و اضافہ۔
- مختلف اپلیکیشن (اطلاقیے) کے ذریعے ٹکسٹ کا فوری ترجمہ، اس کے رسم الخط کی تبدیلی اور اسے آواز میں تبدیل کرنے کا کام بسہولت انجام دیا جا سکتا ہے۔

بصری حرف شناسی، امیج پراسیسنگ، مصنوعی ذہانت Artificial intelligence اور کمپیوٹر وژن computer vision کے میدان میں ترقی کا وہ باب ہے جسے موجودہ برقیاتی زمانے میں طبع شدہ ریکارڈ سے ٹکسٹ مواد کے حصول کی خاطر وسیع پیمانے پر استعمال کیا جا رہا ہے چاہے وہ معاملہ پاسپورٹ دستاویزات کا ہو، یا بنک کے کھاتہ جات کا، چاہے کاروباری کمپیوٹرائزڈ رسیدیں ہوں یا سرکاری و غیرسرکاری شناختی کارڈز سے ٹکسٹ کے حصول کا معاملہ ہو۔

وکی پیڈیا کے بموجب بصری حرف شناسی نظام کی کامیابی کا دارومدار کسی بھی طرح کے حرف کی شبیہ کو پہچان کر اس کو متن میں تبدیل کرنے پر منحصر رہا ہے، اور اس نظام کے ابتدائی ورژن میں ہر رسم الخط کے لیے ایک علیحدہ پروگرام کی ضرورت پڑتی تھی، و نیز ایک وقت میں صرف ایک فونٹ پر کام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس نظام کی جدید کاری کے بعد موجودہ ذہین بصری حرف شناسی نظام تمام طرح کے فونٹ اور رسم الخط کو متن میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہر آپریٹنگ سسٹم پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بصری حرف شناسی نظام کی تاریخ

بصری حرف شناسی نظام کی تاریخ کے تانے بانے بیسویں صدی کی شروعات میں اس دوران ملتے ہیں جب ٹیلیگراف کی تخلیق اور نابیناؤں کے لیے پڑھنے والے آلہ جات کی تیاری جاری تھی۔ 1931 میں ایمانوئیل گولڈ برگ [Emanuel Goldberg] نے ایک ایسی شماریاتی مشین ایجاد کی جس کے ذریعے محفوظ شدہ دستاویزات میں متن کی تلاش ممکن رہی تھی۔ بعد ازاں اس ایجاد کو آئی۔بی۔ایم نے حاصل کر لیا۔

اسمارٹ فون کی آمد کے بعد بصری حرف شناسی کا یہ نظام انقلابی تبدیلیوں کا نقیب بن گیا۔

اس ٹیکنالوجی پر تیار کردہ عصر حاضر کے سافٹ ویئر میں اومنی پیج، ریڈ آئرس، ابی فائن ریڈر، ابی اسکین ٹو ڈوکیومنٹ، ٹاپ او سی آر، انٹیلی جنٹ او سی آر، ٹرانسیم او سی

آر، ڈوک شوٹ، اوسی آر ٹیکسٹ اسکین، سافٹ رائٹنگ، ٹیبل ایکسٹریکٹر، سمپل اوسی آر وغیرہ مشہور ہیں۔

بصری حرف شناسی اور اردو زبان

موجودہ عصری ٹیکنالوجی زمانے میں بصری حرف شناسی کا یہ نظام کوئی ایسا پیچیدہ موضوع تو نہیں لیکن نستعلیقی اردو زبان کے حوالے سے ضرور مشکل ترین مانا گیا ہے۔ اس وقت آن لائن بازار میں دنیا کی تقریباً زبانوں کے او۔سی۔آر دستیاب ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، لاطینی، روسی، یونانی وغیرہ اور ایشیائی زبانوں میں جاپانی، چینی، کوریائی کے علاوہ دائیں سے بائیں لکھی جانے والی زبانوں جیسے عربی، فارسی، عبرانی میں، تک معقول اور کارآمد او۔سی۔آر ایجاد ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ 2011 میں جرمن ڈیولوپر/پروگرامر ڈاکٹر اولیور ہیلوگ [Hellwig Oliver Dr.] کے قائم کردہ ہندوستانی ادارہ انڈ-سنز Ind.Senz کے ذریعے ہندی، مراٹھی، گجراتی، تامل اور سنسکرت کے او۔سی۔آر بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

جب سے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر تحریری اردو یعنی اردو یونیکوڈ کا استعمال عام ہوا ہے، شعبہ حیات کے تقریباً ہر موضوع پر دستیاب اردو کتب کے متن کے حصول کے ذریعے علمی و تحقیقی استفادہ کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ انٹرنیٹ پر اردو ای-لائبریریوں کے توسط سے کلاسیکی اور جدید موضوع کی لاتعداد کتب بآسانی پی۔ڈی۔ایف فائل کی شکل میں دستیاب تو ہیں مگر ان کے متن سے استفادہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم خود اسے دیکھ کر ٹائپ کر لیں۔ یا پھر دوسری صورت 'اردو اوسی آر' کی شکل میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ 'اوسی آر' کا اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہزارہا علمی و معلوماتی کتب کو، جو بآسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں، اسکین کر کے یونیکوڈ تحریر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر لفظ/فقرہ کی تلاش بھی اسی تحریری فائل میں ممکن العمل ہوگی۔

شاید یہی سبب ہو کہ ماہ اگست 2016 میں لسانیات کے پینل کی ایک میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا تھا: ''آج کے بدلتے حالات میں نئی ٹیکنالوجی کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بغیر ترقی کا سفر طے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اردو میں ایک اوسی آر کی اہم ضرورت ہے۔ اس وقت ملک کی دوسری زبانوں مثلاً بنگلہ، ہندی اور تمل میں یہ سہولیات فراہم ہیں۔ اس ٹیکنالوجی کے ذریعے کسی کتاب کے تصویری مسودے میں ٹائپ کیے ہوئے الفاظ کو تحریری صورت میں شناخت کرنا بھی ممکن ہو جائے گا۔''

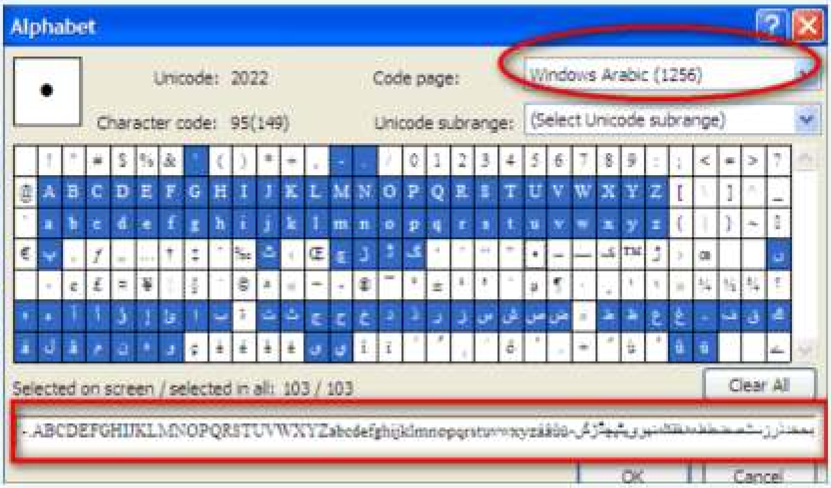

اردو او سی آر پر تحقیقی مقالے

اردو اوسی آر پر تحقیقی مقالے موجودہ صدی کی شروعات کے بعد سے سیکڑوں کی تعداد میں تحریر کیے گئے ہیں جن کی تفصیلات scholar.google.com میں انگریزی میں 'اردو اوسی آر' لکھ کر حاصل کی جا سکتی ہیں... ان میں سے کچھ اہم یہ ہیں:

1۔ ICDAR کی 2003 میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس پر مشتمل مجلّہ کی جلد دوم میں یو-پال اور انربان سرکار کا شائع شدہ مشترکہ مقالہ بعنوان:

Recognition of Printed Urdu Script

2۔ انڈین جرنل آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی جلد 8، شمارہ 25 میں انکور رانا اور گرپریت سنگھ لیہل کے شائع شدہ مقالے کا عنوان تھا:

Offline Urdu OCR using Ligature based Segmentation for Nastaliq Script

3۔ مارچ 2016 میں منعقدہ بین الاقوامی 'انڈیاکوم' کانفرنس میں ذاکر حسین انجینئرنگ کالج، اے۔ایم۔یو۔ کے توفیق علی، توصیف احمد اور محمد عمران کی طرف سے پیش کیا گیا مقالہ بعنوان:

UOCR: A ligature based approach for an Urdu OCR system

4۔ 2014 میں منعقدہ 17 ویں بین الاقوامی IEEE کانفرنس میں ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ، بحریہ یونیورسٹی اسلام آباد اور کنگ سعود ہیلتھ یونیورسٹی ریاض کے طلبہ کی جانب سے پیش کیا گیا مقالہ بعنوان:

An Ocr system for printed Nasta'liq script: A segmentation based approach

5۔ جنوری 2013 میں اسلام آباد کی قائداعظم یونیورسٹی کے شعبہ کمپیوٹر سائنس میں دانش الطاف ستی کی جانب سے جو مقالہ پیش کیا گیا اس کا عنوان تھا:

Offline Urdu Nastaliq OCR for Printed Text using Analytical Approach

اردو نستعلیق او سی آر- مسائل و امکانات

اس میدان میں بیشمار تھیوریٹکل مقالے لکھے جانے کے باوجود یہ بات کمپیوٹر و انٹرنیٹ اردو کمیونٹی کے ماہرین کے نزدیک ثابت شدہ رہی کہ اردو نستعلیق جیسے پیچیدہ خط کے لیے قابل استعمال اوسی آر بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ کیونکہ اردو اور انگریزی میں ایک مشکل حروف کی وجہ سے ہے۔ اردو میں حروف ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں جبکہ انگریزی میں لفظ بن کر بھی حروف اپنی جداگانہ شناخت برقرار رکھتے ہیں۔ اس لیے حروف کے ذریعے انگریزی لفظ کو پہچاننا کسی سافٹ ویئر کے لیے رتی برابر مشکل کام نہیں۔

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ اردو کی طرح ہندی، مراٹھی کے علاوہ دائیں سے بائیں لکھی جانے والی دیگر زبانوں جیسے عربی، فارسی اور عبرانی میں بھی تو حروف جڑ جاتے ہیں، پھر ان کے او۔سی۔آر کس طرح وجود میں آ گئے؟

جواب اردو کا پیچیدہ ترین نظام یعنی نستعلیقی رسم الخط ہے جس میں ایک تو بے تحاشا ترسیمہ جات یعنی لگیچرز استعمال ہوتے ہیں، دوسرے حروف بھی اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمام حروف عمودی سمت میں ایک افقی لائن پر قائم نہیں رہتے۔

کچھ سال قبل اردو محفل فورم کے بانی نبیل نقوی نے نستعلیق رسم الخط کی بصری شناخت میں پیش آنے والی ایسی ہی مشکلات کا تفصیلی ذکر کچھ یوں کیا تھا:

''میں نے یہ تھیسس ڈیولپ کیا تھا کہ اگر خط نستعلیق لگیچرز کی ایک ڈیٹا بیس بن جائے تو تصویری متن کو پہلے افقی (Horizontal) سمت میں پروسیسنگ کر کے اس کی سطور کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ان سطور کو عمودی (Vertical) سکیننگ کے ذریعے ترسیموں میں علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح تصویری متن کے ترسیمہ جات تصویری شکل میں ہو جائیں گے جنھیں بصری شناخت کے مرحلے سے گزارا جا سکتا ہے۔ اس تھیسس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ Assumption ہے کہ تصویری متن کی سطور اور ہر سطر میں ترسیمہ جات کے مابین کچھ نہ کچھ سپیس ہے جس کی بدولت انہیں سادہ پروسیسنگ سے علیحدہ کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جب میں نے تصویری اردو کے نمونے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اکثر صورتوں میں یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ عام طور پر تصویری اردو کے نمونوں میں عبارت کافی تنگ نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے ک کی کشش پچھلے لفظ کے اوپر آ رہی ہوتی ہے اور اسی طرح سطور کے درمیان بھی سپیس نہیں ملتی۔ اس طرح اگرچہ تصویری متن سے ترسیمہ جات کا حاصل کرنا ناممکن نہیں ہو جاتا لیکن کم از کم سادہ پیٹرن ریلکنیشن سے ان کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ اس کے لیے Edge detection جیسے پروسیجر ہی کام دے سکتے ہیں جس پر امیج پراسیسنگ کے ماہرین ہی کام کر سکتے ہیں۔

ایک طریقہ یہ اپنایا جا سکتا ہے کہ شروع میں ایسے ہی تصویری متن پر کام کیا جائے جو کہ مذکورہ بالا مفروضے پر پورا اترتا ہو، یعنی کہ اس کی سطور اور الفاظ کے درمیان کچھ نہ کچھ سپیس ضرور ہو۔ اس طرح کم از کم تحقیق آگے ضرور بڑھتی رہے گی۔ اگر اس میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو مزید پیچیدہ پرابلمز کو حل کرنے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔''

اردو او سی آر کی کوششیں

گزشتہ ڈیڑھ دو عشرے کے دوران مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی جانب سے اردو بصری حرف شناس کی ایجاد کے لیے کافی کوششیں ہوئی ہیں۔

پاکستان کے قومی انفارمیشن ٹیکنالوجی ادارہ آئی۔ سی۔ ٹی۔ آر۔ ڈی۔ ایف نے لاہور کے الخوارزمی انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر سائنس کو اردو نستعلیق بصری حرف شناسی نظام کی تخلیق کے لیے تقریباً 30 ملین پاکستانی روپے کا عطیہ مارچ 2012 میں فراہم کیا اور پراجیکٹ تکمیل کے لیے تیس مہینوں کی مدت دی گئی (1)۔ متذکرہ سرکاری ادارہ کی ویب سائٹ پر اس منصوبے کی پیش رفت رپورٹ ہر چند کہ دستیاب نہیں ہے، لیکن دیگر ذرائع کی اطلاعات کے بموجب یہ منصوبہ اس قدر کامیاب نہیں رہا جتنا کہ اس کی امید کی گئی تھی۔

ویسے اسی پراجکٹ کے نگران اعلیٰ ڈاکٹر سرمد حسین کے زیر تحت پاکستانی ادارہ 'سنٹر پر لینگویج انجینیئرنگ' نے 'سی۔ ایل۔ ای نستعلیق او سی آر، ورژن' 1.0.0 کے نام سے پہلا اردو او سی آر 15 ہزار پاکستانی روپیوں میں گزشتہ سال ماہ اکتوبر میں جاری کیا ہے۔ جس کے مثبت نتائج یا کامیابی کے فیصد کی کوئی اطلاع ابھی تک تو سائبر دنیا میں دستیاب نہیں ہے۔

البتہ متذکرہ ویب سائٹ پر ڈیمو ٹسٹنگ کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ جس پر اس سافٹ ویئر کا تعارف کچھ یوں لکھا ہے کہ: اُردو نستعلیق حرف شناس (آپٹیکل کیریکٹر ریلکنائزر) ایک ایسا خودکار نظام ہے جو سکین کردہ صفحے سے متن اخذ کرتا ہے تاکہ اس میں رد و بدل کیا جا سکے۔ حرف شناس کتابوں اور دستاویزات سے متن کے حصول کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ مطلوبہ مقامی مواد کی آن لائن اشاعت مستعدی سے کی جا سکے۔''

مگر ہمارے نتائج بتاتے ہیں کہ جتنی ٹیکنیکی شرائط ڈیمو ورژن کے لیے لاگو کی گئی ہیں ان پر عمل کرنے کے باوجود اصل مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ ٹکنالوجی کے ماہر ڈاکٹر فاتح الدین بشیر، اردو محفل فورم پر اپنے تجربات کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''یہ او سی آر صرف ایسی تصاویر سے ٹیکسٹ نکال سکتا ہے جو پہلے کمپیوٹر پر جمیل نوری نستعلیق یا کسی دوسرے نستعلیق فونٹ میں ٹائپ کر کے محفوظ کی گئی ہوں اور پھر انہیں تصویری شکل دے دی گئی ہو۔ میری رائے میں اردو او سی آر کا سب سے بہتر استعمال تو یہی ہو سکتا ہے کہ سکین شدہ کتابوں کا متن حاصل کیا جا سکے جو کہ فی الحال اس او سی آر کے ذریعے ناممکن ہے۔ ہاں، اس سافٹ ویئر کو ایک اچھے اردو او سی آر کی جانب ایک پیش رفت کے طور پر ضرور لیا جانا چاہیے۔''

حوالہ:(1)

https://ignite.org.pk/component/tprojects/project/98.html

حکومت ہند کے ڈپارٹمنٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ادارہ آئی۔ ایل۔ ٹی۔ پی۔ ڈی۔ سی کے تحت 2013 میں آن لائن او۔ سی۔ آر مبنی ویب سائٹ قائم کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ بنگلہ، دیوناگری، گرمکھی، کنڑ، ملیالم اور تلگو زبانوں میں بصری حرف شناسی نظام اس وقت آن لائن دستیاب ہے اور عنقریب اردو، تامل، گجراتی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی یہ سہولت دستیاب ہوگی۔ اور اس وقت اردو زبان میں بھی یہ سہولت فراہم کی جا چکی ہے۔ اس پر کیے گئے ایک آن لائن تجربہ کے مطابق یہ

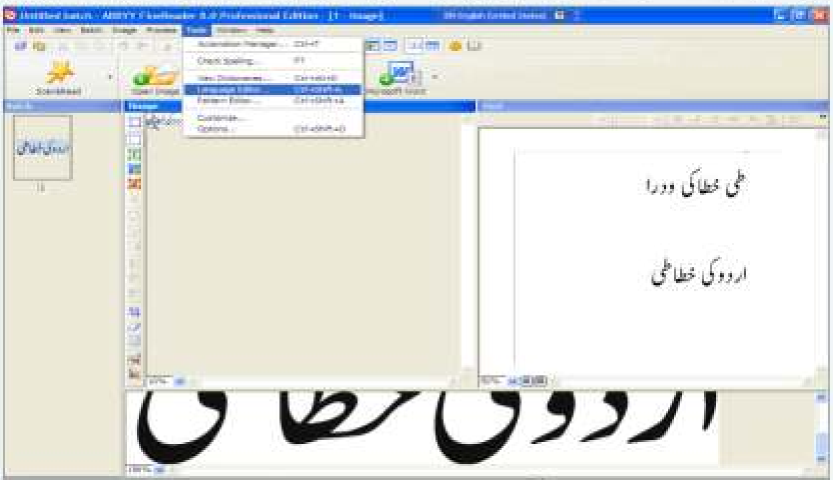

ویب او۔ سی۔ آر تقریباً سو (100) الفاظ کی امیج فائل کو تحریر میں بدلنے کے لیے قریب چار منٹ لیتا ہے اور نتیجہ تقریباً ساٹھ تا ستر فیصد درست ہے۔

حوالہ:

Default.aspx / dc.gov.in -ocr.tdil //:http

عربی زبان کی ٹیکنالوجی پر مختص مشرق وسطیٰ کی کمپنی 'صخر سافٹ ویئر' کا ذکر بھی اس ضمن میں ضروری ہے۔ صخر کے کلائنٹس میں لاک ہیڈ مارٹن اور ییل یونیورسٹی جیسے ادارے شامل ہیں، جس سے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کمپنی کی تصدیق امریکی حکومت نے بھی کر رکھی ہے کہ عربی بصری حرف شناسی کے میدان میں صخر او سی آر سے بہتر اور کوئی دوسرا سافٹ ویئر نہیں۔ اس کمپنی کا دعویٰ ہے کہ اس کا او سی آر سافٹ ویئر 95 فیصد سے زیادہ درست نتائج دیتا ہے۔ اور یہ او سی آر عربی کے ساتھ ساتھ فارسی، پشتو اور اردو زبان کو بھی سپورٹ کرتا ہے۔ البتہ اس اردو او سی آر سے متعلق کسی انگریزی یا اردو ویب سائٹ پر کوئی تبصرہ یا تجزیہ نہ آنے کا بنیادی سبب شاید اس سافٹ ویئر کی گراں بہا قیمت ہو۔

انٹرنیٹ اردو کمیونٹی کے سب سے پہلے اردو یونیکوڈ فورم 'اردو محفل' پر اردو او سی آر سے متعلق ایک علیحدہ زمرہ قائم ہے جہاں اس میدان کے طلبہ اور ماہرین عرصہ دراز سے اپنے اپنے تجربات سے آگاہی فراہم کر رہے ہیں۔

سنہ 2009 میں علوی نستعلیق یونیکوڈ فانٹ کے خالق امجد علوی نے انگریزی کے او سی آر سافٹ ویئر ابی فائن ریڈر Abbyy Fine Reader کے ورژن 8 پر تجربات کیے تھے۔ ان کے مطابق: ''اگرچہ Abbyy والوں نے اپنے سافٹ ویئر میں اردو یا عربی کی سپورٹ بالکل نہیں ڈالی جس کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے Pattern Editor میں اردو کو Read کروالیں تو یہ ایک بہت اچھا او سی آر بن سکتا ہے۔''

لیکن امجد علوی کے تجربات شاید ادھورے رہ گئے اور یہ پراجکٹ بھی اپنی تکمیل کو نہیں پہنچا۔ پھر سال اگست 2016 میں اسی ابی فائن ریڈر کے ورژن 12 پر زبیر عباس صاحب نے اپنے تجربات کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے مطابق اس سافٹ ویئر نے اردو زبان کو سپورٹ کیے بغیر کافی اچھے نتائج فراہم کیے ہیں۔ بس اس کی تین بنیادی خامیاں کچھ یوں ہیں کہ:

- الفاظ کے مابین اسپیس کو ٹھیک سے شناخت نہیں کر پاتا۔
- ایک جیسے نظر آنے والے ترسیمہ جات کو ٹھیک طرح سے شناخت نہیں کر سکتا۔
- اس سافٹ ویئر کے پیٹرن ایڈیٹر کو مینوئل ٹریننگ کروانا پڑتا ہے (جبکہ نوری نستعلیق کے 20,000 لیگچر میں سے صرف 100 کے قریب کو تین دن میں ٹرین کروایا جا سکتا ہے۔)

بہرحال ابی فائن ریڈر سے متعلق انفرادی کوششوں نے اردو بصری حرف شناس کے ضمن میں کوئی ٹھوس نتائج پیش نہیں کیے۔

اردو او سی آر اور گوگل

گوگل نے مئی 2015 میں اپنے ریسرچ بلاگ پر 'پیپر ٹو ڈیجیٹل ان 200+ لینگویجز' کے عنوان سے بڑے پیمانے پر گوگل ڈرائیو میں بے شمار زبانوں میں او سی آر یعنی آپٹیکل کیریکٹر ریکگنیشن کا اعلان کیا۔ اور خوش قسمتی سے ان 200 زبانوں میں اردو بھی شامل رہی۔

اس سہولت کو استعمال کرنے کے لیے کسی تصویر یا پی ڈی ایف فائل کو گوگل ڈرائیو میں اپلوڈ کرنے کے بعد متعلقہ فائل پر رائٹ کلک کر کے 'اوپن وِد' > 'گوگل ڈاکس' کو منتخب کرنا ہوگا۔ تھوڑے وقفے کے بعد تصویر ایک علیحدہ فائل میں شامل ہو جائے گی اور اس کے نیچے ماحصل متن موجود ہوگا۔

اردو ٹیکنالوجی ماہرین کی صف اول کے جواں سال محقق ابن سعید نے اس اعلان کی وضاحت میں لکھا تھا کہ: ''اس تکنیک کی مدد سے تصویری عبارتوں مثلاً اسکین کردہ مواد کو متن کی صورت میں تبدیل کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے گوگل نے آرٹیفیشیل انٹیلیجنس کی ایک مشہور تکنیک ایچ ایم ایم یا ہیڈین مارکوو موڈل [HMM - hidden Markov model] کا استعمال کیا جس میں متن کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ کر سمجھنے کے بجائے شکلوں کا پورا سلسلہ ایک ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے لیے کافی ٹریننگ ڈیٹا کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترسیموں کی بنیاد پر اردو او سی آر کا تجربہ نیا نہیں ہے، اس پر بھی کافی لوگوں نے کوشش کی ہے۔ کرننگ کی وجہ سے ترسیموں کو علیحدہ کرنا بھی ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے ورنہ ترسیموں کی ٹریننگ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ ترسیموں کی تختی کو علیحدہ کرنا اور بعد میں ان سے متعلقہ نقطوں کو ساتھ لے کر لغات اور این گرامز کی مدد سے کام کرنے پر بہتر نتائج آنے کی امید ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ گوگل کسی ایک زبان میں اضافی توانائی صرف کرنے کے بجائے

ایسے طریقوں پر زیادہ توجہ دے گا جس میں درستگی کم سہی پر زیادہ زبانوں کو سمیٹا جا سکے، خاص کر تب جب وہ زبان ان کی ترجیحات میں صف اول میں شمار نہ ہوتی ہو۔''

گو کہ شروعات میں اس گوگل تکنیک کے نتائج صفر تا دس فیصد رہے تھے مگر آج تقریباً ساڑھے تین سال بعد اردو انٹرنیٹ کمیونٹی کے بیشتر ماہرین کی تحقیقات کے مطابق گوگل ڈاکس کی مصنوعی ذہانت اور نیورل نیٹ ورک پر مبنی اس تکنیک سے 70 تا 80 فیصد درست نتائج حاصل ہو رہے ہیں اور امکان غالب ہے کہ آنے والے چند برسوں میں اردو نستعلیق حرف شناسی کے موثر نظام کی تشکیل کا سہرا گوگل ہی کے سر پر سجے گا۔

اختتامیہ

اردو بصری حرف شناس سے بالخصوص اور جدید ٹیکنالوجی سے بالعموم چند متعلقہ سوالات یہاں قائم ہوتے ہیں:

(1) اردو میں سائنسی مضامین، کتب و رسائل تو کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں لیکن انفارمیشن اور موبائل ٹیکنالوجی سے متعلق مضامین، کتب اور رسائل کی اس قدر کمی کا سبب کیا ہے؟

(2) جامعاتی تحقیق میں اردو زبان کے حوالے سے او۔سی۔آر یا ٹکسٹ ٹو اسپیچ یا اسپیچ ٹو ٹکسٹ یا مشینی ترجمہ پر ڈیکلس پر اگر کسی ہندوستانی یونیورسٹی میں کوئی کام ہوا ہے تو ان کی تفصیلات انٹرنیٹ سرچنگ میں کیوں کر دستیاب نہیں ہیں؟

(3) اگر پڑوسی ملک کی حکومت نے جامعاتی سطح پر اردو او۔سی۔آر سے متعلق تعاون کیا یا سرگرمی دکھائی ہے تو ہمارے ملک کی جامعات کے متعلقہ شعبوں میں اس اہم ترین تحقیقی موضوع کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے جبکہ اردو کے نام پر ایک علیحدہ یونیورسٹی میں قائم ہے؟

(4) مشہور و مقبول ادارہ 'ریختہ' سے ہٹ کر اردو کی دیگر سرکاری و غیر سرکاری تنظیمیں اور ادارے، اردو زبان و ادب کے ذخیرے کو انٹرنیٹ پر تلاش کے قابل متن کی شکل میں مہیا کرنے کے سلسلے میں ٹیکنالوجی ماہرین سے کیونکر رابطہ نہیں کرتے؟

(5) گوگل کے سی۔ای۔او اتفاق سے ہندوستانی نژاد ہیں، کیا یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ قومی اردو جامعہ کے سربراہان سرکاری سطح پر ان سے رابطے کے ذریعے اردو کے اہم ذخیرہ کتب کو گوگل او۔سی۔آر کی مدد سے ڈیجیٹائز کرنے کے سلسلے میں باہمی اشتراک کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دیں گے؟

■

Eng'r Syed Mukarram
H.No. 16-8-544, Dawood Manzil
New Malakpet, Hyderabad - 500024 (Telangana)
Mob: 08096961731

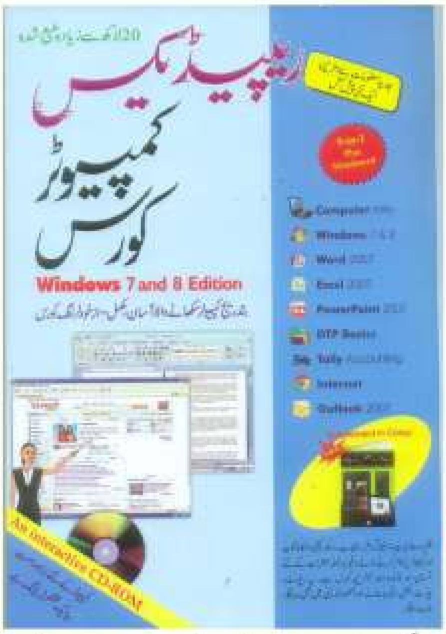

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا

Formatting Documents and Text

ایم۔ ایس۔ ورڈ میں آپ اپنی دستاویز کو کئی طرح سے فارمیٹ کرکے اس کی خوبصورتی بڑھا سکتے ہیں۔ اس میں آپ نشانات، الفاظ، قطاروں اور پیراگرافوں کو کسی بھی طرح سے درست کرکے چھاپ سکتے ہیں، لائنس اور پیراگرافوں کے درمیان خالی جگہ زیادہ کم کرسکتے ہیں اور مزید بہت سے کام کرسکتے ہیں، جن کے بارے میں ہم آگے بتائیں گے۔ اتنا ہی نہیں، آپ کسی دستاویز کے اسٹائل کو نوٹ کرکے اسی اسٹائل کو دوسری دستاویزوں پر لاگو کرسکتے ہیں۔

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنے میں زیادہ تر Home ٹیب میں دیے گئے سب ٹیبوں کے مختلف آپشنز کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں آگے بتایا جائے گا۔

آٹو فارمیٹ (Auto Format)

ایم ایس- ورڈ کے آٹو فارمیٹ آپشن کا استعمال کرکے آپ ایم ایس- ورڈ سے ہی اپنی دستاویز کو فارمیٹ کراسکتے ہیں۔ ایم ایس- ورڈ آپ کی دستاویز کی جانچ کرکے اس کو فارمیٹ کردیتا ہے۔ اس میں یہ بھی انتظام ہے کہ آٹو فارمیٹ اپنے ذریعے کی گئی اصلاحات کو ایک ایک کرکے آپ کے سامنے رکھتا ہے اور آپ سے پوچھتا ہے کہ وہ اصلاح آپ کو قبول ہے یا نہیں۔ آپ ان میں سے کچھ یا سبھی کو قبول کرسکتے ہیں اور مطمئن نہ ہونے پر پوری طرح رد بھی کرسکتے ہیں۔ اس آپشن میں آپ عنوان کا فارمیٹ بدل سکتے ہیں اور دیگر کئی کام کرسکتے ہیں۔

تصویر WD-3.1 Word Options ڈائیلاگ باکس

آٹو فارمیٹ کا آپشن ورڈ کے پرانے ورژن میں Format مینو میں پایا جاتا تھا، لیکن اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہ صارفین (یوزرس) عام طور پر دستاویز کو خود فارمیٹ کرنا پسند کرتے ہیں، ایم ایس- ورڈ 2007 میں یہ آپشن ربن میں دستیاب نہیں ہے۔ اس آپشن کو آپ کوئک ایکسیس ٹول بار میں آسانی جوڑ سکتے ہیں اور صرف ایک کلک سے اسے ایکٹو کرکے اس کا استعمال کرسکتے ہیں اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1. اپنی بغیر فارمیٹ کی ہوئی دستاویز کھول لیجیے۔
2. آفس مینو میں Word Options پر کلک کیجیے۔
3. Word Options ڈائیلاگ باکس میں بائیں جانب دیے گئے آپشنز میں سے Customize پر کلک کیجیے۔
4. اس سے تصویر WD-3.1 کی طرح ایک ونڈو کھلے گی۔ Choose Command Form لسٹ باکس میں ڈراپ ڈاؤن بٹن کو کلک کیجیے اور کھلنے والے مینو میں All Commands کلک کیجیے۔
5. نیچے دیے گئے آپشنز میں Auto Format تلاش کرکے اسے کلک کیجیے اور دائیں جانب دیے گئے Add بٹن پر کلک کیجیے۔
6. اب OK کلک کیجیے۔ Word Options ڈائیلاگ باکس غائب ہوجائے گا اور آپ دیکھیں گے کہ Auto Format آپشن آپ کے کوئک ایکسیس ٹول بار میں آگیا ہے۔
7. Auto Format کو ایکٹو کرنے کے لیے اس کے آئیکان پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر WD-3.2 کی طرح آٹو فارمیٹ کا پہلا ڈائیلاگ باکس نظر آئے گا۔
8. اس ڈائیلاگ باکس میں دو ریڈیو بٹن یا آپشن ہیں۔ پہلے آپشن 'Auto Format Now' کو چننے پر دستاویز ایم ایس- ورڈ کے ذریعے سیدھے فارمیٹ کردی جائے گی۔ بعد میں آپ کو اسے بدلنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ دوسرے آپشن 'Auto Format and review each change' کو سیٹ کرنے پر فارمیٹ کرنے کے بعد اسے قبول کرنے یا بدلنے کا بھی موقع دیا جاتا ہے۔ ایم ایس- ورڈ کی مدد کے لیے آپ اپنے ڈاکیومنٹ کا ٹائپ بھی بتا سکتے ہیں، جس کے لیے اس ڈائیلاگ

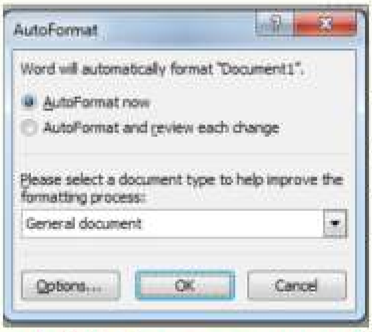

تصویر WD-3.2 Auto Format کا پہلا ڈائیلاگ باکس

باکس میں نیچے کی طرف ایک ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس دیا گیا ہے۔

9. سبھی ضروری سیٹنگ کرنے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آٹو فارمیٹ شروع ہوجائے گا اور جلد ہی آپ کی دستاویز نئے فارمیٹ میں دکھائی دینے لگے گی۔ اگر آپ نے پہلا آپشن چنا ہے، تو پروگرام یہیں ختم ہوجائے گا اور اگر دوسرا آپشن چنا ہے، تو تصویر WD-3.3 کی طرح آٹو فارمیٹ کا دوسرا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

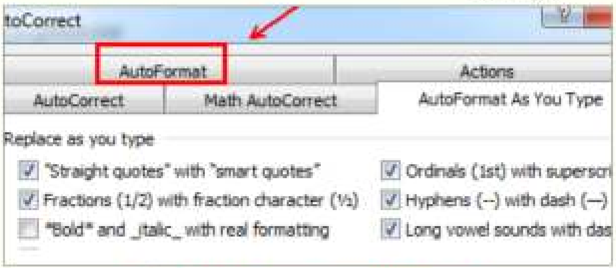

تصویر WD-3.3 Auto Format کا دوسرا ڈائیلاگ باکس

10. اگر آپ سبھی تبدیلیوں کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو اس ڈائیلاگ باکس میں 'Accept All' بٹن کو کلک کیجیے۔ اگر سبھی تبدیلیوں کو رد کرنا چاہتے ہیں تو 'Reject All' بٹن کو کلک کیجیے۔ اگر آپ تبدیلیوں کو ایک ایک کرکے دیکھنا اور انھیں قبول یا رد کرنا چاہتے ہیں، تو '...Review Changes' بٹن کو کلک کیجیے۔

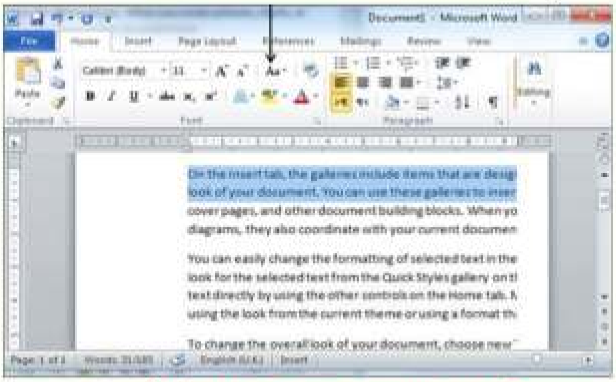

تصویر WD-3.4 Auto Format کے ذریعے فارمیٹ کی ہوئی دستاویز

سبھی تبدیلیوں کو قبول کرنے پر ڈاکیومنٹ تصویر WD-3.4 کی طرح نظر آئے گا۔

اگر آپ اس طرح تیار ہوئی دستاویز سے کسی وجہ سے مطمئن نہیں ہیں، تو آگے بتائی گئی تکنیکوں سے اپنی من پسند تبدیلی آپ خود کرسکتے ہیں۔

اگر آپ ایم ایس-ورڈ کے آٹو فارمیٹ اسٹائل میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، تو آٹو فارمیٹ کے پہلے ڈائیلاگ باکس میں '...Options' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر WD-3.5 کی طرح ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

تصویر WD-3.5 Auto Format کا اسٹائل سیٹ کرنے کا ڈائیلاگ باکس

اس ڈائیلاگ باکس میں کئی چیک باکس دیے جاتے ہیں، جو آٹو فارمیٹ کے مختلف آپشنز کو سیٹ یا ری سیٹ کرتے ہیں۔ آپ ان میں سے جن آپشنز کو لاگو کرنا چاہتے ہیں، انھیں سیٹ رہنے دیجیے اور جن کو لاگو نہیں کرنا چاہتے، انھیں کلک کرکے ری سیٹ کردیجیے۔ مناسب سیٹنگ کرنے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کردیجیے، جس سے آپ کے ذریعے کی گئی سیٹنگ لاگو ہوجائے گی اور آپ ڈائیلاگ باکس سے باہر آجائیں گے۔

ہوم ٹیب کی خوبیاں (Features of Home Tab)

Homt Tab کا استعمال کرکے آپ کسی بھی چنے ہوئے ٹیکسٹ کو بہت آسانی سے مختلف انداز سے فارمیٹ کرسکتے ہیں۔ ٹیب میں کئی بٹن ہوتے ہیں۔ کون سا بٹن کس کام کے ہے، یہ جاننے کے لیے ماؤس پوائنٹر کو اس بٹن پر لائیے اور ایک سیکنڈ رکیے۔ ایسا کرنے پر اس بٹن کا نام ابھر آئے گا۔ تصویر WD-3.6 میں فارمیٹنگ ٹول بار کے مختلف بٹن دکھائے گئے ہیں اور ان کے نام یا استعمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آگے کی تفصیل میں جگہ جگہ پر ان بٹنوں کا حوالہ دیا جائے گا، اس لیے انھیں اچھی طرح پہچان لینا چاہیے۔

تصویر WD-3.6 Auto Format ہوم ٹیب

فونٹ حصہ کا استعمال (Using Font Section)

Home ٹیب کے Font حصہ میں ٹیکسٹ کو ایڈٹ کرنے کے لیے کئی بٹن اور آپشن دیے گئے ہیں۔ اس میں دو ڈراپ-ڈاؤن لسٹ باکس ہیں۔ Font اور Font Size، جن کے ذریعے آپ ٹیکسٹ کا فونٹ اور سائز بدل سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس حصہ میں دیے گئے بٹن ہیں۔ بولڈ (Bold)، ترچھا (Italic)، خط کشیدہ (Underline)، اسٹرائک تھرو (Strikethrough)، سب اسکرپٹ (Subscript)، سپر اسکرپٹ (Superscript)، کلیئر فارمیٹنگ (Clear Formating)، ٹیکسٹ ہائی لائٹ کلر (Text Highlight Color)، فونٹ کلر (Font Color)، کیس کی تبدیلی (Change Case)، فونٹ بڑھانا (Grow Front) اور فونٹ چھوٹا کرنا (Shrink Font) ان سبھی بٹنوں اور آپشنز کا استعمال درج ذیل طریقے سے کیا جاتا ہے۔

(i) **ٹیکسٹ کا فونٹ اور سائز بدلنا** (Changing Font and Size of a Text): آپ کسی چنے ہوئے ٹیکسٹ کا فونٹ (شکل) اور سائز بھی بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے اس ٹیکسٹ کو چن لیجیے۔ فونٹ بدلنے کے لیے فونٹ حصہ میں فونٹ کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کے تیر کے بٹن کو کلک کیجیے، جس سے فونٹ کی لسٹ تصویر WD-3.7 کی طرح کھل جائے گی۔ آپ اس میں سے کوئی بھی فونٹ کلک کرکے چن لیجیے۔ اس لسٹ میں حال ہی میں چنے گئے فونٹ سب سے اوپر دکھائے

تصویر WD-3.7: فونٹ کی ڈراپ ڈاؤن لسٹ

جاتے ہیں۔ ویسے، آپ اس لسٹ باکس میں فونٹ کا نام سیدھے بھی ٹائپ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح کسی ٹیکسٹ کے حروف کا سائز بدلنے کے لیے فونٹ حصہ میں سائز (Size) کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں یا تو سائز بتانے والا عدد سیدھے ٹائپ کیجیے یا اس لسٹ کو کھول کر اس میں سے سائز چن لیجیے۔ اس لسٹ میں صرف اہم سائز ہی دکھائے جاتے ہیں۔ ویسے آپ اس میں کوئی بھی سائز، جو آپ کے کاغذ پر چھاپا جا سکتا ہو، اس میں سیٹ کر سکتے ہیں۔

(ii) **بولڈ، ترچھا اور خط کشیدہ کرنا** (Bold, Italic and Underline): فونٹ حصہ کے بٹنوں سے کسی ٹیکسٹ کو بولڈ، خط کشیدہ یا ترچھا کرنا بہت آسان ہے۔ سب سے پہلے اس ٹیکسٹ کو چن لیجیے۔ پھر متعلقہ بٹن کو کلک کیجیے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کسی سرخی کو بولڈ یعنی موٹا کرنا چاہتے ہیں، تو اس سرخی کو چن کر 'Bold' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے سرخی کا رنگ گہرا یا موٹا ہو جائے گا۔ اسی طرح 'Italic' اور 'Underline' بٹنوں سے کسی ٹیکسٹ کو آپ علی الترتیب ترچھا اور خط کشیدہ کر سکتے ہیں۔ ورڈ میں خط کو کشیدہ کرنے کے لیے الگ الگ ڈیزائن موجود ہیں۔ Underline کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کے تیر کے بٹن کو کلک کیجیے اور لسٹ میں سے اپنا من پسند ڈیزائن چن لیجیے۔

یہاں دھیان دینے لائق بات یہ ہے کہ کچھ بٹنوں کا اثر انھیں دوبارہ کلک کرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کسی سرخی کو چن کر پہلے 'Bold' بٹن کو کلک کر کے اسے گہرا کر دیتے ہیں، تو دوسری بار وہی سرخی چن کر اسی بٹن کو کلک کرنے پر سرخی پھر سے اپنی پہلے والی شکل میں آجائے گی، یعنی اس کا گہرا پن یا موٹا پن غائب ہو جائے گا۔ اسی طرح آپ دوسرے بٹنوں کے بارے میں بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے بٹنوں کو ٹوگل بٹن (Toggle Buttons) کہا جاتا ہے۔

خاص اثر والے ایک سے زیادہ بٹنوں کو کسی ٹیکسٹ پر ایک ساتھ لاگو کر کے ان سب کا مجموعی اثر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کسی ٹیکسٹ کو چن کر پہلے اسے گہرا کرتے ہیں، پھر ترچھا بٹن بھی کلک کرتے ہیں، تو وہ ٹیکسٹ گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ ترچھا بھی ہو جائے گا۔ اس طرح آپ مختلف بٹنوں کا گروہ بھی استعمال کر کے متعدد قسم کے اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔

(iii) **فونٹ اور بیک گراؤنڈ کا رنگ بدلنا** (Changing Font and Background Colour): آپ کسی چنے ہوئے ٹیکسٹ اور اس کے بیک گراؤنڈ کا رنگ بھی بدل سکتے ہیں۔ اس سے ٹیکسٹ زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ کسی چنے ہوئے ٹیکسٹ کو دوسرے رنگوں (پیلا، گلابی، لال ہرا وغیرہ) میں ابھارنے، یعنی اس کے بیک گراؤنڈ کا رنگ بدلنے کے لیے فارمیٹنگ ٹول بار میں ہائی لائٹ (Highlight) بٹن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ رنگ چننے کے لیے اس بٹن کے تیر کو کلک کیجیے، جس سے رنگوں کی پٹی تصویر WD-3.8 کی طرح کھل جائے گی۔ اس پٹی میں سے کوئی بھی رنگ کلک کر کے چن لیجیے۔ اس سے چنا ہوا ٹیکسٹ اسی رنگ میں ابھر آئے گا اور وہ رنگ ہائی لائٹ بٹن کے اوپر نظر آئے گا۔

تصویر WD-3.8: ہائی لائٹ بٹن کی رنگ پٹی

اگلی بار اگر آپ کسی ٹیکسٹ کو اسی رنگ میں ابھارنا چاہتے ہیں، تو ٹیکسٹ کو چن کر صرف اس بٹن کو کلک کرنا کافی ہے، رنگوں کی پٹی کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہائی لائٹ کا اثر ختم کرنے کے لیے رنگوں کی پٹی کو پھر سے کھول کر اس میں سے 'No Color' آپشن کو چنیے۔

اسی طرح کسی ٹیکسٹ کا رنگ بدلنے کے لیے اس ٹیکسٹ کو چن کر فارمیٹنگ ٹول بار میں فونٹ کلر (Font Color) بٹن کے تیر کو کلک کیجیے، جس میں رنگوں کی پٹی تصویر WD-3.9 آپشن کو چنیے۔

تصویر WD-3.9: فونٹ کلر بٹن کی رنگ پٹی

اسی طرح کسی ٹیکسٹ کا رنگ بدلنے کے لیے اس ٹیکسٹ کو چن کر فارمیٹنگ ٹول بار میں فونٹ کلر (Font Color) بٹن کے تیر کو کلک کیجیے، جس میں رنگوں کی پٹی تصویر WD-3.9 کی طرح کھل جائے گی۔ اس پٹی میں سے کوئی بھی رنگ کلک کر کے چن لیجیے۔ اس سے چنا ہوا ٹیکسٹ اسی رنگ میں آجائے گا اور وہ رنگ فونٹ کلر بٹن کے اوپر بھی نظر آئے گا۔

اگلی بار اگر آپ کسی ٹیکسٹ کو اسی رنگ میں لگانا چاہتے ہیں، تو ٹیکسٹ کو چن کر صرف اس بٹن کو کلک کر دیجیے، رنگوں کی پٹی کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیکسٹ کو پھر سے کالے رنگ میں لانے کے لیے رنگوں کی پٹی کو پھر سے کھول کر اس میں سے 'Automatic' آپشن کو چنیے۔

آپ اوپر بتائے گئے سبھی اسٹائلوں اور آپشنز کا مختلف مجموعوں (Combinations) میں استعمال کر کے سیکڑوں قسم کے اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ کسی چنے ہوئے ٹیکسٹ پر اس وقت جو فونٹ، سائز، اسٹائل، خاص اثر وغیرہ لاگو ہو رہے ہوتے ہیں، وہ ٹیکسٹ چنتے ہی فارمیٹنگ ٹول بار میں دکھائے جاتے ہیں اور ٹوگل (Toggle) بٹن، جیسے بولڈ، ترچھا وغیرہ، اگر لاگو ہو رہے ہوں، تو دبے ہوئے نظر آتے ہیں، ورنہ حسب معمول نظر آتے ہیں۔

مشق کے لیے اپنی پچھلی دستاویز کو کھول کر پہلے اسے تصویر WD-2.4 کی طرح اس کی حقیقی شکل میں لائیے، یعنی آٹو فارمیٹ کا اثر اگر کوئی ہو، تو اسے ختم کر دیجیے اور پھر ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنے کے درج ذیل کام کیجیے:

1. اس وقت اس مضمون کی سرخی سیدھی ہے اور اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ اسے چن کر پہلے گہرا (Bold) کیجیے، پھر اس کا سائز بڑھا کر 14 کر دیجیے۔
2. دوسرے پیراگراف میں 'health is our real wealth' اس حصہ کو چن کر 'Italics' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے وہ فقرہ ترچھے انداز میں آجائے گا۔
3. آخری پیراگراف میں 'A sound mind resides in a sound body' اس جملے کو چنیے اور فونٹ کے لسٹ باکس کو کھولیے۔ اس لسٹ باکس میں 'Arial' فونٹ کو چن لیجیے۔ ضرورت پڑنے پر اسکرول بار کی مدد لیجیے، کیونکہ یہ لسٹ بہت لمبی ہوتی ہے اور فونٹوں کے نام انگریزی کے ترتیب وار حروف کی شکل میں ہوتے ہیں۔ فونٹ بدلنے سے یہ جملہ نئی شکل میں آجائے گا۔
4. اوپر کے جملہ کو خط کشیدہ کرنے کے لیے فارمیٹنگ ٹول بار میں 'Underline' بٹن کو کلک کیجیے۔

اس وقت آپ کی دستاویز ایم ایس-ورڈ کی ونڈو WD-3.10 کی طرح نظر آرہی ہوگی۔

اس دستاویز میں کی گئی اصلاحات کو کوئک ایکسیس ٹول بار کا 'Save' بٹن کلک

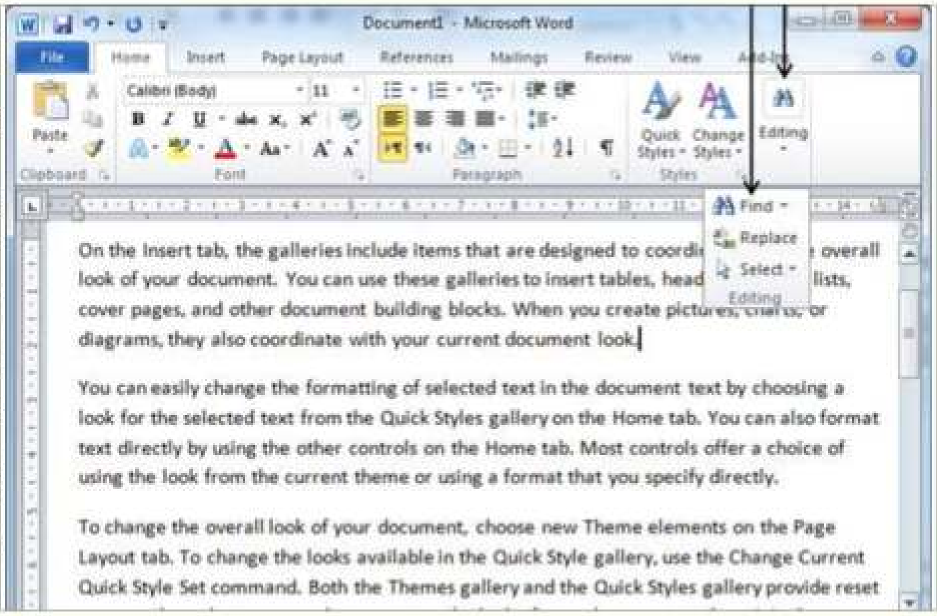

تصویر WD-3.10: ٹیکسٹ فارمیٹ کرنے کے بعد دستاویز

کرکے یا آفس مینو کی 'Save' کمانڈ دے کر محفوظ کر دیجیے۔

(iv) **استرائک تھرو، سب اسکرپٹ اور سپر اسکرپٹ (Strikethrough, Subscript and Superscript):** فونٹ حصہ میں موجود اسٹرائک تھرو (Strikethrough) بٹن سے آپ ٹیکسٹ کو کٹا ہوا اثر دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے ٹیکسٹ کو چنیے اور پھر اسٹرائک تھرو بٹن پر کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ٹیکسٹ ایک لائن کے ذریعے بیچ میں کٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ورڈ میں ٹیکسٹ کو سب اسکرپٹ (Subscript)، جیسے H_2O میں '2' اور سپر اسکرپٹ (Superscript)، جیسے X^2 میں '2' بنانے کی بھی سہولت ہے۔ ایسا کرنے کے لیے علی الترتیب Subscript اور Supersrcript بٹنوں پر کلک کیجیے۔

بولڈ، ترچھا اور خط کشیدہ بٹنوں کی طرح یہ تین بٹن بھی ٹوگل ہیں۔

(v) **کیس کی تبدیلی، فونٹ کو پھیلانا اور چھوٹا کرنا (Change Case, Grow Font and Shrink Font):** ورڈ میں آپ ٹیکسٹ کو Sentence Case (جملہ کا پہلا حرف بڑا اور باقی سبھی چھوٹے)، lowercase (سبھی حروف چھوٹے)، UPPERCASE (سبھی حروف بڑے)، Capitalize Each Word (جملہ میں ہر ایک لفظ کا پہلا حرف بڑا) اور tOGGLE cASE (جملہ میں ہر ایک لفظ کا پہلا حرف چھوٹا) میں بدل سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے سب سے پہلے ٹیکسٹ کو چنیے۔ اب کیس کی تبدیلی (Change Case) کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کے تیر کے بٹن کو کلک کیجیے۔ کھلنے والی لسٹ میں اپنا من پسند آپشن کو کلک کیجیے۔ ٹیکسٹ سیٹ ہو جائے گا۔

اگر آپ چنے ہوئے ٹیکسٹ کا سائز چھوٹا یا بڑا کرنا چاہتے ہیں، تو Font Size لسٹ باکس میں جانے کی بجائے سیدھا فونٹ بڑھاؤ (Grow Font) یا فونٹ چھوٹا کرو (Shrink Font) بٹنوں کو کلک کیجیے۔ آپ جتنی بار ان بٹنوں پر کلک کریں گے، فونٹ کا سائز اتنا ہی ایک ایک پوائنٹ چھوٹا یا بڑا ہوتا جائے گا۔

(vi) **کلیئر فارمیٹنگ (Clear Formatting):** کلیئر فارمیٹنگ (Clear Formatting) بٹن سے آپ چنے ہوئے ٹیکسٹ پر دیے ہوئے سبھی اثر مٹا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ٹیکسٹ کو چنیے اور پھر Clear Formatting بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے سے ٹیکسٹ دوبارہ اپنے حقیقی شکل میں آجائے گا۔

فونٹ کا ڈائیلاگ باکس (Font Dialog Box): آپ کسی ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنے کے لیے اوپر بتائے گئے سبھی کام ایک ساتھ بھی سیٹنگ کرکے کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے فونٹ ڈائیلاگ باکس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹیکسٹ کے فونٹ سے متعلق سیٹنگ کرنے کے لیے پہلے اس ٹیکسٹ کو چن لیجیے۔ پھر فونٹ ڈائیلاگ باکس لانچر پر کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر WD-3.11 کی طرح فونٹ کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں ٹیکسٹ کے لیے فونٹ، سائز، اسٹائل، خاص اثر وغیرہ چننے کی متعدد سہولیات ایک ساتھ دستیاب ہیں۔ ان میں کئی سہولیات ایسی بھی ہیں، جو فارمیٹنگ ٹول بار میں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ اتنا ہی نہیں، آپ کے ذریعے چنے گئے فونٹ اور دیگر آپشنز کا آپ کے ٹیکسٹ پر کیا اثر پڑے گا، اس کا نمونہ بھی اس ڈائیلاگ باکس میں نیچے کے خالی حصے میں دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے اس ڈائیلاگ باکس میں آپ آزاد ہو کر سبھی طرح کی سیٹنگ کر سکتے ہیں۔

اس ڈائیلاگ باکس میں دو ٹیب شیٹ ہیں جن میں سے ایک 'Font' ٹیب شیٹ تصویر WD-3.11 میں دکھائی گئی ہے۔ اس ٹیب شیٹ میں فونٹ، فونٹ اسٹائل، سائز، خط کشیدہ اور رنگ چننے کے لیے الگ الگ لسٹ باکس ہیں، جن میں آپ اپنی پسند سے کوئی بھی آپشن چن سکتے ہیں۔ خاص اثرات کے لیے کچھ چیک باکس بھی دیے گئے ہیں۔ آپ کے ذریعے چنے گئے یا پہلے سے ہی سیٹ ہو چکے آپشنز کا مجموعی اثر نیچے کے 'Preview' حصہ میں ایک ٹیکسٹ پر دکھایا جاتا ہے۔

فونٹ ڈائیلاگ باکس کی 'Character Spacing' ٹیب شیٹ زیادہ اہم نہیں ہے۔ اس کا استعمال کچھ دیگر خاص اثرات پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان کو آپ خود سمجھ لیجیے۔

کسی ٹیکسٹ کو سپر اسکرپٹ (Superscript)، جیسے X^2 میں '2' اور سب اسکرپٹ (Subscript)، جیسے H_2O میں '2' بنانے کے لیے بالترتیب 'Superscript' اور 'Subscript' کے چیک باکسوں کو سیٹ کر دینا چاہیے یا 'Character Spacing' کی ٹیب شیٹ کے Position لسٹ باکس میں 'Raised' اور 'Lowered' کو چننا چاہیے۔

سبھی طرح کی سیٹنگ کرنے کے بعد اس ڈائیلاگ باکس سے باہر آنے کے لیے 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آپ کے ذریعے چنے گئے سبھی آپشنز چنے ہوئے ٹیکسٹ پر لاگو ہو جائیں گے اگر آپ سیٹنگ رد کرکے فونٹ ڈائیلاگ باکس سے باہر آنا چاہتے ہیں، تو 'Cancel' بٹن کو کلک کیجیے۔ (جاری)

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

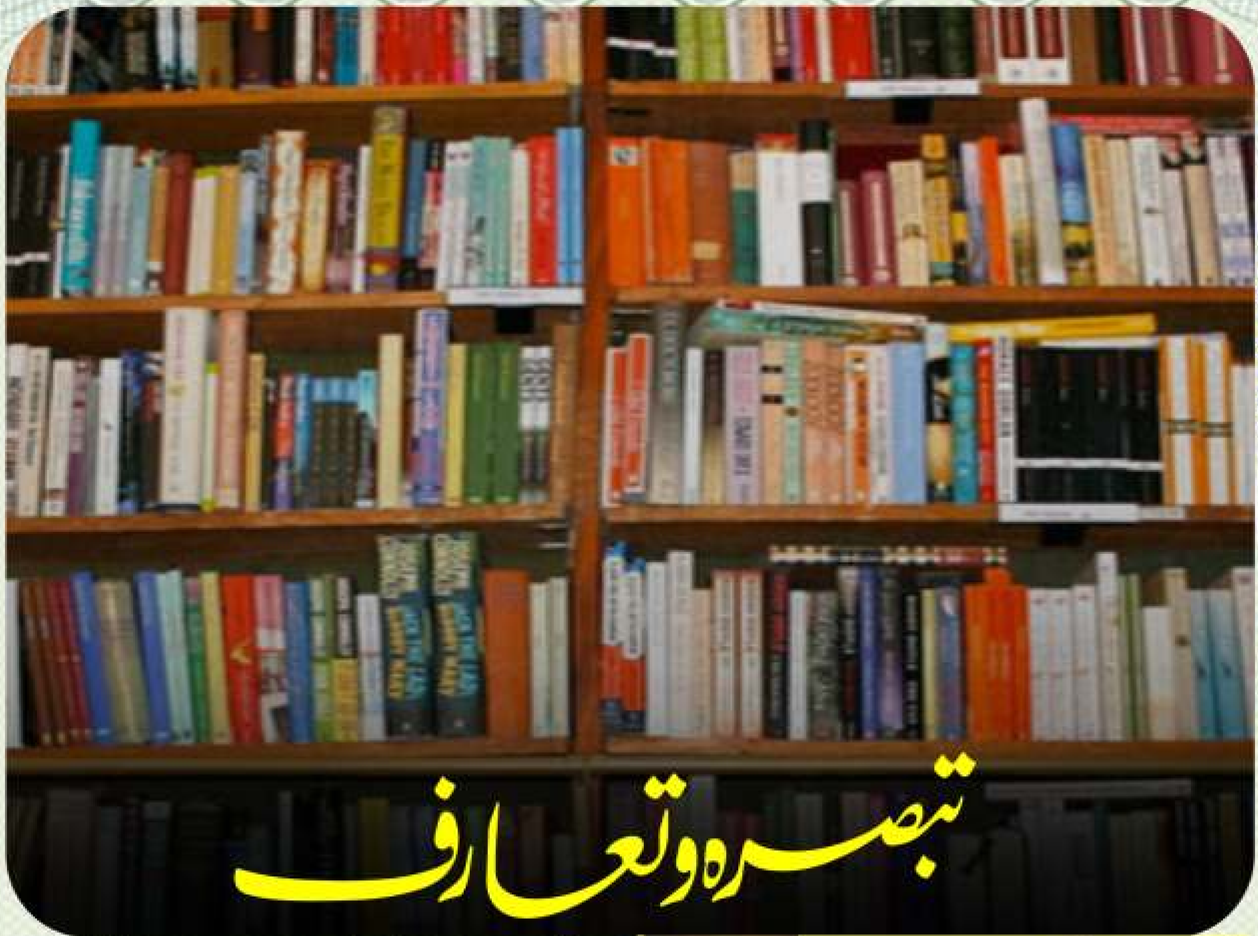

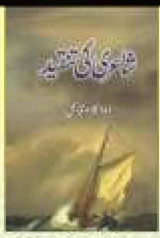

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 327 – قیمت: -/155، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 110025

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، G-5A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو اردو زبان و ادب کی تاریخ و تہذیب اور توسیع و تنقید کے حوالے سے جو اعتبار حاصل ہے، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ جدید تنقید نگاروں میں ان کا قد بہت بلند ہے۔ وہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور انگریزی ادب سے شغف رکھتے ہیں۔ پیش نظر کتاب شاعری کی تنقید اس موضوع پر ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس سے قبل ان کی عربی تنقیدی تحریروں پر مبنی 'تخلیقی تجربہ' اور مشرقی شعریات، شائع ہو کر نہ صرف مقبولیت حاصل کر چکی ہیں بلکہ اپنے موضوع کے باوصف ایک استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ تنقیدی تصورات خواہ ان کا تعلق مشرقی ادب سے ہو یا مغربی ادب سے ان کے مطالعے کا محور ہے۔ شاعری کی تنقید کا تعلق اردو شاعری کے قدیم و جدید اسالیب اور ان کی تقسیم سے ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں غزل کے اسالیب کے تحت خسرو کی غزلیہ شاعری کی حرکیات، ولی دکنی کا شعری طریق کار، خواجہ میر درد: ماورائے تصوف، غالب کا شعری لہجہ، ذوق کی غزل گوئی: ایک بازیافت، اردو غزل کی روایت میں اقبال کی انفرادیت، فراق کی غزل کے امتیازات اور جدید تر غزل کی صورت حال عناوین کے ذیل میں تمام موضوعات پر بڑی مؤثر گفتگو کی گئی ہے۔

'غالب کا شعری لہجہ' میں پروفیسر ابوالکلام کے مطابق مرزا غالب کی شاعری کی تعبیر اور قدر و قیمت کے یقین کی خاطر جن تنقیدی معیاروں کو روبہ عمل لایا گیا ہے، ان میں غالب کے بالواسطہ طرز تخاطب کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاید یہی سبب ہے کہ ہیئتی تنقید کے وہ پیمانے جو شاعری کی استعاراتی اور علامتی معنویت، کفایت لفظی اور معنوی امکانات کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں، وہ غالب فہمی کے عمل کو زیادہ راس آئے۔ دوسرا حصہ نظم کے اسالیب پر مشتمل ہے۔ جس میں کلام انیس میں پیکر تراشی کا نظام، مرزا دبیر کی فنی ہنرمندیاں، اختر الایمان کا طنزیہ اور علامتی اسلوب، نظم گوئی میں فیض احمد فیض کے امتیازات، اردو نظم نگاروں میں سردار جعفری کا امتیاز، اور باقر حیدری کا تخلیقی سرمایہ ایسے مضامین ہیں، جو راست طور پر مطالعے کے لیے اکساتے ہیں۔ فیض کے شاعرانہ ارتقا کے زمانی پس منظر کو سامنے رکھ کر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کا وہ رومانی ذہن جس میں انقلاب، بغاوت اور آدرش پسندی سب کچھ ہے۔

تیسرا حصہ تجزیہ ہے، جس میں غالب، فیض، شہریار، زیب غوری اور عرفان صدیقی کی غزلوں کے تجزیہ کے ساتھ اردو کا شعری متن اور ہمارے تعبیری رویے اور شعر، شور، انگیز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو کا شعری متن اور ہمارے تعبیری رویے ایسا مضمون ہے جس میں تعبیر متن کے حوالے سے پروفیسر ابوالکلام کی گفتگو کئی نئے ابعاد روشن کرتی ہے۔ مصنف کے نزدیک اردو میں شعری متن

کی تشریح کی کہانی اس وقت ایک عجیب مرحلے میں داخل ہوجاتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر شارحین نے محض بادی النظر میں مشکل، مبہم اور غیر واضح فطری نظر آنے والے یہ ان کے ذہن رسا کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج کی بھی دین ہے، اسے تشریح سمجھا ہے۔ ان کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ نظم کی شعریات میں ہر مصرعے اور ہر ٹکڑے کو اس وحدت کی تشکیل میں معاون ہونا چاہیے، جس کو ایک فنی کل کا نام دیا جاسکتا ہو۔

انھوں نے کتاب میں شامل تمام عناوین پر عنوان کے دائرے میں ہی گفتگو، تشریح اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ورنہ آج ایسے مصنفین کی تعداد کثیر ہے، جو گفتگو تو کسی عنوان سے شروع کرتے ہیں اور درمیان میں ادھر ادھر کی اڑا کر مضمون کی آخری سطور میں گفتگو سمیٹ کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کئی ہفت خواں سر کرلیے ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام نے جذب اظہار کے لیے بلاوجہ لفظی پیکر تراشنے کی کوئی کوشش نہیں کی، جو انھوں نے سمجھا ہے، وہی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک مصنف کے لیے یہی سب سے بڑا امتیاز ہے۔ بلاشبہ وہ شاعری کی تنقید، پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب سے نئی نسل کے شعرا کا وہ طبقہ بھی فیض حاصل کرے گا، جو شاعری کے میدان میں ابھی نو آموز ہے لیکن اونچی پرواز کے لیے پر تول رہا ہے۔

آئینہ جہاں (کلیات قرۃ العین حیدر، جلد ہفتم)

تحقیق وترتیب: جمیل اختر

صفحات: 359، قیمت: 165 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: صالحہ صدیقی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ 110025

ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'آئینہ جہاں' قرۃ العین حیدر کا کلیات ہے۔ انھوں نے اپنا افسانوی سفر 1943 میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا انھوں نے بہت کم وقت میں اپنی قابلیت اور فنی بصیرت، اپنے انوکھے انداز، تکنیک، ہیئت اور موضوعات و تلازمات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر اردو شاعری و فکشن کی دنیا میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا اور اپنی آخری سانس تک علم وادب کی خدمت کرتی رہی۔ انھوں نے پانچ افسانوی مجموعے اپنی یادگار چھوڑے، اپنے تمام افسانوی ادب کو قرۃ العین حیدر نے اپنے تجربات واحساسات کی روشنی میں قلم بند کیا۔ وہ خود ایک عورت ہونے کے ناطے عورتوں کے مسائل، ان کی نفسیات سے بخوبی واقف تھی انھوں نے اپنی تخلیق میں ان موضوعات کو برتا جن کا تعلق سماج کے ہر طبقے سے ہے۔ انھوں نے نوکر، کرایہ دار، ادنیٰ واعلیٰ، سماجی بھید بھاؤ، جیسے موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ حقیقت پسندی، مکتوباتی نظام، تشبیہات و استعارات، خطابیہ انداز، فطرت سے لگاؤ، رومانی آرائشگی، حسن پرستی، تخیل کی پرواز، سماج کی سچائیاں ان کی تخلیقات کا اہم وصف ہیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے ناولوں کے باعث بہت مقبول ہوئیں خصوصا خواتین ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے جو اردو فکشن میں عظیم الشان حیثیت کی حامل خاتون ہے۔ ان کی شہرت زیادہ تر اس نئی تکنیک کے سبب ہے جسے شعور کی رو کہا جاتا ہے، ان سے پہلے اردو ادب میں اس تکنیک کے استعمال کا عمدہ نمونہ نہیں ملتا۔ ان کا ادبی کارنامہ تقریباً چھ دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ ان کا ادبی کینوس نہایت وسیع ہے۔ یہی نہیں ان کے موضوعات کے دائرے میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے ناول اور افسانوں دونوں ہی میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، اور نفسیاتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے، یوں تو ان کے سبھی ناول اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے مقبول ومعروف ناولوں کی فہرست میں 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غم دل'، 'آگ کا دریا'، 'آخر شب کے ہم سفر'، 'کار جہاں دراز ہے'، 'گردش رنگ چمن' اور 'چاندنی بیگم' شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورت کے کئی روپ دکھائے ہیں۔ قرۃ العین حیدر ایک مقام پر یوں رقم طراز ہیں کہ:

''ازل سے اب تک عورت ہی وہ مخلوق ہے جس کی قسمت میں ساری بدنصیبیاں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ عورت ہی ہے جو ساری عمر مرد کی مختلف قسموں سے محبت کرنے کے بعد بھی ٹھکرا دی جاتی ہے۔ کبھی مرد اسے شوہر کے روپ میں ٹھکرا دیتا ہے۔ کبھی بیٹا ماں کے روپ میں، محبوب محبوبہ کے روپ میں لیکن عورت اس کے باوجود ان تمام مختلف رویوں سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو اپنی بے چارگی، اپنی مجبوریوں اور مایوسیوں کا رونا رونے کے لیے گرجا گھروں، مندروں، تیرتھ استھانوں، درگاہوں، اور مزاروں میں جاتی ہے اور اپنی بے بسی کا شکوہ کرتی ہیں۔'' (یادوں کی دھنک جلے، ص 136)

ناولوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کے لیے کہانیاں اور تراجم کے کام بھی انجام دیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غیر نثری اصناف میں پانچ ناولٹ اور گیارہ رپوتاژ بھی تحریر کیے۔ قرۃ العین حیدر ہمہ جہت شخصیت کی مالک تھیں انھیں فکشن کے علاوہ مصوری اور موسیقی کا بھی شوق تھا۔ وہ صحافت سے زندگی بھر وابستہ رہیں۔ زیر نظر کتاب قرۃ العین حیدر کو قریب سے جاننے سمجھنے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے بڑی حسن وخوبی ترتیب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے تحقیق وترتیب نگار ڈاکٹر جمیل اختر کے سلسلے میں اس کتاب میں رقم ہیں کہ ''ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق مصنف اور نقاد ہیں فکشن کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''

بہرحال امید ہے اس کتاب کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا اور جمیل اختر کی اس نئی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یقیناً یہ کتاب قرۃ العین حیدر کو چاہنے والوں کے لیے نایاب تحفہ ہے جس کے لیے قومی کونسل اور جمیل اختر دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

جہات سرسید

مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی

صفحات: 120، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز دہلی۔

مبصر: ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی، شعبہ ترسیل عامہ (ماس کمیونی کیشن) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر شمس بدایونی کی پہچان اردو ادب میں ایک محقق کے طور پر ہوتی ہے۔ ایک زمانے تک آپ بدایوں سے ادبی و علمی جریدہ 'روشن' بھی نکالتے رہے، غالب اور شبلی شناس کے طور پر بھی آپ کا ایک امتیازی مقام ہے۔ آپ کے علمی مقالات نے ان دونوں ادبی شخصیات پر تحقیق کے نئے در وا کیے۔ اردو ادب کی مختلف شخصیات کے حوالے سے بھی آپ نے علمی حلقوں کو ایسی تحریروں سے نوازا جن پر محققین کی نظریں کم گئی ہیں۔ اس کا بین ثبوت ان کی حال میں تصنیف کردہ کتاب 'جہات سرسید' ہے۔ یہ کتاب سرسید کی دوصد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع ہوئی اور سرسیدیات کے تعلق سے پانچ اچھوتے مقالات [تجاویز سرسید اور تاریخ رموز اوقاف، سرسید کے خطابات، مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ، کتاب فقرات یعنی صد پند فارسی، سرسید کے کمیاب مجموہائے خطوط] اس کتاب میں شامل ہیں۔

کتاب کا پہلا مقالہ 'تجاویز سرسید اور تاریخ رموز اوقاف' تاریخی نوعیت کا ایک اہم علمی و تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں مصنف نے سرسید کے رموز اوقاف سے متعلق ایک مضمون کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں رموز اوقاف کی تاریخ پر سرسید سے قبل اور ان کے بعد اہل علم کی پیش کردہ تجاویز اور مشوروں کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے اور اس تعلق سے سرسید کے امتیازات کو واضح کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزی رموز اوقاف کو رواج میں لانے میں سرسید کی اولیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ، ڈنکن فاربس، شیخ امام بخش صہبائی، سرسید، مولوی عبدالحق، رشید حسن خاں، گیان چند جین کی ان علامتوں سے متعلق تجاویز کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان کے ذریعہ استعمال کی گئی علامتوں کی تعداد کو نقشے کے ذریعہ پیش کیا ہے کہ کس طرح توقیف نگاری کے سفر میں مذکورہ محققین نے غور و فکر کرکے ان کے اردو نام اور ان کے استعمال کی صورتیں طے کردی ہیں۔ یہ مقالہ بنیادی طور پر رموز اوقاف کے تعین کی تاریخ پیش کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ موجودہ مستعمل رموز اوقاف سے پیشتر کیا صورت حال تھی۔ اور ان علامتوں کو رموز اوقاف کا نام کس نے دیا۔

کتاب کا دوسرا اہم مقالہ سرسید کو ملے خطابات و اعزازات سے متعلق بعنوان 'سرسید کے خطابات' ہے۔ میری نظر میں مذکورہ مقالے کو اس موضوع پر اولیت حاصل ہے جس میں ڈاکٹر شمس بدایونی نے سرسید کو مغل دربار سے لے کر انگریزی حکومت کی جانب سے جن خطابات اور اعزازت سے نوازا گیا اس کی تفصیلات بڑی عرق ریزی سے دستاویزی شواہد کے ساتھ جمع کردی ہیں، یہ ایک بڑا کام ہے کیونکہ اس سے قبل اس موضوع پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی اور نہ ہی اس پر کسی نے روشنی ڈالی۔

کتاب کا تیسرا مقالہ بعنوان 'مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ' ہے۔ اس میں مصنف نے قلمی مجموعہ خطوط، [مکتوبہ سرسید بنام حکیم احمد الدین] کا نہ صرف معروضی جائزہ پیش کیا ہے، بلکہ اس واحد قلمی نسخے کے حصول اور ترتیب و تدوین کی روداد کو بھی قلم بند کیا ہے۔ مصنف کے مطابق قلمی خطوط کا یہ مجموعہ پروفیسر آل احمد سرور اور جے پور کے احترام الدین احمد شاغل کی مدد سے 1957 میں مولانا آزاد لائبریری کے لیے خریدا گیا۔

مصنف نے اس کتاب میں ایک مقالہ سرسید کا تالیف کردہ ایک مختصر رسالہ 'کتاب فقرات یعنی صد پند فارسی' پر بھی پیش کیا ہے۔ کتاب فقرات فارسی کی سو اخلاقی اقوال کا مجموعہ ہے۔ جس کو سرسید نے مرادآباد میں ان کے ذریعہ قائم کیے گئے مدرسہ کے نصاب تعلیم کے لیے صد پند لقمان کی طرز پر مرتب کیا اور اسے 'کتاب فقرات' کا نام دیا تھا۔ فاضل محقق نے اس مقالے میں نہ صرف کتاب فقرات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے بلکہ مرادآباد کے مدرسہ کی بھی مکمل تاریخ کو بیان کردیا ہے۔ ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں: 'ان اقوال کا سیرت کی تعمیر اور اخلاق کے حصول سے گہرا تعلق ہے۔ ان میں انسانی تجربے بھی بیان کردیے گئے ہیں اور مذہبی فکر بھی۔ خدا سے بندوں کے رشتوں اور آخرت کی بنیادی حقیقت کو بھی انھی فقرات میں بیان کردیا گیا ہے۔' مصنف کا یہ کہنا درست ہے کہ سرسید کے قیام مرادآباد کا سرسید تحریک کی روشنی میں مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے سے کئی اہم باتیں سامنے آسکتی ہیں۔

مذکورہ تصنیف کا آخری مقالہ 'سرسید کے کمیاب مجموعہ ہائے خطوط' ہے۔ مصنف نے سرسید کے خطوط کے پانچ کمیاب و نایاب مجموعوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں پہلا 'تحریر فی اصول التفسیر، مرتبہ سرسید احمد مطبع مفید عام آگرہ 1882 ہے۔ یہ اصول تفسیر سے متعلق سرسید اور محسن الملک کے مابین مراسلت پر مشتمل ہے۔ دوسرا مجموعہ 'سرسید کے چند نادر خطوط'، مرتبہ احمد حسین یعقوبی مطبوعہ، میرٹھ، 1900 ہے اور تیسرا 'سرسید کے خطوط'، مرتبہ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی، حالی پریس پانی پت ہے۔ چوتھا مجموعہ 'مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن'، مرتبہ محمد عثمان مقبول، جس میں مسئلہ دعا واستجاب اور اصول تفسیر سے متعلق سرسید اور محسن الملک کے درمیان خط و کتابت کو جمع کردیا گیا تھا۔ جو مطبع احمدی، علی گڑھ نے 1915 میں شائع کیا۔ 'خطوط سرسید'، یہ سرسید کے ایک عزیز حکیم احمد الدین کے مرتب کردہ ہے، جس کو ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر نے 1995 میں لیتھو کلر پرنٹنگ پریس علی گڑھ سے شائع کرکے متعارف کرایا۔

پیش نظر کتاب متعلقات سرسید پر ڈاکٹر بدایونی کی ایک گراں قدر تحقیقی تصنیف ہے، جس پر ماہر سرسیدیات پروفیسر اصغر عباس اور پروفیسر شافع قدوائی نے اپنے تاثرات بھی رقم کیے ہیں۔ پروفیسر شافع قدوائی کے بقول ''کتاب کے تمام مضامین تحقیقی دقت نظری کا قابل قدر نمونہ پیش کرتے ہیں اور سرسید فہمی کی ایک نئی روایت کی آبیاری کرتے ہیں۔'' یہ کتاب کل 120 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں 100 صفحات علمی مضامین اور 18 صفحات ان مضامین سے متعلق نادر کتابوں کے سرورق کی عکسی تصاویر اور دیگر متعلقات کی تصویروں سے مزین ہیں۔ کتاب مجلد مع گرد پوش خوبصورت کتابت اور طباعت سے آراستہ ہے۔

تنقیدی اساس

مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 160، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: زبیر احمد بھاگلپوری، اردو سکشن، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ

اردو میں زود نویس قلم کاروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن زود نویسی کا ہنر جن چند معروف تخلیق کاروں کے حصے میں آیا، ان میں تالیفات و تصنیفات کی بہت پہلے ہی ڈبل سنچری لگا چکے اردو میدان کے بریڈ مین پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا نام سرفہرست ہے۔ یہ سوال کہ کس صنف ادب سے ان کا رشتہ ہے، غیر موزوں ہے، ان کا تعلق کس صنف سخن سے نہیں ہے، یہ زیادہ مناسب ہے۔ وہ بیک وقت ایک نقاد، شاعر، افسانہ نگار، ماہر ادب اطفال، ماہر لسانیات اور ظرافت نگار کے ساتھ ساتھ ایک باکمال نعت گو شاعر

بھی ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف 'تنقیدی اساس' 19 پر مغز اور فکر انگیز مقالات پر مشتمل ہے اور بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔ ان کے بیک فلیپ پر ایسی 35 کتابوں کی فہرست درج ہے جو مختلف شعبہ ہائے ادب کی ان کی گرانقدر خدمات پر مشتمل ہے۔

یوں تو متذکرہ پیشکش کو انہوں نے 'تنقیدی اساس' کے نام سے معنون کیا ہے جس سے بادی النظر میں اس کے انتقادی نگارشات پر مشتمل ہونے کا فطری احساس پیدا ہوتا ہے لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ اس کے محتویات کے تقریباً نصف حصے کا علاقہ تحقیق و تلاش کے شعبے سے ہے۔ سات سمندر پار کا ہم عصر اردو ادب، اردو غزل میں وحدۃ الوجودی عقید، جدید اردو غزل میں زلزلہ، منٹو کے افسانوں میں گالی، ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں اردو کا ذکر' کربل کتھا یادہ مجلس، قمر گوالیاری کی ادبی تاریخ کی سند اور 'ہندی کا پہلا اخبار' جیسے مقالات کے عناوین سے ہی واضح ہے کہ ان کا داخلی مواد تنقیدی اساس کا نہیں، تحقیقی نوعیت کا حامل ہے۔ اسی طرح، سید محمد اشرف کے ناول آخری سواریاں میں معصوم جذبے کی لذت آفرینی، شکیل الرحمن کی 'یہ باتیں ہماری'، اور' قمر گوالیاری کی ادبی تاریخ کی سند' دراصل بشکل مقالہ کتابوں پر لکھے تفصیلی تبصرے ہیں۔

تحقیقی زمرے میں شامل مقالات معلومات افزا (Informative) ہیں۔ مقالہ نگار نے موضوعات کے ذیل میں آنے والی تمام تر جزئیات پر اس قدر متعلقہ درکار مواد فراہم کردیا ہے کہ قاری کو اس کے مطالعے سے گزرتے ہوئے کسی قسم کی تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ کتاب کا پہلا مقالہ 'اردو تحقیق اور انٹرنیٹ' مخلصانہ تحقیقی روش اختیار کرتے ہوئے اردو کے تازہ ترین ٹاپک پر لکھا گیا ایک ایسا مقالہ ہے جو لسانی اغلاق کے باوجود خصوصاً شعبۂ تحقیق کے متلاشیوں کے لیے تحقیقی عمل کی چلچلاتی دھوپ کے درمیان ٹھنڈی ہوا کا ایک راحت بخش جھونکا ثابت ہوگا۔ ان کا دوسرا مقالہ بعنوان 'سات سمندر پار کا ہم عصر اردو ادب' بھی کم اہمیت کا حامل نہیں، یہ مقالہ نہ صرف بین الاقوامی سطح پر اردو زبان وادب کے وسعت پذیر دائرۂ اثر سے آگہی بہم پہنچاتا ہے بلکہ یورپ، امریکہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک کی اردو سرگرمیوں کا برصغیر ہندو پاک کے اردو کار پردازوں کو آئینہ دکھا کر اپنی ثقافتی زبان اردو کی نشر و اشاعت کے لیے مہمیز بھی کرتا ہے۔

سید محمد اشرف کا ناول 'آخری سواریاں' اپنی رفیقۂ حیات عصمت کے نام لکھے 17 خطوط پر مشتمل شکیل الرحمن کی 'یہ باتیں ہماری' اور گوالیار کی لسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی شعری وادبی عظمت پر محیط قمر گوالیاری کی 'گوالیار اور اردو زبان وادب' جیسی کتابوں پر جو مقالہ نما تبصرے شامل ہیں، وہ قلم کاری کی فنی واسلوبیاتی مہارت کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ ان کی مرکز رخی (Centripetal) فکری اڑان اور موضوع کے حوالے سے نظریاتی سیلان کی عنوان کے اردگرد ہی گردش مقالے کو چست درست اور صحت مند بناتی ہے۔ تنقیدی یا تحقیقی مقالے اظہار حقائق کے ساتھ بامعنی تجزیے کی اساس پر ہی اعتبار حاصل کرتے ہیں۔

دیگر مقالات میں 'راجندر سنگھ بیدی کی طنز نگاری'، 'جوگندر پال کے ناولوں میں جڑوں کی تلاش'، ریگا: فراز حامد اور کوثر صدیقی' اور کامران غنی کی شاعری میں بازیافت کی ارضیت" صوری اور سیری دونوں لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

ان تمام اختصاصات کے باوجود پروف کے اقسام سنجیدہ ذہن میں دوران مطالعہ بدمزگی پیدا کرتے ہیں۔ سرسری قرأت سے ہی محسوس ہونے لگتا ہے کہ کتاب کی سرے سے تصحیح کاری کی ہی نہیں گئی۔ علاوہ ازیں نحویاتی زاویۂ نگاہ سے (Syntactically) بہت سے جملوں کی بے ربطگی بھی وقیع مقالے کی عظمت میں رکاکت پیدا کرتے ہیں۔

جیسا کہ آغاز گفتگو میں ذکر ہوا، زود نویسی سے بسا اوقات معیار فن متاثر ہوتا ہے اور تخلیقی وادبی توازن نشیب وفراز کا شکار ہوتا ہے۔ اس کا اثر کتاب میں شامل چند نگارشات پر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کم از کم اس کے دو مقالے 'اردو غزل میں وحدۃ الوجودی عقیدہ' اور منٹو کے افسانوں میں 'گالی' کے مطالعے سے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ 'وحدۃ الوجود' تصوف کا ایک مخصوص موضوع ہے جس پر بحث کرتے ہوئے ان کی عنوان گریز فکروں کا میلان تصوف کی عام جزئیات کی طرف گم گشتہ نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے بطور استدلال مقالے کے آغاز میں جو چند اشعار پیش کیے ہیں، ان کا بھی 'وحدۃ الوجود' سے کوئی رشتہ نہیں۔ اسی طرح موخر الذکر مقالے بعنوان "منٹو کے افسانوں میں 'گالی' میں مقالہ نگار کا ابتدائی طرز اظہار بھی ان کے ادبی وقار کو مجروح کرسکتا ہے۔ آغاز مضمون میں یہاں اصل موضوع پر بحث کی بجائے ان کے ذریعہ لفظ 'گالی' سے بننے والے 20 محاوروں کا مع تشریح اندراج غیر ضروری زوائد کے دائرے میں دخیل نظر آتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر کئی لحاظ سے عام قاری اور تحقیق کے طلبہ کے لیے 'تنقیدی اساس' کافی معنویت اور اہمیت کی حامل ہے۔

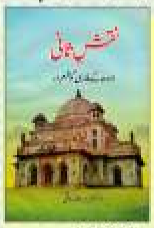

نقش ثانی (اودھ کے فارسی گو شعرا)

مصنفہ: ڈاکٹر زہرہ فاروقی

صفحات: 208، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ڈاکٹر زہرہ خاتون

مبصر: رضوان اللہ، D-187 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

شمالی ہند میں خطۂ اودھ ایک تہذیبی شناخت رکھتا ہے لیکن اس شناخت کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے حدود زمانی کا قطعی تعین نہیں کیا جاسکتا تاہم وثوق کے ساتھ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نوابین اودھ کا دور جو 134 برس پر محیط ہے اس تہذیب کے عروج کا دور تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کوئی ایک درجن نوابین اودھ کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ انھوں نے ادب نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

ڈاکٹر زہرہ فاروقی (زہرہ خاتون) نے اودھ کا عموی اور ادب نواز نوابین کے عہد زریں کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور اس بحر مواج سے جو گہرہائے آبدار ان کے ہاتھ آئے ہیں انھیں دو تصنیفات کی صورت میں گوہر شناسان ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ پہلی تصنیف 'اودھ کے فارسی گو شعرا' نے 2003 میں شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کی اور اب 'نقش ثانی' پیش ناظرین ہے۔ ان دونوں اشاعتوں کے درمیان ایک طویل وقفہ کی تاویل مصنفہ نے حرف آغاز کے زیر عنوان اپنی تحریر میں خود بیان کی ہے۔

اول الذکر تصنیف میں ایک سو شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام کے نمونے شامل ہیں اور اس دوسری تصنیف میں مزید ایک سو شعرا کے احوال اور کلام کے نمونے شامل کیے گئے ہیں گویا اس دوسری کتاب کو پہلی کتاب کی تکمیلی شکل کہا جاسکتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کو نقش ثانی کا عنوان دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کو بھی اپنی پیشرو کی طرح مقبولیت حاصل ہوگی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابوں کو طالبان علم کے لیے ایک قابل اعتماد حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ عین ممکن ہے کہ اودھ کے اس دفینے میں ابھی کچھ اور لعل وگہر کسی فرہاد کے منتظر ہوں۔

"نقش ثانی" میں نوابین اودھ کے سوانحی خاکے کی شمولیت اور علمائے اودھ کی دینی خدمات کے تذکرے نے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ آخر میں اس تصنیف کے ماخذ کے طور پر جن کتابوں کی فہرست ہے ان کی تعداد 65 ہے۔ اردو میں ان کتابوں کے علاوہ حوالے کی بارہ کتابیں انگریزی میں ہیں ان کے علاوہ چند رسالے اور پندرہ مائیکرو فلمز ہیں۔ سابقہ کتاب 'اودھ میں فارسی گو شعرا' میں حوالے کی کتابوں کی فہرست میں تقریباً دو سو کتابیں شامل ہیں۔ چنانچہ ان دونوں تصنیفات میں شامل حوالے کی کتابوں کی یہ طویل فہرست تحقیقی مطالعہ کرنے والے اور تحقیق کے طلبہ کی خاصی رہنمائی کرسکتی ہے۔

مناسب ہوگا اگر ڈاکٹر زہرہ فاروقی اپنی تدریسی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ان تذکروں کے فارسی میں ترجمہ پر بھی صرف کریں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہی کہ دنیائے فارس میں ان کتابوں کا اور مصنفہ کا تعارف ہو جائے گا، دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ شاید دنیائے فارس کو ہندوستان کے صرف ایک خطے میں اور وہ بھی ایک محدود زمانے میں فارسی زبان و ادب کی اتنی عمومیت اور مقبولیت پر حیرت ہوگی۔ حیرت تو آج ہندوستان میں بھی لوگوں کو ہونی چاہیے۔ اب دنیائے فارس ایران تک محدود نہیں رہی یہ افغانستان سے لے کر اطراف و اکناف کے کوئی نصف درجن ممالک پر سایہ فگن ہے۔ یورپ میں جابہ جا اس کی نوآبادیاں نظر آرہی ہیں۔ بیک وقت پھیلتی سمٹی دنیا کے آپسی لین دین میں بھی فارسی زبان کے اثرات پھیلتے ہوئے صاف نظر آرہے ہیں، اس لیے مستقبل شناسوں کو اس راہ میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کتب فروشوں کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی میں بھی دستیاب ہے۔

اردو میں تلفظ: معنویت اور مسائل

مرتب: یوسف رامپوری

صفحات: 264، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: پاکیزہ اختر، ریسرچ اسکالر، مانو، حیدرآباد، سرینگر کیمپس

اردو میں تلفظ کی اہمیت و معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ درست تلفظ سے جہاں درست معانی و مفاہیم تک رسائی حاصل ہوتی ہے، وہیں زبان کی شیرینی بھی قائم رہتی ہے۔ تلفظ کے بگڑنے کی صورت میں بھی الفاظ کے معنی بدلتے ہیں تو کبھی الفاظ اپنی کشش کھو دیتے ہیں، اسی لیے ماہرین لسانیات تکلم یا متن کی قرأت کے دوران احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ اردو میں تلفظ جس قدر اہم ہے، اسی قدر دشوار اور پیچیدہ عمل بھی ہے۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ بہت سے لوگ تلفظ کو پیچیدہ عمل سمجھ کر کے اسے لائق اعتنا خیال نہیں کرتے اور تلفظ کی سطح پر بے اعتدالیوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ایک عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ نئے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اس موضوع پر باضابطہ سیمناروں اور ورکشاپوں کا انعقاد عمل میں آئے اور کتب و مقالات تحریر کیے جائیں۔ حال ہی میں اس نوع کی ایک کوشش ڈاکٹر یوسف رامپوری کی کتاب 'اردو میں تلفظ: معنویت اور مسائل' کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

پیش نظر کتاب میں اردو تلفظ کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں مستعمل فارسی و عربی الفاظ کے تلفظ و املا کے حوالے سے پروفیسر علیم اشرف خان اور ڈاکٹر محمد جسیم الدین قاسمی کے مضامین شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ علیم اشرف خان فارسی کے اور جسیم الدین قاسمی عربی کے ماہر ہیں۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے اردو میں مستعمل عربی اور فارسی الفاظ کے تلفظ کے حوالے سے تشفی بخش رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اردو الفاظ کے صحیح تلفظ کے لیے اردو کے صوتی نظام کے تعلق سے فاروق اعظم کا مضمون 'اردو کا صوتی نظام' اہم ہے۔ درست تلفظ تک رسائی کا ایک ذریعہ لغت کی کتابوں کو خیال کیا جاتا ہے۔ مگر فی الواقع لغت کی کتابیں کس حد تک تلفظ کے باب میں معاون ثابت ہو رہی ہیں اور ان میں کس قدر تشنگی موجود ہے، اس حوالے سے کتاب میں شامل 'اردو لغت میں تلفظ کی صورت حال' اور 'روہیل کھنڈ اردو لغت' گراں قدر مضامین ہیں۔ میڈیا اور سوشل میڈیا میں اردو الفاظ کے تلفظ کے مسائل پر دو مضامین 'سوشل میڈیا پر اردو تلفظ اور لفظیات کی حالت زار' اور 'قومی میڈیا اور اردو زبان (تلفظ کے حوالے سے)' شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ کتاب میں عالمی اور علاقائی سطح پر بھی تلفظ کے مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔ مثلاً فی زمانہ اردو میں عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی کے الفاظ بھی استعمال ہو رہے ہیں اور علاقائی زبانوں و بولیوں کے بھی، ان لفظوں کو کس طرح بولا جائے گا، اس تناظر میں 'اردو میں انگریزی الفاظ کا تلفظ' اور 'اردو پر کھڑی بولی کے اثرات' جیسے مضامین سے رہنمائی ملتی ہے۔ کشمیر میں اردو تلفظ پر علاقائی اثرات کے سبب اردو الفاظ کی ادائگی پر غلام نبی کمار کا مضمون 'کشمیر میں اردو تلفظ کے مسائل' خاصا معلوماتی ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی اہم پہلوؤں پر عمدہ مضامین کو کتاب میں جگہ دی گئی ہے جن سے تلفظ کے بعض مسائل یقینی طور پر حل ہوتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں ایک فرہنگ اُن الفاظ پر مشتمل ہے جن کے غلط تلفظ سے معنی بدل جاتے ہیں۔ اس فرہنگ سے وہ لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جو تلفظ کی سطح پر غیر یقینی صورت حال سے دوچار رہتے ہیں۔ دوسری فرہنگ ان عربی الفاظ پر مشتمل ہے جن کا اردو میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ فرہنگ کتاب کے مرتب ڈاکٹر یوسف رامپوری نے کافی محنت سے تیار کی ہے۔ عربی الفاظ کے تلفظ میں تردد کی صورت میں اس فرہنگ کی طرف مراجعت فائدے سے خالی نہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کی روح اس کا مقدمہ ہے جسے مرتب نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ لکھا ہے اور تلفظ کی بحث چھیڑ کر اس کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کا مفصل و مدلل احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے تلفظ کی ضرورت پر گفتگو کی ہے کہ آیا تلفظ کی درستگی کتنی ضروری ہے، اس کے بعد تلفظ کی سطح پر ہونے والی اغلاط کی نوعیتوں کی نشاندہی کی ہے اور ان غلطیوں کی وجوہات کی جستجو بھی کی ہے۔ اس کے بعد تلفظ کے مسائل کے حل سے متعلق جامع تدابیر و تجاویز کو قلمبند کیا ہے۔ گویا کہ مقدمہ میں مرتب نے صرف تلفظ کے مسئلے کو اٹھایا ہی نہیں ہے بلکہ اس کو حل کرنے کی سعی بھی کی ہے اور آسان طریقوں کی دریافت کر کے طلبا کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔

مقدمے میں جن نکات کو یوسف رامپوری نے اٹھایا ہے اور جس باریکی سے ان پر بات کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ تلفظ پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ تلفظ کے تعلق سے ان کے ذریعہ پیش کردہ باتوں کو معتبر مانا جاسکتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کی بعض باتوں سے اختلاف کی بھی گنجائش موجود ہے مگر مجموعی طور پر زبان کے حوالے سے ان کی مہارت قابل تسلیم ہے۔ اگرچہ یہ کتاب مضامین کا مجموعہ ہے، مگر مضامین اور ان کی ترتیب کو سامنے رکھ کر بات کی جائے تو اسے اردو تلفظ کے موضوع پر ایک مستقل اور اہم کتاب کہا جاسکتا ہے۔ کتاب کا سب سے موثر پہلو یہ ہے کہ اس میں اردو والوں کو تلفظ کے حوالے سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور انھیں اس کام کو آگے بڑھانے کی طرف لے جانے کے لیے راغب کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں کتاب کو تلفظ کے تعلق سے اہم ضرور کہا جاسکتا ہے مگر آخری نہیں۔ اداروں کو اس طرف ضرور متوجہ ہونا چاہیے۔

کتابت و طباعت عمدہ اور ٹائٹل دیدہ زیب ہے، البتہ کہیں کہیں پروف کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اردو کے طالب علموں کو اس کتاب سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

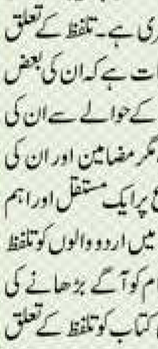

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو تنقید و تحقیق

مرتب و ناشر: پروفیسر آفاق حسین صدیقی

صفحات: 168، قیمت: 111 روپے

مبصر: عبدالباری قاسمی پتہ: C-145/1 گراؤنڈ فلور طیب لین نزد طیب مسجد شاہین باغ جامعہ نگر اوکھلائی دہلی 110025

مدھیہ پردیش ایک تہذیبی، تاریخی اور خوبصورت صوبہ ہونے کے ساتھ علمی اعتبار سے بھی کافی ثروت مند رہا ہے کئی نامور علمی ہستیوں کا تعلق اس صوبہ سے رہا ہے، آزادی

کے بعد دیگر اصناف کی طرح اردو تنقید و تحقیق کے حوالے سے بھی اس صوبہ میں بہت عمدہ اور نمایاں کارنامے انجام دیے گئے، انھی کاوشوں اور کارناموں پر مشتمل پروفیسر آفاق حسین صدیقی کی کتاب ہے 'آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو تنقید و تحقیق' پروفیسر آفاق حسین صدیقی کی مرتب کردہ اس کتاب میں آزادی کے بعد صوبہ مدھیہ پردیش میں اردو تنقید و تحقیق کے حوالے سے جو کارنامے انجام دیے گئے ہیں خواہ وہ مختلف اصناف میں تنقید و تحقیق کے اعتبار سے ہوں، ادوار کے اعتبار سے ہوں یا مدھیہ پردیش سے تعلق رکھنے والے ناقدین ومحققین کے اعتبار سے، ان تمام کارناموں سے متعلق متعدد اہم قلمکاروں کے مضامین و مقالات کو مرتب کرکے پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے ایک کتابی شکل میں جمع کردیا ہے۔

اس کتاب میں 22 مضامین ہیں، جن میں سے کچھ تو آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں تنقیدی اور تحقیقی کارناموں کا جائزہ پیش کرتے ہیں، 'آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو تنقید و تحقیق کا منظر نامہ'، 'آزادی کے بعد برہانپور میں اردو تحقیق و تنقید ایک جائزہ' اور 'مدھیہ پردیش میں اردو ڈرامے کی تنقید و تحقیق آزادی کے بعد' تنقید و تحقیق سے متعلق ہیں، اس کے علاوہ کچھ مضامین کا تعلق مختلف اصناف سے ہے، جیسے اقبالیات، اردو ڈرامہ اور خواتین وغیرہ، ان موضوعات پر مدھیہ پردیش میں جو تنقیدی اور تحقیقی کارنامے انجام دیے گئے ہیں، ان کا بھی تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

کچھ مضامین ایسے ہیں جن میں مدھیہ پردیش کے تحقیقی مراکز اور یونیورسٹیوں میں انجام پانے والے تحقیقی وتنقیدی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلے میں 'آزادی کے بعد مدھیہ پردیش کی یونیورسٹیز میں اردو تنقید و تحقیق ایک جائزہ' عمدہ مضمون ہے۔ کچھ مضامین کا تعلق صوبہ مدھیہ پردیش کے چند مخصوص خطوں اور علاقوں سے ہے، جن میں اہم تحقیقی اور تنقیدی کارنامے انجام دیے گئے ہیں، جبکہ کچھ مقالات کا تعلق براہ راست پورے صوبے سے ہے۔

علاقائی اور مختلف اصناف کی تنقید و تحقیق کے علاوہ مرتب کتاب نے کچھ ایسے مضامین کو بھی شامل کتاب کیا ہے، جن میں مدھیہ پردیش کے یا مدھیہ پردیش میں رہ کر تحقیقی اور تنقیدی کارنامے انجام دینے والے حضرات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں مرتب کتاب نے تین طرح کے محققین اور ناقدین کو شامل کیا ہے، ایک وہ محققین ونقاد جن کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کی ابتدا مدھیہ پردیش سے ہوئی مگر بعد میں دیگر ریاستوں میں انھوں نے خدمات انجام دیں، اس طرح کے ناقدین ومحققین میں اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد فاروقی، شمیم حنفی اور مظفر حنفی وغیرہ کے نام شامل ہیں، دوسرے وہ ناقدین ومحققین جنھوں نے تحقیق وتنقید کے حوالے سے کام کی ابتدا تو دیگر ریاستوں میں کی تھی، مگر عملی اعتبار سے بعد میں اصل کارنامے اسی صوبے میں انجام دیے، اس طرح کے نقاد اور محققین میں نیاز فتحپوری، ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر عبدالودود وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

تیسرے وہ ناقدین ومحققین، جنھوں نے تعلیم بھی مدھیہ پردیش میں ہی حاصل کی اور تنقیدی وتحقیقی کاموں کے لیے میدان عمل بھی مدھیہ پردیش کو ہی بنایا اس طرح کے ناقدین و محققین میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر حامد حسین، ڈاکٹر محمد نعمان اور پروفیسر آفاق حسین صدیقی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پورے مدھیہ پردیش کے تنقیدی اور تحقیقی کارناموں کے جائزے پر مشتمل یہ پہلی کتاب ہے، اس سے قبل چند کتابیں مدھیہ پردیش کے حوالے سے ضرور منظر عام پر آچکی ہیں، مگر ان کا تعلق مدھیہ پردیش کے مخصوص خطہ اور علاقہ سے رہا ہے، اس کتاب میں پوری ریاست کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے مقدمے میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے مختصر انداز میں مدھیہ پردیش کے جائے وقوع اور قیام سے لے کر تنقیدی اور تحقیقی کارناموں کا مختصر وعمدہ انداز میں تعارف کرادیا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد نعمان کا مضمون 'بھوپال میں اردو تحقیق وتنقید ایک جائزہ' اور ڈاکٹر مظفر حنفی کا مضمون 'آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو تنقید وتحقیق کا منظر نامہ' بہت عمدہ مضامین ہیں۔

آخر میں کوثر صدیقی اور پروفیسر آفاق حسین صدیقی کے دو مضامین شامل ہیں، جن میں مدھیہ پردیش کے مشہور ومعروف علاقہ مالوہ میں اردو کی نشوونما کی قدامت کو بیان کیا گیا ہے اور دعوی کیا گیا ہے کہ جس زمانے میں صوفیائے کرام کے ذریعے دکن میں اردو کی ترویج واشاعت ہوئی، اسی زمانے میں مالوہ میں بھی اردو کی نشوونما ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کا تعلق مدھیہ پردیش سے کس قدر قدیم ہے۔

مجموعی اعتبار سے کتاب بہت عمدہ ہے، اس کتاب کے ذریعے مدھیہ پردیش کی تنقیدی اور تحقیقی صورتحال اور تحقیقی وتنقیدی اہم مراکز کو اچھی طرح جانا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

مطالعۂ شعروادب

مصنف: پروفیسر مقصود احمد

صفحات: 280 قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر احمد آباد، گجرات

مبصر: اسماء، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'مطالعہ شعروادب' 13 مضامین ومقالات کو محیط ہے۔ جو تحقیق وتنقید اور اردو شعروادب کی سمت و رفتار کے تعین میں معاون ہے۔ مجموعے میں شامل بیشتر مضامین وہ ہیں جو مختلف اوقات میں ادبی رسائل وجرائد (آجکل، فکرو تحقیق اور اردو دنیا) میں شائع ہوکر قبول عام حاصل کرچکے ہیں۔

'مطالعہ شعروادب' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے 280 صفحات پر مشتمل شعروادب کی دنیا میں نئی راہوں اور نئی وسعتوں کے در وا کرتی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین ومقالات مختلف نوعیت کے حامل ہیں جس کی مثال اس گلدستے کے مانند ہے جو مختلف قسم کے رنگ برنگے پھولوں سے مزین اپنی دلکشی اور دلفریبی کو عیاں کرتا ہے۔ تمام مضامین اپنے موضوع کے لحاظ سے مکمل اور جامع ہیں۔ ان میں تحقیق کی عرق ریزی بھی ہے اور تنقید کی فکری جہات بھی۔ یہ مضامین معلومات کا ایک وسیع دریا ہیں بہت سی ایسی چیزوں سے آگاہی ہوتی ہے جو اب تک پردہ خفا میں تھیں یا ان پر اس جہت سے غور وفکر نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ مضامین تعارف و تاثر تک محدود ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو تفصیل و تجزیہ کا مطالبہ کرتے ہوئے تاریخ وتہذیب کی جھلکیاں بھی دکھاتے ہیں۔

کتاب میں شامل پہلا اور دوسرا مضمون مرزا غالب سے متعلق ہے۔ پہلے مضمون میں غالب کے سفر کلکتہ کی مختصر روداد" مثنوی چراغ دیر اور مثنوی باد مخالف کا اجمالی اور تعارفی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

غالب کی شاعری کے حوالے سے مضامین قلم بند کیے جاتے رہے ہیں لیکن ان کی مثنویوں کے حوالے سے اس قسم کے مضامین کی تعداد کم ہے۔ اس لحاظ سے پروفیسر مقصود صاحب کی یہ کوشش لائق اعتنا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے صنف مثنوی کے معنی ومطالب اور اس کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے مثنوی چراغ دیر کا تعارف پیش کیا ہے۔ کہ یہ سب سے پہلے فارسی میں لکھی گئی اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اردو نثر ونظم دونوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور سنسکرت میں بھی اس کا منظوم ترجمہ Devalayasya deepah کے عنوان سے ناہید عابدی نے کیا۔

دوسری مثنوی 'باد مخالف' کا جامع تجزیہ مع توضیح پیش کرتے ہوئے غالب کے سفر

کلکتہ کی تفصیلات فراہم کی گئی ہے۔اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ بھی اصل میں فارسی میں لکھی گئی جس کا منثور ترجمہ 'ظ انصاری' نے اپنی کتاب 'مثنویات غالب' 1983 میں کیا ہے۔اس مضمون میں غالب کی کلکتہ میں مشکلات ومصائب کا ذکر،ان پر لگائے گئے الزامات واعتراضات کی تفصیلات اور قتیل وغالب کے مابین عداوت ومخالفت کی وضاحت دلائل و براہین کی روشنی میں کی گئی ہے۔اور مثنوی باد مخالف کی وجہ تصنیف بیان کی گئی ہے۔ 154 اشعار پر مشتمل اس مثنوی کا ابتدائی نام 'آشتی نامہ' تھا جسے بعد میں تبدیل کر کے 'باد مخالف' رکھا گیا۔

دو مضمون شکیل بدایونی سے متعلق لکھے گئے ہیں۔ پہلا مضمون شکیل بدایونی کی نعتیہ شاعری کے حوالے ہے۔ جو ستمبر 2016 میں لکھا گیا۔اور نومبر 2016 کے آجکل میں شائع ہوا جس میں آجکل میں شائع 'گوشہ شکیل بدایونی' کے توسط سے بحث کرتے ہوئے اس میں کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔متذکرہ بالا مضمون نقش اول کی اضافہ شدہ شکل ہے۔ مضمون نگار نے مختصراً شکیل بدایونی کی نعتیہ شاعری اور ان کے اس شعری کلام کو حیطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے جسے 'گوشہ شکیل بدایونی آجکل' میں شامل نہیں کیا گیا۔شکیل بدایونی سے متعلق دوسرا مضمون محمد کیف فرشوری کی کتاب 'شکیل بدایونی: شخصیت اور ادبی خدمات' تفصیلی تعارف اور معروضی تجزیے پر مبسوط بہترین کاوش ہے۔ جس میں پروفیسر مقصود صاحب نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ کتاب شکیل بدایونی کے مستند سوانحی کوائف اور ادبی کارناموں پر پہلی مستند اور مفصل کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ جو صاحب کتاب کے ایم فل کے مقالے کا اضافہ شدہ نقش ہے۔

مضمون عزیز قادری بڑودوی اور ان کی غزلیہ شاعری،اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ مضمون عزیز قادری کی غزلیہ شاعری کے حقیقت پسندانہ تجزیہ پر مشتمل ہے۔

مضمون 'ظہیر قادری ایک خوش فکر اور بلند حوصلہ شاعر' میں ظہیر قادری کی شاعرانہ خوبیوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔اور ان کی خوش مزاجی و جوش و ولولہ کی تصویریں ان کے اشعار کے پیرائے میں دکھائی گئی ہے۔ ''تذکرہ سخن وران بڑودہ 1850 تا حال اور تذکرہ سخن وران بھروچ قدیم و جدید'' بھی ظہیر قادری سے متعلق ان کی نثری خدمات کے جائزے اور تذکرہ بھروچ کی دستاویزی حیثیت کو بیان کرتا ہے۔

'بڑودہ کی ادبی سرگرمیاں (اردو ادب کے حوالے سے)' اہم اور تفصیلی مضمون ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اردو کے حوالے سے بڑودہ کی ادبی سرگرمیوں کے موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے۔

کتاب میں شامل دیگر مضامین میں ذاکرہ باکس والا کا تحقیقی مقالہ: تفصیلی وتنقیدی جائزہ، تیری دھن میں: تجزیاتی مطالعہ، سید احمد حسن فدا کی نعتیہ شاعری اور نقوش حیات گوناگوں جذبات واحساسات کا مرقع اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ تمام مضامین معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی وتنقیدی جائزے پر مشتمل ہیں جو جامع ہونے کے ساتھ نفس مضمون کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔

پروفیسر مقصود احمد کی یہ کتاب کئی اعتبار سے اہم ہے۔اول یہ کہ مضامین کی ترتیب میں شعرا وادبا کی سنین وولادت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔دوم یہ کہ اس میں شامل شدہ تمام اہم مندرجات ومضامین کے باقاعدہ حوالے مع سنین و تاریخ پیش کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے اس کتاب کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے بہت سی کتابوں کا تعارف اور نئے موضوعات پر معلومات حاصل ہوتی ہے۔

پروفیسر مقصود احمد کی یہ کاوش واقعی قابل دید ہے۔امید ہے کہ دیگر کتابوں کی طرح ان کی اس کاوش کو بھی سراہا جائے گا۔

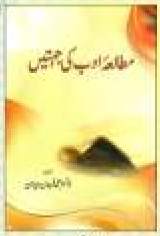

مطالعۂ ادب کی جہتیں

مرتب/ ناشر: ڈاکٹر محمد فرحان دیوان

صفحات: 291، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2018

مبصر: ڈاکٹر محمد مقیم

A-10، نزد جامعہ کوآپریٹو بینک، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد فرحان دیوان اردو کے جواں سال قلم کار ہیں۔انھوں نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ زیر تبصرہ کتاب 'مطالعۂ ادب کی جہتیں' سے پہلے ڈاکٹر محمد فرحان دیوان نے انور انصاری کے ادبی وتنقیدی مضامین کو 'مضامین انور انصاری' کے نام سے ترتیب دیا۔ زیر تبصرہ کتاب میں کل انتیس مضامین شامل ہیں اور آخر میں کتابیات کے تحت ان مضامین کے ماخذات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ مضامین مختلف ارباب قلم کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں جن میں سلف سے لے کر خلف اور چند معاصرین تک بھی شامل ہیں۔ یہ مضامین ادب کی کسی ایک جہت پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ اس میں زبان کی تاریخ وتشکیل، تحقیق وتدوین کے مسائل اور ادبی منظر نامہ، داستان کی شعریات، ناول اور افسانے کا فن اور ارتقا وتجزیہ، طنز ومزاح، مکتوب نگاری، مضمون نگاری، سوانح ومقالہ نگاری نیز انشائیہ نگاری کے تعلق سے مایہ ناز ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کے ارباب قلم میں سید عبداللہ، پروفیسر مسعود حسین خاں، نورالحسن نقوی، نورالحسن ہاشمی، احسن فاروقی، وقار عظیم، آل احمد سرور، بیگ احساس، سید محمد اشرف، ابو محمد سحر کے علاوہ اور بھی پختہ کار لکھاری موجود ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر محمد فرحان دیوان اور شہناز رحمن کا بھی ایک ایک مضمون شامل کتاب ہے۔

ڈاکٹر محمد فرحان کا سلیقۂ ترتیب اور حسن انتخاب قابل تعریف ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کی کتاب کے عنوان سے مناسبت ومطابقت کا خاص خیال رکھا ہے۔ کتاب کی ابتدا پروفیسر مسعود حسین خاں کی تحریر سے ہوتی ہے جو اردو زبان کی تاریخ اور تشکیل کے تعلق سے ہے۔اس کے بعد کلاسیکی متون کی تدوین کے حوالے سے پروفیسر محمد زاہد کا مضمون ہے۔اسی ترتیب سے پہلے داستانوں پر مبنی مضامین اور پھر ناول وافسانے کے بعد خطوط نگاری، مضمون نگاری، علمی نثر، سوانح نگاری، مقالہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے تعلق سے مضامین کی ترتیب رکھی گئی ہے۔ کتاب کا آخری مضمون 'متن کی قرأت: اصول اور مسائل' کے عنوان سے شہناز رحمن کا ہے۔ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد فرحان دیوان نے اس کتاب میں مرتب کی حیثیت سے نہ کوئی پیش لفظ لکھا ہے نہ کوئی دیباچہ یا مقدمہ۔ اس کمی کی وجہ سے اس ترتیب کے تعلق سے ان کا مطمح نظر معلوم نہیں ہوتا۔ اردو داستان کی تحقیق وتنقید اور اردو طنز ومزاح کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے لیکن ان سب تحریروں کو نظر انداز کر کے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے مضامین کو فوقیت دینے کی خاص وجہ کیا ہے؟ افسانے کی تعریف، عصمت چغتائی، کرشن چندر وغیرہ کے فن پر بھی متعدد مضامین ہیں لیکن پروفیسر صغیر افراہیم اور وقار عظیم کے مضامین کو ہی کیوں منتخب کیا گیا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر ابتدائیے کے طور پر رقم کی جانے والی تحریر میں گفتگو کی جاسکتی تھی۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت نیز مرتب کے منصوبے سے آگاہی ہوتی۔

یوں تو کتاب میں شامل بیشتر مضامین اپنے موضوع کی وجہ سے نہایت اہم ہیں اور ان کے لکھنے والوں نے اس بات کی شعوری کوشش کی ہے کہ موضوع کی ترسیل وتفہیم میں کوئی کسر نہیں رہ جائے۔ ان مضامین میں نہ کسی تساہل کا گذر ہے اور نہ ہی عجلت پسندی کا۔ تساہل اور عجلت پسندی کے فقدان نے تحریر کو وقار اور سنجیدگی بخشی ہے۔ سید محمد اشرف کا مضمون 'میر افن' میرے لیے خصوصی دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر میں اس مضمون کا ایک ہی

اقتباس یہاں پیش کردوں تو مجھ پر ہونے والا اثر سید محمد اشرف کے قاریوں پر خود ہی واضح ہوجائے گا:

''معصوم بچے سبھی کو اچھے لگتے ہیں مجھے کچھ زیادہ ہی اچھے لگتے ہیں۔ جب دیکھیے میری کہانی میں 'آجائیں' کہہ کر آجاتے ہیں، پھر میں ان کا غلام ہوجاتا ہوں اور وہ میرے رہبر... اسی لیے میری کہانیوں میں گدھ سوچتا ہے، خرگوش باتیں کرتے ہیں، لکڑ بگھا ہنستا ہے اور روتا بھی ہے اور چپ بھی ہوجاتا ہے... کہانیوں کو جیسے میں بیان کرنا چاہتا تھا، بیان کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر لکڑ بگھا میرے ساتھ نہ ہوتا، میرا رفیق و ہمراز نہ ہوتا...

یہاں اہل منطق کہہ سکتے ہیں کہ لکڑ بگھا نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے نہ ان معنی میں چپ ہوتا ہے تو ان سے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ کہانی کی منطق سائنس کی منطق سے مختلف ہوتی ہے۔ کہانی کی منطق دماغ کے نہیں دل اور جذبے کے پہیے پر چلتی ہے... جب کہانی میں کوئی بچہ آتا ہے تو کہانی میرے لیے میرا تماشا ہوجاتی ہے، جس بچے کو انگلی پکڑ کر میں کہانی میں کھینچ لایا تھا وہی تھوڑی دیر بعد میری انگلی پکڑ لیتا ہے اور مجھے پورا ماجرا دکھاتا ہے۔''

سید محمد اشرف کے مضمون کے بعد ڈاکٹر محمد فرحان دیوان (مرتب) کا مضمون 'سید محمد اشرف کی فکشن نگاری اور آخری سواریاں' ہے۔ اس مضمون سے ڈاکٹر محمد فرحان دیوان کی تنقیدی صلاحیت اور صلابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ سید محمد اشرف کی افسانہ نگاری پر کچھ لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنی ان کی کہانیاں آسان نظر آتی ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ جب سید محمد اشرف بچے کی انگلی پکڑے پکڑے اپنا تماشا دکھ چکے ہوتے ہیں تو اسی بچے کی انگلی پکڑے قاری بھی ایک تماشا دیکھنے لگتا ہے...... اپنا تماشا۔ آخری سواریاں، سید محمد اشرف کا وہ ناول ہے جسے بیشتر لوگ دو لخت اور غیر مربوط پلاٹ پر مبنی سمجھتے ہیں۔ جبکہ اس تعلق سے میرا خیال ذرا مختلف ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب میں نے ڈاکٹر محمد فرحان کو اپنا ہم خیال پایا۔ وہ لکھتے ہیں:

''آخری سواریاں بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دو حصوں پر مشتمل ناول ہے۔ لیکن بہ غور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ناول دو حصوں میں نہیں بلکہ دو رخی تصویر کا ایک مربوط پلاٹ ہے۔''

میں ڈاکٹر محمد فرحان دیوان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ ان کی یہ کاوش ضرور بارآور ہوگی۔

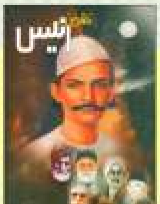

ناقدین انیس

مصنف: وسیم حیدر ہاشمی

صفحات: 364، قیمت: 400 روپے

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی

پیش نظر 'ناقدین انیس' وسیم حیدر ہاشمی کی ایک تحقیقی کتاب ہے۔ آج میر انیس کے حیات و کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ رزم و بزم کے ذکر سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس لیے ان کی شہرت بقائے دوام کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے ناطے انھوں نے صنف مرثیہ کا حق بخوبی ادا کیا ہے اور صنف مرثیہ کو بام کمال تک پہنچانے میں ان کے شانہ بہ شانہ چلنے والے دوسرے عظیم مرثیہ گو مرزا اسلامت علی دبیر کا نام بھی آتا ہے۔ ان دونوں نے اس صنف کو ادبی شان و شوکت دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس کے باوجود آج بھی کی زبان پر پہلا نام میر انیس کا ہی آتا ہے۔ جسے 'قبول خاطر لطف سخن خداداداست' کہنا زیادہ مناسب ہے۔

انیس شناسی کی ابتدا محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' سے ہوتی ہے۔ بعد ازاں دیگر ناقدین نے انیس کی شاعرانہ عظمت پر اپنی آرا پیش کی ہیں۔ اس کتاب کے آغاز میں حسب دستور مرثیے کا آغاز و ارتقا، دکن میں اس کے عادل شاہی دور میں فروغ، عزاداری کی رسم اور ایرانی اقدار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اودھ میں اردو مرثیہ کے لیے سازگار ماحول کا بیان ہے۔

'آب حیات' محمد حسین آزاد کی انشاپردازی کا ایک بہترین نمونہ ہے جہاں انھوں نے آغاز سے متعدد شعرا کا ذکر کیا ہے۔ وہیں انیس و دبیر کا ذکر کرتے ہوئے پہلی مرتبہ ناقدوں کو بھی اس جانب متوجہ کیا۔ مصنف کا کہنا ہے:

''چونکہ محمد حسین آزاد، میر انیس کے اولین ناقدوں میں تھے اس لیے میر انیس کے سلسلے میں ان کا ایک ایک جملہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (ص 57)

محمد حسین آزاد کے بعد مولانا الطاف حسین حالی کا نام آتا ہے جنھوں نے 'مقدمہ شعروشاعری' میں میر انیس کے متعلق یہاں تک لکھ دیا:

''اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں مگر اس کی زبان کو اہل زبان کم مانتے ہیں بخلاف انیس کے، کہ اس کے ہر لفظ ہر محاورے کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے..... جہاں کہیں وہ واقعات کا نقشہ اتارتے ہیں یا نیچرل کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں یا بیان میں تاثیر کا رنگ بھرتے ہیں۔ وہاں اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ مقتضائے وقت کے موافق جہاں تک کہ امکان تھا، میر انیس نے اردو شاعری کو اعلیٰ درجے پر پہنچادیا ہے۔''

یہاں مولانا حالی نے بلاکم وکاست میر انیس کے تمام شاعرانہ کمالات کا مدلل احاطہ کردیا ہے۔ میر انیس کے تیسرے ناقد علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ انھوں نے 'موازنہ انیس و دبیر' میں تفصیل سے بحث کی بلکہ 'مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ' کے عنوان سے اس کتاب کا آغاز ہی کیا ہے۔ اس کے بعد میر انیس کے شاعرانہ کمالات کو اجاگر کرنے میں اپنی پوری صلاحیت مرکوز کردی۔

میر انیس کے چوتھے ناقد کے طور پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نام آتا ہے۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ اپنی ساری زندگی انھوں نے تحقیقی و تصنیفی کاموں میں بسر کی۔ ان کی تصانیف کی کل تعداد 31 ہے۔ ان میں سے چھ تصانیف روح انیس، جواہر انیس، شاہکار انیس، رزم نامہ انیس، شاعر اعظم انیس اور نقد انیس کا شمار مستند و اہم کتب میں ہوتا ہے جہاں تفصیل سے ہر موضوع و نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادیب صاحب کی یہ کتابیں انیس پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بحر بیکراں سے کم نہیں۔

میر انیس کے چوتھے ناقد میں کلیم الدین احمد کا نام آتا ہے۔ کلیم الدین پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ انیس کو بہت اچھا شاعر نہیں مانتے مگر ان کا موازنہ عالمی ادب کے بڑے شاعر ملٹن سے ضرور کرتے ہیں اور جب 'انیس' نامی کتاب میں ان کا ذکر کرتے ہیں تو حق گوئی سے ان کا قلم نہیں رکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''انھوں نے مرثیہ کو اردو نظم میں بلند ترین مقام دیا اور یہی وہ صنف شاعری ہے جس نے ہماری زبان کو شائستہ زبان کا ہم پلہ بنادیا۔ اگر ارسطو کا یہ نظریہ تسلیم کیا جائے کہ شاعری دراصل مصوری ہے تاہم یہ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس کو دنیا کے شعرا میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔''

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی جانب سے انھیں تنقید کا نشانہ بھی بنادیا ہے جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی بلکہ ناقد کا کام تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردینا ہے۔

انیس کے پانچویں ناقد کے طور پر پروفیسر اکبری حیدری کاشمیری کا نام آتا ہے

جن کا شمار اردو کے مایہ ناز محقق میں ہوتا ہے۔ انھوں نے 'اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا' پر اپنا تحقیقی مقالہ بھی سپرد قلم کیا ہے جہاں تفصیل سے کلام انیس کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ مرثیہ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

اور آخر میں پروفیسر نیر مسعود کا ذکر آتا ہے جو سید مسعود حسن رضوی ادیب کے لائق فرزند تھے۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے وابستہ رہے انیس شناسی کے ضمن میں ان کی تصنیف 'انیس (سوانح)' ہے۔ یہ حوالہ جاتی کتاب اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب میں کل 19 جامع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ 472 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ 65 دیگر ادبا و شعرا اور ناقدین کی آرا اس کتاب کے اختتامی حصے میں شامل کی گئی ہیں جس سے اس کتاب کی معنویت بڑھ جاتی ہے اور یہ کتاب میر انیس اور صنف مرثیہ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ کا کام کرسکتی ہے۔ البتہ کتابت کی کئی جگہ خامیاں بھی ہیں جنھیں اگر پروف ریڈنگ کے دوران دور کرلیا جاتا تو بہتر تھا۔ بہ حیثیت مجموعی وسیم حیدر ہاشمی کی یہ تصنیف قابل تحسین ہے۔

خاکے / سفرنامے

رقص حیات

ناشر/مصنف: شبر امام

صفحات: 248، **قیمت:** 200، **سنہ اشاعت:** 2018

مبصر: ابراہیم افسر، وارڈ نمبر 1، مہپا چوہرا بانگر پنچایت سوال خاص ضلع میرٹھ، یوپی، 250501

زیر تبصرہ کتاب 'رقص حیات' شبر امام صاحب کے سفرناموں اور شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ شبر امام صاحب نے اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب میں علاحدہ علاحدہ عنوان قائم کرکے 'اپنی بات' کو آگے بڑھایا ہے۔ باب اوّل میں اپنی بات کے تحت اس بات کا انکشاف بڑے ہی طمطراق کے ساتھ کیا کہ بنگلور میں مقیم سماجی اور ملی کارکن مرزا عباس علی سے ان کی شناسائی صرف اور صرف بہ ذریعہ خط و کتابت ہوئی۔ ہنوز یہ سلسلہ قائم و دائم ہے۔ 'اپنی بات' میں شبر امام صاحب نے مرزا عباس علی کو اپنا بھائی قرار دیا۔ باب اوّل ہی میں شبر امام نے بنگلور کا دوسرا سفر، مرزا عباس علی، آغا سلطان، محترمہ ناہید فاطمہ اور مرزا عباس علی کی ڈائری کے ذیلی عنوان قائم کیے۔ ان ذیلی عنوانات میں مرزا عباس علی کے علمی و ادبی خانوادے کے تذکروں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا گیا۔ لیکن اس باب میں قارئین کی توجہ اور دل چسپی کا محور و مرکز مرزا عباس علی کی ڈائری والا مضمون ہے۔ شبر امام نے بڑی ہی عرق ریزی سے مرزا عباس علی کی ڈائری کا غائر مطالعہ کیا اور اس کے چند حصوں کو اپنی کتاب میں جگہ دی۔ اس ڈائری میں، دینی، ادبی، سیاسی، ملی مسائل، ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کے گوہر نایاب اشعار کو یکجا کیا گیا ہے۔ مرزا عباس علی نے جن شعرا کے منتخب اشعار کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا ان میں علامہ اقبال، ملک وفا پوری، منظور الحسن منظور، کالی داس گپتا رضا، قیس زنگی پوری اور پروفیسر عنوان چشتی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

دوسرے باب میں شبر امام نے جن ادبی، علمی اور مذہبی لوگوں کے شخصی خاکے رقم کیے ان میں قیس زنگی پوری، مولانا سعید اختر گوپال پوری، وفا ملک پوری، پروفیسر عنوان چشتی، سید اسد رضوی مظفر پوری، رضا آبرو چندن پٹوی کے علاوہ مولانا سید محمد ابراہیم کے قلمی خاکوں کو خوب صورت انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ میں اس موقع پر صرف پروفیسر عنوان چشتی کے شخصی خاکے کا ایک پیراگراف یہاں نقل کر رہا ہوں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ شبر امام صاحب قیام دہلی کے دوران یہاں کی ادبی گروہ بندی سے کیوں کوسوں دور تھے؟ جب کہ پروفیسر عنوان چشتی دہلی کی ادبی گروہ بندی میں اپنی ادبی زندگی بسر کررہے تھے۔ پروفیسر عنوان چشتی کا شبر امام نے جس دل چسپ انداز میں خاکا کھینچا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ اس مختصر سے خاکے میں شبر امام نے قارئین کو پروفیسر عنوان چشتی کی جملہ اوصاف شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ اس بارے میں شبر امام رقم طراز ہیں:

''دلی کی ادبی دنیا کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بھی عظیم آباد سے کہیں زیادہ ادبی گروہ بندی ہے، عنوان چشتی صاحب کا بھی گروہ تھا۔ محترم عنوان چشتی صاحب کی حیات اور کارنامے پر مشہور و معروف قلم کار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ راقم اس قدر سمجھتا ہے کہ وہ بہ نفیس اور سلیقہ مند تھے، وہ بذات خود حسین تھے اور ان کی نثر اور شاعری میں بھی حسن ہے۔ اُردو زبان و ادب کے مجاہد تھے۔ وہ علم عروض کے ماہرین میں سے ایک تھے۔ چنانچہ میں نے اپنی تصنیف 'شخصیت اور کردار' انھیں پیش کیا۔ انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کیا اور بولے، شبر صاحب! تبصرہ کے لیے نہیں کہیں تو بہتر ہوگا۔ ایک صاحب کی تصنیف علم و عروض پر تبصرہ کے لیے ہمارے پاس بھیجی گئی، جب انھوں نے تبصرہ پڑھا تو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہ اس تبصرے کی شدت کو برداشت نہ کرسکیں اور اس دنیا کو ہی خیرباد کہہ دیا۔'' (رقص حیات، ص 127)

شبر امام صاحب نے اس کتاب کے تیسرے باب میں ایک جہاں دیدہ انسان، مقدمہ خضر رہ حیات، چاک دامن، چارہ گر، Unsophisticated، ہمدم دیرینہ، نصیب گمراہاں، فیض رساں اور چراغ سحری کے عنوان سے اپنے تجربات، مشاہدات اور علمی و ادبی شخصیات سے ملاقات اور ان کی خدمات کے علاوہ جہانِ دنیا کی سیر و تفریح کے دل کش مناظر پر تبادلۂ خیال احسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ شبر امام صاحب نے مقدمہ خضر رہ حیات کے تعلق سے لفظ مقدمہ پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اس مضمون کی چند سطریں یہاں اس لیے پیش کی جارہی ہیں تاکہ اُردو ادب میں کتابوں پر مقدمہ لکھنے اور لکھوانے کی جو رسم چلی آرہی ہے، اُس پر مزید گفتگو کرکے کچھ نئے پہلو سامنے آسکیں۔ اس تعلق سے شبر امام صاحب کے خیالات ملاحظہ کیجیے:

''کسی کتاب کا مقدمہ اس وقت لکھا جاتا ہے، جب اصل کتاب کی ضخامت کم ہوتی ہے تو مقدمے کی صورت میں کچھ مواد منتھی کردیا جاتا ہے کہ قاری کا دل اگر کتاب سے سیر نہیں ہو تو کم از کم مقدمہ دل چسپ ہو۔ دوسری صورت میں اگر صاحب کتاب غیر معروف شخصیت کا حامل ہے تو کسی مشہور قلم کار سے مقدمہ لکھایا جاتا ہے کہ کتاب اس کی شہرت کی روشنی میں ہاتھوں ہاتھ ہو۔ صاحب کتاب خود مقدمہ نگار بھی ہے تو سمجھنا چاہیے کہ جو بات کتاب کے اوراق میں برملا کہی نہ جاسکی اسے مقدمے کی صورت میں واضح کیا جائے گا۔'' (رقص حیات، ص 147)

مجموعی طور پر رقص حیات میں شبر امام صاحب نے اپنے ادبی اور علمی تجربوں کو منصۂ شہود پر لاکر اُردو قارئین کو اپنی تحریروں سے مستفیض کیا۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے شبر امام کی مختلف اصناف پر مبنی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اُردو دنیا میں شبر امام کی شناخت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، انشائیہ نگار، خاکا نگار کے ساتھ ساتھ ایک نقاد، محقق اور مرتب کے طور پر مسلم ہے۔ نام و نمود اور صلے کی اُمید سے شبر امام کوسوں دور ہیں۔ تنہائی میں رہ کر ادب تخلیق کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رقص حیات میں شبر امام صاحب نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ قابل تعریف اور لائق مطالعہ ہیں۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ البتہ کتاب میں کہیں کہیں پروف کی غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ جنھیں آئندہ ایڈیشن میں دور کرلیا جائے گا۔

فکشن

بٹوارا

مصنف: پروفیسر سربجندر سنگھ، مترجم: پروفیسر مظفر علی شہ میری
صفحات: 120، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: سربات دا بھلا چیری ٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
مبصر: ڈاکٹر انور چراغ، اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ لنگوسٹک، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، پنجاب

پروفیسر مظفر علی شہ میری کی کتاب 'بٹوارا' پروفیسر سربجندر سنگھ کی مشہور تخلیق 'دیسے بڈھ پریکا' کا اردو ترجمہ ہے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری ڈاکٹر عبدالحق اردو یونی ورسٹی، کرنول (آندھرا پردیش) کے وائس چانسلر ہیں۔ جب یونی ورسٹی کا وائس چانسلر کسی دوسری زبان میں شائع ہوئی کسی کتاب کا اپنی زبان میں ترجمہ کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ کتاب میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ اور یہ بات درست بھی ہے۔ ڈاکٹر سربجندر سنگھ کی پنجابی میں شائع ہوئی اس کتاب کا اس سے پہلے ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

زیر تبصرہ ناولٹ میں ڈاکٹر سریندر پال سنگھ اوبرائے کے خاندانی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر اوبرائے آج کل 'سربت دا بھلا' چیری ٹیبل ٹرسٹ کے ذریعے انسانیت کی بہت ہی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مصنف نے ڈاکٹر اوبرائے کے اجدادی زندگی اور قدیم پنجابی تہذیب کو بہت متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔

بٹوارا غیر منقسم پنجاب کے اس عہد کی کہانی ہے جب گاؤں اور شہروں میں سکھ، مسلم اور ہندو مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ اس ناولٹ میں پاکستانی پنجاب کے ایک گاؤں دھرابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اوبرائے کے پڑدادا تیجا سنگھ، دادا ہرنام سنگھ اور والد پریتم سنگھ اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ اس دور میں لوگوں کے دکھ سکھ سانجھے تھے زندگی سادہ تھی۔ مادی سہولتوں کی چاہے کمی تھی مگر پھر بھی لوگ خوشی خوشی اپنی زندگی گزارتے تھے۔

سردار تیجا سنگھ گاؤں میں کھیتی باڑی اور ساہوکاری کا کام کرتے تھے۔ تیجا سنگھ کا بیٹا ہرنام سنگھ بڑا ہوا تو اس نے جدی کام کو بخوبی سنبھال لیا۔ وہ گاؤں کے سبھی لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ تیجا سنگھ چاہے لوگوں کو سود پر رقم دیتا تھا مگر پھر بھی اس کی سانسوں میں انسانیت کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ ناولٹ کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ غیر منقسم پنجاب میں آپسی پیار محبت اور بھائی چارے کی بنیادیں بہت مظبوط تھیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں پریتم، موہنے اور چراغے کی دوستی کا بیان بہت پر کیف انداز میں ہوا ہے۔ پریتم کھاتے پیتے کھتری خاندان کا لڑکا ہے۔ موہنا جٹ سکھ اور چراغا مسلم لوہار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقتصادی فرق اور مختلف مذاہب ہونے کے باوجود تینوں دوست آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ ان تینوں کی دوستی قدیم پنجابی سماج اور آپسی رواداری کا حسین منظر پیش کرتی ہے۔ گاؤں کی لڑکی پریتو کو جب کچھ بد معاش لڑکے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو چاچا رحیم کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ یہ واقعہ قاری کو خاص طور پر متاثر کرتا ہے۔ صرف دھرابی ہی نہیں بلکہ غیر منقسم پنجاب کے تقریباً ہر گاؤں میں بلند اخلاقی اقدار موجود تھیں۔ تب گاؤں کی بیٹی کو سارے گاؤں کی بیٹی سمجھا جاتا تھا۔

درمیانی دور میں پنجابی سماج میں پیروں فقیروں کا اہم مقام رہا ہے۔ دھرابی گاؤں میں بھی اس وقت ایک خانقاہ موجود تھی اور اس میں ایک درویش رہتا تھا۔ گاؤں کے بھی لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ سردار تیجا سنگھ کے خاندان میں ایک دانی مہاپرش کے پیدا ہونے کی پیشین گوئی اس درویش نے کی تھی جو بالکل سچ ثابت ہوئی ہے۔ ناولٹ میں درویشانہ زندگی کا بیان غیر منقسم پنجاب کی سانجھی روحانی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ آج ڈاکٹر اوبرائے جو انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں اس میں دھرابی گاؤں کے اس درویش کی دعائیں بھی شامل ہیں۔

مصنف نے آخری صفحات میں پنجاب کی تقسیم کے حالات کو پیش کیا ہے۔ انگریزوں نے پنجابیوں کے دلوں میں نفرت کا ایسا بیج بویا کہ صدیوں سے بھائیوں کی طرح مل کر رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ لیکن اس سیاہ دور میں بھی ادھر اور اُدھر کے دونوں پنجابیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے انسانیت کا دامن نہیں چھوڑا۔ ایسے لوگوں میں دھرابی گاؤں کے مسلم لوگ بھی شامل تھے۔ انہوں نے سکھوں اور ہندوؤں کی خوب حفاظت کی۔ اس طرح دھرابی کے لوگوں نے انسانیت کا ایسا عظیم درس دیا جس کو انسانی تاریخ میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اس ناولٹ کے مطالعہ سے اس بات کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے کہ تقسیم کی وجہ سے صرف پنجاب کی زمین ہی دو ٹکڑوں میں نہیں بٹی بلکہ ہم نے اور بھی بہت کچھ کھو دیا ہے۔ یہ ناولٹ صرف ڈاکٹر اوبرائے کے خاندان کی کہانی ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اس میں اس کہانی کے ذریعے غیر منقسم پنجاب کی دیہاتی زندگی کا ایک معنی خیز منظر پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر مظفر علی شہ میری نے یہ ترجمہ بہت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ کی ہوئی کتاب نہیں بلکہ اردو زبان میں ہی تخلیق ہوئی اصل کتاب ہے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے ڈاکٹر سربجندر سنگھ کی پنجابی تصنیف کو اردو میں ترجمہ کر کے پنجاب، پنجابی اور پنجابیت کے وقار کو بڑھایا ہے۔ اس کا سر ورق خوبصورت ہے اور اس کی قیمت بھی واجبی رکھی گئی ہے۔ امید ہے پنجابی ادب کی طرح اردو ادب میں بھی اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

انٹولرنس

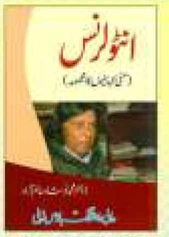

مصنف: ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد
صفحات: 120، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: مبشر عالم، 6/275، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

انٹولرنس، ڈاکٹر نوشاد عالم آزاد کی منی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں سو سے زیادہ منی کہانیاں شامل ہیں۔ آج کے دور میں منی کہانی، افسانچے، مائکرو فکشن لکھنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک منی کہانیوں کو وہ اعتبار حاصل نہیں ہوا ہے، جو افسانوں کو حاصل ہے۔ اس لیے سنجیدہ قسم کے نقادوں نے کبھی بھی منی کہانیوں پر کھل کر بات نہیں کی۔ جبکہ ایک وقت تھا جب جوگندر پال جیسے ادیب بھی منی کہانیاں لکھتے تھے۔ رتن سنگھ جیسے بڑے نام بھی منی کہانیوں پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ان دو ناموں کے علاوہ ایسے بڑے ادیب کم نظر آتے ہیں جو منی کہانیوں کو لائق اعتنا سمجھتے ہوں۔ مغرب میں بھی مائکرو فکشن کا رواج رہا ہے اور وہاں بہتر مائکرو فکشن لکھے گئے اور سنجیدگی سے آج بھی وہاں مائکرو فکشن لکھا جا رہا ہے اور پڑھا بھی جا رہا ہے۔ ہندوستانی سطح پر منی کہانیاں لکھنے والوں میں بیشتر نام ایسے ہیں جنھوں نے چٹکلے، لطیفے یا وقتی حادثوں کو لباس کا جامہ پہنا کر منی کہانیوں کا نام دیا ہے۔ ایسی کہانیاں اس لیے بھی اعتبار حاصل نہیں کر سکیں کہ ان میں فکر و فلسفہ کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نوشاد عالم آزاد منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانے بہت لکھے ہیں۔ مضامین بھی۔

کتاب کے آغاز میں مصنف نے طویل یچی کہانی کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔اس مضمون کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ آج بھی اچھی کہانیوں کے قاری اور نقاد موجود ہیں۔مضمون میں مصنف نے اس بات کا رونا رویا ہے کہ ایک مدت سے لکھنے کے باوجود ان کی تحریروں پر گفتگو کے لیے کوئی سامنے نہیں آیا۔جوہری شعائیں کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا تو احباب خاموش رہے۔انہوں نے دو ایک مثالیں بھی دی ہیں کہ کچھ احباب ایسے بھی تھے جنھوں نے جوہری شعائیں کی تعریف کی۔دراصل مائکرو فکشن مغرب میں اس لیے بھی مقبول ہے کہ وہاں حادثاتی کہانیوں سے زیادہ فکر وفلسفہ کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ادب میں معیار کا معاملہ یہ بھی ہے کہ آپ کی تخلیقات کہاں اور کس رسالہ میں شائع ہورہی ہیں۔بقول ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد، انہوں نے اخبار وجرائد کے لیے سیکڑوں منی کہانیاں لکھیں اور یہ مجموعہ ان کی کچھ کہانیوں کا انتخاب ہے۔ان کی ایک منی کہانی کا عنوان ہے 'ایوارڈ واپسی'۔

ایوارڈ واپسی

مشتعل گروہ کو دیکھتے ہی دکانداروں نے اپنی اپنی دکانیں بند کردیں۔ایک دکاندار نے گروہ کے ایک فرد سے پوچھا کہ آپ لوگ دکانیں کیوں بند کرارہے ہیں؟

ہماری دکان دراصل ایک کمپنی کا شوروم ہے۔بند کرنے پر ہمیں تفصیلات بتانی ہوتی ہے کہ کیوں دکان بند ہوئی۔ہم لوگ دکانیں بند نہیں کرار ہے ہیں لوگوں کی بھیڑ، ہاتھوں میں تختیاں دیکھ کر لوگ خود ہی دکانیں بند کررہے ہیں۔یہ جلوس ایوارڈ واپسی والوں کی ہے۔

شکریہ دوست لیکن یہ جلوس ایوارڈ واپسی کی حمایت میں ہے یا مخالفت میں۔

ارے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔لکھ دے نا 'ایوارڈ واپسی'

اب اس کی کہانی کو ہی دیکھیے۔کچھ معاملے سماجی اور سیاسی بصیرت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ایسی کہانیاں سوئپنگ ریمارکس سے زیادہ نہیں ہوتی ہیں۔اچھا ادیب گہرائی سے اس کے روٹس تک جانے کی کوشش کرتا ہے۔اچھے ادب کے لیے وژن کا ہونا ضروری ہے۔ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد کی کہانیاں سماج، معاشرہ، حالات کا احاطہ کرتی ہیں۔دور حاضر کی کڑوی سچائیاں بھی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔لیکن ابھی مائکروفکشن، افسانچے یا منی کہانی کو لکھنے کے لیے انہیں مزید کوشش کرنی ہوگی۔جب تک ایسے فن پارے فکر وفلسفہ سے آشنا نہیں ہوتے، ان میں خالص ادب کا رنگ نہیں آسکتا۔کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی ہے۔

شاعری

بول میری مینا

ناشر وشاعر: مظفر حنفی

صفحات: 144، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

مبصر: شکیل اعجاز، مومن پورا، اکولا۔ 444006

یہ کتاب مظفر حنفی صاحب کی ادب اطفال پر شعری کلیات ہے جسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حصہ اول، نرسری رائمز چار سے سات برس تک کے بچوں کے لیے۔حصہ دوم، آٹھ سے دس برس کے بچوں کے لیے۔حصہ سوم، گیارہ سے چودہ برس کے بچوں کے لیے۔حصہ چہارم پندرہ سے اٹھارہ برس کے بچوں کے لیے ہے۔

ان نظموں میں ایسی روانی، ایسے الفاظ اور ایسے موضوعات ہیں کہ کچھ بچوں کو مزے لیتے ہوئے اور آسانی سے یاد ہوجائیں اور وہ خوشی خوشی ان کو بار بار پڑھتے رہیں، گنگناتے رہیں۔مثال کے طور پر صرف چند نظموں کے ایک ایک دو دو بند پیش ہیں:

اکتا کی مثال

چھوٹی نے طوطا پالا تھا/ بڑی بہن نے بلی
بلی کو بھی کم بھاتا تھا/ اور طوطے کو تلی

گھوٹالہ

پان کھا کر شیر آیا/ لوگ سمجھے خون ہے
شیر نیتی تال سمجھا/ اور یہ دہرہ دون ہے

لال پتنگ

ہے ہے دوڑ کے پکڑے کوئی/ کٹ گئی میری لال پتنگ
فیض تو ہے کام کا چور/ لایا ہوگا کچی ڈور
عرشی ذرا سنبھالو چرخی/ میں کر ہوں اس سے جنگ

تیز بارش میں

بوچھار ادھر سے تھی اُدھر مڑ گئی چھتری
ہتھا کبھی ٹوٹا تو کبھی اڑ گئی چھتری
جھکڑ میں وہ تیزی تھی کہ مڑ تڑ گئی چھتری

ہفتہ دعوتوں کا

پہلے ام رس پوری پالک اور پنیر چلی/ پھر الو کے بیچ کبابوں کی تدبیر چلی
اک دن ہم نے زردہ کھایا دو دن کھیر چلی/ آخر چوتھے دن بریانی میں کفگیر چلی

'بولتی پہیلی' پڑھ کر بچے خوش ہوں گے ان کی پسند کی چیز ہے۔

ہرا سمندر۔گوپی چندر۔دنیا بھر ڈبیہ کے اندر
افریقہ سے۔چین سے باتیں۔مدؤ سے نسرین سے باتیں/
گردن میں لٹکی رہتی ہے۔کانوں سے لپٹی رہتی ہے
رومنگ اچھی۔سرچ بہت ہے۔لیکن اس میں خرچ بہت ہے/

'عیدی کیسے بڑھائی جائے' میں بچوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ مہنگائی کتنی بڑھ گئی۔تمہارے کپڑوں کی سلائی اور جوتے کتنے مہنگے لانے پڑے۔ہم تو بچپن میں مٹی کے کھلونوں سے کھیلتے تھے تم کو بجلی سے چلنے والے کھلونے دلاتے ہیں۔'مزدور کی عظمت' میں کہا گیا ہے کہ بیشک دنیا قائم ہے مزدوروں کی عظمت پر۔وہ مل میں کپڑا بنتے اور دیواریں چنتے ہیں۔ہم ٹی وی اور ٹیلی فون ان کے دم سے سنتے ہیں۔جب تک پودے جھومیں گے ان کے زخمی ہاتھوں کو دنیا والے چومیں گے۔'واہ وا' میں بچوں کے نام لے کر ان کو پھول تتلی جگنو جیسا بتایا گیا ہے۔'کھلونا گھر' کی الماریوں میں سارے کھلونے ایک ساتھ رکھے دیکھ کر شاعر نے دلچسپ فوٹوز کلک کر لیے۔بلی کی گردن میں چوہا گھنٹے کی طرح لٹک رہا ہے۔یعنی آج کھلونا گھر میں سب کچھ الٹا پلٹا ہے۔'صبا ڈاکٹر بنی' تو دلوں کو آئینہ بنایا۔دماغوں سے نفرت مٹائی۔زمن انجینئر بنے گا تو مفلسی کی خلیج پاٹے گا۔دلوں سے دل تک پل بنائے گا۔'مدؤ' میں فیضی کی گیند تالاب میں چلی گئی۔مچھلی سے کہا نکال دو تو مچھلی نے کہا بھیا ہم تیر نہیں سکتے۔کچھوے نے جواب دے دیا کہ مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔(مچھلی اور کچھوے کے عذر بہت ہی پر لطف ہیں) 'زمن کے کتے' میں شرمیلی نظر آنے والی بلی بہت چالاک ہے۔اس کے بھولے چہرے پر مت جاؤ اس کی چالاکی تو چوہوں سے پوچھو۔'دشتق' اعلیٰ درجہ کی نظم ہے اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ سات رنگ کی ایک ناؤ پر ایک طرف تارے بیٹھے تھے دوسری جانب ہم لٹکے تھے۔چاند بیچ میں کود پڑا۔تارے اچھل کر اوپر چلے گئے۔ہم زمین پر گر گئے۔

چوہے اکثر چیزیں غائب کردیتے ہیں ایک صبح دادا پر کیا بیتی 'دادا چلے دانت مانجھنے' میں چند دلچسپ مناظر دکھانے کے بعد آخری مصرعوں میں یہ ہوتا ہے:

اب لہرالہرا کے تولیہ۔ چیخ رہے ہیں— کیوں دادا
گھور گھور کر آئینے کو۔ لڑنے پر ہیں آمادہ
گھر بھر میں مچ گئی کھلبلی۔ لیکن ہنستی ہیں دادی
آج بھی چوہے چرالے گئے۔ دادا جی کی بتیسی

(اس میں دادی کا ہنستا سب سے دلچسپ تصویر ہے اور ایک پیار بھرے، پرامن گھر کا ماحول بتاتی ہے)

نظم 'ہولی' میں بچوں کے لیے بھی ایسے مصرعے ہیں جو مظفر حنفی جیسا دل نشیں غزل کا شاعر ہی کہہ سکتا ہے:

پودوں کو ہے خمار، ہوا پی کے آئی ہے/میٹھی مغلظات ہیں، نغمہ سرائی ہے
ہنستے ہیں یار لوگ حسینوں کے حال پر/کاجل لگا ہے کان میں سندور گال پر
رعنائیوں کی بات گل تر سے پوچھیے/مستی کا حال بادہ و ساغر سے پوچھیے

ایک نظم کے یہ دو الگ الگ مصرعے بھی یاد رہ گئے

پھول نچاتا ہوگا آنکھیں، تتلی کیوں شرمائے/مینڈک کے بے سرگانے پر بادل ڈھول بجائے

مظفر حنفی صاحب غزل کے لیے پوری اردو دنیا میں مشہور و مقبول ہیں۔ بچوں کے لیے صفحہ نمبر 99 پر 'بچکانہ غزل' کہتے ہوئے بھی ان کا خاص رنگ ابھر آیا ہے

میری گود میں پوتی ہے تو پوتا کندھے پر
جیسے جھلمل جھلمل جگنو، بھولے بھالے پھول
لفظوں کے اس جادوگر کے پیارے پیارے شعر
انگارے دامن میں رکھے اور نکالے پھول

مظفر حنفی صاحب کو ان کے ادبی کارناموں پر کام بھی ملا، انعام بھی ملے۔ جتنے ملنے چاہیے تھے اس سے کم ملے۔ اس پس منظر میں ان کی یہ نظم دیکھیے، 'گھر کی مرغی'

اور تمھیں کچھ کام نہیں ہے
ان کا کوئی دام نہیں ہے
نام نہیں، انعام نہیں ہے
نظمیں لکھتے جاؤ مظفر
گھر کی مرغی دال برابر

بعض بڑے شاعر، بچوں کے لیے شاعری کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اچھا ہوا مظفر صاحب ایسا نہیں سمجھتے ورنہ ہم کو اتنی اچھی پیاری نظمیں پڑھنے کو کہاں ملتیں؟

اس کتاب میں بہت سی کام کی باتیں اور نصیحتیں ایسی ہیں جو آڑے وقتوں میں بچوں کے کام آئیں گی۔

ہم نے چند نظموں کا ذکر کیا اس میں کل 121 نظمیں ہیں۔

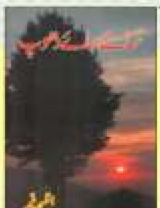

سائے سائے دھوپ

شاعر: اظہر نیر

صفحات: 128، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سعید اختر اعظمی، نزد جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ، یوپی

اندرون ذات سے بیرون ذات کا سفر سہل نہیں، کیونکہ اس میں شکست و ریخت کا مرحلہ اور نشیب و فراز کا تسلسل آتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے چہرگی اور بے چارگی نصیب بن جاتی ہے۔ یوں اس مرحلے سے بآسانی گزر جانا کوہ کنی سے کم نہیں۔ اظہر نیر نے مشاہدات کو غزلیہ پیکر میں ڈھالتے ہوئے خود کو اسی مرحلے سے گزارا ہے اور کامیاب و کامران رہے ہیں۔ انھیں پھولوں کی آغوش میں لطف نہیں آتا بلکہ قدموں تلے آنے والے خار لذت نو سے ہم کنار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیپل کی چھاؤں کے بجائے 'سائے ببول کے' اور چھاؤں میں دھوپ کے متلاشی بن کر 'سائے سائے دھوپ' کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

'سائے ببول کے' (2014) اظہر نیر کا پہلا سخن پڑاؤ تھا جس کا دوسرا پڑاؤ 'سائے سائے دھوپ' ہے۔ اس میں شامل غزلوں میں اگرچہ روایت سے قربت ہے تاہم معنویت کی زیریں لہر بھی نمایاں ہے۔ یہ اشعار دیکھیے

حوصلہ دے پار کرنے کا مجھے پروردگار — سامنے دریا ہے اور کچا گھڑا ہے زندگی
صرف ساحل ہی نہیں موجیں بھی رہیں اپنے قریب — پھر بھی آنکھوں میں رہا خیمہ صحرا اکثر
لٹ گیا گھر میں ہی سامان حیات دوراں — سوچتا ہوں میں کروں شہر سے ہجرت اپنی
کھلیں گے نخل تمنا کی ٹہنی ٹہنی پر — لہو کی سرخیاں دے کر گلاب زخموں کے
ستم کی دھوپ جلائے گی کس طرح مجھ کو — مراقبیلہ تو سورج کا ہم نوالہ ہے
ہر ایک رات تری دستکیں میں سنتا ہوں — مرا یقین نہیں تو گمان باقی ہے

اردو زبان کو زوال پذیر زبان ماننے والے جان لیں کہ یہ صرف عوامی نہیں کتابی زبان بھی ہے۔ ایسی زبانوں کو زوال نہیں آتا۔ اظہر نیر نے اسے خوشبو سے تعبیر کیا ہے اور اس کی شیرینی کا اعتراف بھی کیا ہے۔

کس طرح تم مٹاؤ گے اس کو میاں — مثل خوشبو ہے اردو زباں ہر طرف
ہر ایک لفظ ہے اس کا پُر لطف و شیریں — جسے دیکھو اُردو زباں بولتا ہے

زبان اردو کی شیرینی کا قصیدہ پڑھنے والے شہر آہن بوکارو کے اظہر نیر بقائے اردو کے لیے کوشاں ہیں اور خود اپنی زباں سے اس کی تشہیر بھی کر رہے ہیں۔

میری خاطر ہی سہی بزم سخن ہو جیسے — مجھ پہ ہی ختم یہ ہنگامہ فن ہو جیسے
لب تک آتے ہیں تو ہر شعر سلگ اُٹھتا ہے — لفظ پر لفظ مرے دل کی جلن ہو جیسے

غالباً اسی تعلّی کے سبب ان کی غزلوں میں ایسے اشعار در آئے ہیں جو خارج از بحر، سقم الفاظ کا نمونہ اور معنویت سے عاری ہیں۔

بہت مسئلے ہیں مری زندگی میں — کہ مرنے کی دل اب تمنا کرے ہے
محروم وہ اللہ کی رحمت سے ہے نیر — قرآن کی جو گھر میں تلاوت نہیں رکھتا
سوچ لیجیے تعبیر نہ اُلٹی ہو جائے — حسین خیال نہ یوں چشم خواب میں رکھیے
کس کے منتظر ہیں سائباں میں لوگ اس طرح — ہوتی ہے جیسے کہ الفاظ کی بوچھار کاغذ پر
شیش محلوں میں سجا کر کس نے پتھر دیے — بھول بسری یادوں کے موہوم پیکر رکھ دیے

پہلا شعر مایوسی و نامرادی کا اعلامیہ ہے جو قرآنی بیان 'لاتقنطو من رحمت اللہ' کے خلاف ہے۔ دوسرے شعر میں 'تلاوت رکھنا' غلط ہے، صحیح 'تلاوت کرنا' ہے۔ تیسرے شعر میں پہلا مصرع 'یہ سوچ لیجیے تعبیر نہ اُلٹ ہو جائے' اور دوسرا مصرع 'حسین خیال نہ یوں چشم خواب میں رکھیے' بہتر ہوگا۔ چوتھے شعر میں پہلا مصرع 'کسی کے منتظر ہیں سائباں میں لوگ یوں ہمدم' مناسب ہے اور آخری شعر کے مصرع ثانی میں 'یادوں' کی جگہ 'یاد' رکھنے پر ہی مصرع باوزن ہوگا۔ ان تسامحات سے دور رہنے پر ہی شعر شعر ہوگا اور اس میں تازہ کاری آئے گی۔

میں نے لفظوں سے خوں نچوڑا ہے — تب کہیں تازگی نکالی ہے

■

عالمی اردو نامہ

غالب اوران کی اردو شاعری

تاشقند: تاشقند انسٹی ٹیوٹ برائے مشرقیات اورلعل بہادر

شاستری سینٹر برائے ہندوستانی ثقافت کے باہمی اشتراک سے مذکورہ انسٹی ٹیوٹ میں 'غالب اوران کی اردو شاعری' کے عنوان سے ایک روزہ سمینار کا انعقادعمل میں آیا۔

سمینار کا افتتاح ہندوستانی ثقافتی مرکز کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے غالب اور عہد غالب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کے اپنے نوشتہ خط کے مطابق ان کے اجداد شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی گئے تھے۔ غالب کی شاعری ہمہ وقتی، ہر دور اور ہر نسل کے خیالات کی عکاسی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ غالب ہر شخص کا دمساز وہمراز ہے۔ انھوں نے غالب اور اسلوب غالب کی توضیح کرتے ہوئے غالب کی اردو شاعری سے کئی نمونے پیش کیے۔

اس موقعے پر پروفیسر چندر شیکھر نے انسٹی ٹیوٹ کے جنوبی ایشیائی شعبوں کی صدر پروفیسر الفت محیبا جوعود ہندی کی مشہور محقق ہیں کو ایوان غالب سے شائع ہوئی کتاب 'غالب اور ان کا عہد' تحفتاً پیش کی۔ سمینار میں ازبکستان میں ہندی کی استاد اور مشہور محقق تامرہ خودیجوا نے اپنے پرمغز مقالے میں ازبکستان میں غالب شناسی کی روایت پر روشنی ڈالی۔ اردو ادب کی استاد اور غالب شناس ڈاکٹر محیہ عبدالرحمٰن نے بھی غالب، ان کے عہد اوران کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر محیہ غالب کی غزلوں کو ازبکی زبان میں ترجمہ کر چکی ہیں جس کو لعل بہادر شاستری سینٹر برائے ہندوستانی ثقافت جلد ہی شائع کرے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2018

انجمن تسکین ذوق کے زیر اہتمام انڈو وپاک کاوش امن ودوستی مشاعرے کا اہتمام

کراچی: انجمن تسکین ذوق پاکستان کی جانب سے بھارت سے آئے انڈو پاک رائٹرز فورم کے بانی وصدر، صحافی وشاعر الیاس انجم وبیگم شاداب انجم اور امریکہ سے تشریف لائی شاعرہ و مصورہ صوفیہ انجم تاج کے اعزاز میں مشاعرہ بعنوان انڈو پاک کاوش امن و دوستی منعقد کیا گیا جس میں کراچی کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی انکم ٹیکس کمشنر شاہین نیازی اور صدر فراست رضوی تھے۔ تقریب میں ممتاز ادبی شخصیات سید یاور مہدی، سید نسیم شاہ، معروف گلوکار قمر جگجیت و دیگر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'عوام' کراچی، 6 دسمبر 2018

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

معذور افراد کو اپنی مثبت سوچ سے منزل کی جانب گامزن ہونا چاہیے: ڈاکٹر شاہد اختر

وزیراعظم نریندر مودی نے معذوروں کو بااختیار بنانے کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

عالمی کتاب میلہ میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'شمولیت: بااختیار بنانے کی جانب پہلا قدم' کے موضوع پر مذاکرے کا انعقاد

نئی دہلی: عالمی کتاب میلہ 2019 کی تھیم معذوروں سے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس تھیم کے انتخاب سے معذوروں کے تئیں حکومت ہند کا نیک جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ حکومتی سطح پر ملک کے اندر عزت مآب جناب نریندر مودی جی نے معذوروں کو بااختیار بنانے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے ہیں جو قابل تعریف ہیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے عالمی کتاب میلہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرہ بہ عنوان 'شمولیت: بااختیار بنانے کی جانب پہلا قدم' میں استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان معذوروں کے تعلق سے معاشرے اور سماج کو اپنی سوچ اور نظریے میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود اگر کوئی ذہنی طور پر صحت مند ہے تو ہم اسے معذور نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اسٹیفن ہاکنگ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی سوچ وفکر سے دنیا کے سامنے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جوان کے نام کو رہتی دنیا تک قائم رکھیں گے۔ اس لیے ہمیں معذوروں کے تئیں مساوی جذبہ رکھنے کی ضرورت ہے اور انھیں سماج کے مین اسٹریم میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ کونسل برائیل رسم الخط میں اردو سکھانے کی ایک کتاب شائع کرے گی تاکہ نابینا حضرات بھی اردو سیکھ سکیں۔

اس موقع پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور اس پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی پر مغز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ معذوروں کو لوگوں کی سوچ اور ان کے برتاؤ پر دھیان دینے کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر منزل کی طرف گامزن ہونا چاہیے۔ دنیا ایسے ہی لوگوں کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھتی ہے جن میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ انھوں نے معذوروں کے تئیں معاشرے میں اخلاقی تعلیمات کو عام کرنے پر زور دیا ساتھ ہی ایسے لوگوں کی خدمات پر اردو میں ایک کتاب شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ خصوصی ضروریات کے حامل لوگ تاریخ بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور مثالیں موجود ہیں کہ ایسے لوگ کامیابی کی بلندیوں پر پہنچے ہیں۔

مذاکرے میں شریک فیض اللہ خان نے کہا کہ معذوروں کے تئیں اختیار اور حقوق کی بات تبھی کارگر ہوگی جب ہم اپنی سوچ و فکر میں مثبت تبدیلی لائیں گے۔ ڈاکٹر اصغر علی نے کہا کہ ایسے اہم موضوع پر مذاکرہ کرانا ہی معاشرے کی مثبت سوچ کو اجاگر کرتا ہے۔ ہمیں اس موضوع پر اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر سوربھ رائے نے کہا کہ حکومتی سطح پر معذوروں کے لیے قانون کا نافذ ہونا تو ٹھیک ہے لیکن اس سے بڑھ کر ہماری ذمے داری بنتی ہے کہ ہم ان کے تعلق سے کیسا رویہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر نصر شکیل رومی نے کہا کہ ہمیں اپنے آپ کو معذور تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے اندر صحت مند لوگوں کے مد مقابل کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ ہمیں حکومت اور دوسرے فلاحی اداروں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں خود کو تیار کرنا ہے اور اپنی خود اعتمادی سے دنیا کو بتانا ہے کہ ہم معذور نہیں ہیں۔ اس پروگرام میں کونسل سے شائع شدہ تین کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے سبھی مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور اس پروگرام کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ڈاکٹر عبدالحی نے بھی شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے مین ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے این بی ٹی کی جانب سے بھی شکریہ ادا کیا اور سبھی مہمانوں کو نئے سال کا کلینڈر بھی تحفے میں پیش کیا۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر شمس اقبال اور این بی ٹی کے دیگر اسٹاف کا اہم رول رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 جنوری 2019

عدل، اعتدال واحسان پر مشتمل معاشرہ کے لیے موثر تعلیم ناگزیر: ڈاکٹر اسلم پرویز

دینی تعلیم کے ساتھ سائنس وتکنالوجی کی تعلیم سے استفادہ کی ضرورت: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدارس کے اساتذہ کے تربیتی پروگرام میں مقررین کا اظہار خیال

حیدر آباد: کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے موثر تعلیم ناگزیر ہے اور سائنس وتکنالوجی کے ذریعے قوموں کی ترقی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

(این سی پی یو ایل) نے اساتذہ کے تربیتی پروگرام کے افتتاح کے موقع پر یہاں آج کیا۔ مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم (سی پی ڈی یو ایم ٹی)، مانو اور این سی پی یو ایل کے اشتراک سے مدارس کے اساتذہ کے تربیتی پروگرام کی افتتاحی تقریب میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے شرکت فرمائی۔ انھوں نے مزید کہا کہ تدریس ایک فن ہے اور کامیاب معلم بننے کے لیے باصلاحیت ہونے کے ساتھ تدریس کے فن سے واقفیت ناگزیر ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ادب کے ساتھ زبان کے فروغ دینے پر بھی پوری توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ مدارس کو دینی تعلیم کے ساتھ سائنس وتکنالوجی سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ قوم کی ترقی کی راہ ہموار ہو۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو مساجد کے ذریعہ اور گلی کوچوں میں فروغ دینے کی بھی ضرورت ہے۔ انھوں نے ادب اطفال کے فروغ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تعلیمی مقاصد حاصل کرنے کے لیے بدلتی ہوئی صورتِ حال کے مطابق تدریس ہونی چاہیے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کہا کہ عدل، اعتدال اور احسان پر مشتمل معاشرے کی تشکیل کے لیے موثر تعلیم ناگزیر ہے۔ انھوں نے علوم کی تقسیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ علم حاصل کرنا فرض ہے اور کائنات کی نشانیوں کو سمجھنے کے لیے تعلیم و تفہیم ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ سوال پوچھے جانے کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور معلم کو مثالوں کے ذریعے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے علم کو معرفت الٰہی کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے اساتذہ کو شخصیت سازی اور افراد سازی پر توجہ مرکوز کرنے کی تاکید کی۔

پروفیسر ایچ خدیجہ بیگم، ڈائرکٹر (انچارج)، (سی پی ڈی یو ایم ٹی)، مانو نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے اور تربیتی پروگرام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس کی کارروائی مصباح انظر اسسٹنٹ پروفیسر نے چلائی اور ہدیہ تشکر ڈاکٹر محمد اکبر نے پیش کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 جنوری 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو ادب میں رباعی کا مقام

سنبھل : عبدالغفور ایجوکیشنل سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے یک روزہ سمینار کا انعقاد محلہ گنوری میں کیا گیا جس میں مقامی و بیرونی ادبا نے شرکت کی۔ اس سمینار کا عنوان 'اردو ادب میں رباعی کا مقام' تھا۔ سمینار میں محمد وسیم نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن کریم نعت شریف کی پیش کش سے ہوا۔ انور کیفی مرادآبادی نے کہا کہ اردو ادب میں غزل اور نظم کے بعد رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جسے بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر رباب انجم نے کہا کہ میر و سودا کے عہد زریں سے لے کر عہد متوسطین اور عہد جدید تک ہر دور کے شعرا نے رباعیات کہی ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے رباعی کے فن کو عروج بخشا۔ دور جدید میں

فراق اور جوش نے رباعی کو کمال بخشا۔ ڈاکٹر منور تابش نے کہا کہ ادب میں جو مقام و مرتبہ رباعی کو حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو نہیں ہے کیونکہ اس صنف کے ذریعے شاعر شاعر نہیں بلکہ پختہ کار استاد بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عارف مسعود مرادآبادی اور دیگر مقالہ نگاروں نے بھی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2018

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موبائل وین کی نرمل میں آمد

نرمل: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی موبائل وین 4 جنوری کو نرمل شہر پہنچی۔ گورنمنٹ گرلز جونیئر کالج نرمل میں اردو کتابی میلے کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح ڈی گنگا دھر پرنسپل گورنمنٹ گرلز جونیئر کالج نرمل نے کیا۔ لکچررس محمد منہاج الحق، عبداللطیف، نازیہ پروین، انیس فاطمہ کے علاوہ سیکڑوں طلبہ نے اردو کتب کی خریداری

کی۔ گنگا دھر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مطالعہ سے انسانی ذہن کو تازگی حاصل ہوتی ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مطالعے کے ذریعے شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ گنگا دھر نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ اپنے اندر مطالعے کا شوق پیدا کریں۔ طالبات نے کہا کہ اردو کتب میلے کے باعث اردو زبان کو فروغ حاصل ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ایسے پروگرام مختلف علاقوں میں منعقد کیے جانے چاہئیں۔ طالبات نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے اظہار تشکر کیا۔ محمد افتخار الدین انصاری نمائندہ قومی کونسل کمپیوٹر سنٹر نرمل نے بتایا کہ میلے میں ہزاروں روپے پر مشتمل کتب کی خریداری عمل میں آئی۔ اس موقعے پروین انچارج محمد صدیق، نمائندہ کونسلر محمد عثمان اور دوسرے حضرات موجود تھے۔

روزنامہ 'اعتماد' حیدرآباد، تلنگانہ، 4 جنوری 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

اردو ادب میں وقت کا تصور

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام بین الاقوامی غالب تقریبات کا افتتاح ایوان غالب کے آڈیٹوریم میں نہایت پروقار طریقے سے ہوا، افتتاحی اجلاس میں این این ووہرا، سابق گورنر جموں وکشمیر، جسٹس آفتاب عالم، جسٹس بدر درریز احمد، پروفیسر ہربنس کھیا اور پروفیسر

صدیق الرحمٰن قدوائی کے دست مبارک سے غالب انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس بار کا غالب انعام اردو تحقیق وتنقید کے لیے پروفیسر شرف عالم، اردو نثر کے لیے پروفیسر حسین الحق، اردو شاعری کے لیے جاوید اختر، اردو ڈرامے کے لیے پروفیسر دانش اقبال اور مجموعی علمی خدمات کے لیے پروفیسر اختر الواسع کو دیا گیا۔ یہ انعام مومنٹو، سرٹیفکیٹ اور 75 ہزار روپے پر مشتمل تھا۔ اس موقعے پر این این ووہرا نے کہا کہ آج کی شام بہت مبارک شام ہے، غالب انسٹی ٹیوٹ نے مجھے اتنے اہم اور علمی لوگوں سے ملنے کا موقع فراہم کرایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں تمام زبانوں کا احترام کرنا چاہیے لیکن ان کے سیکھنے کے سلسلے میں کوئی خارجی جبر بالکل غیرمناسب ہے۔ میں تمام انعام یافتگان کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا علمی سفر اسی طرح جاری رہے گا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز مورخ پروفیسر ہربنس کھیا نے فرمایا کہ سمینار کا موضوع نہایت اہم ہے لیکن وقت کی تعریف کے سلسلے میں اتنے زیادہ اختلافات ہیں کہ ان کو مختصر وقت میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اختلاف رائے ہی اس موضوع کا حسن ہے کیونکہ وقت کی کوئی ایک جامد تعریف ممکن ہی نہیں۔ ہم ہر روز اس کائنات میں تبدیلی دیکھتے ہیں لیکن وقت کے معاملے میں تبدیلی اور تسلسل ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس آفتاب عالم نے فرمایا کہ 'اردو ادب میں وقت کا تصور' نہایت اہم موضوع ہے۔ وقت کا ایک عمومی تصور ہے، اس کی مثالیں بھی شعرا کے یہاں کثرت سے مل جاتی ہیں لیکن وقت کا عام تصور کس طرح اجتماعی شعور کو متاثر کرتا ہے یہ زیادہ اہم ہے۔ وقت نرم روی کے ساتھ کسی ندی کے مانند بہتا رہتا ہے لیکن اچانک کبھی کبھی وہ بپھری ہوئی طوفانی ندی کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور یہ ہماری تاریخ، ادب، اور اجتماعی شعور پر بہت گہرے اثرات ڈالتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ غالب کے نام پر ہونے والا جشن غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام جلسوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تقریبات کی خاصیت یہ ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے اساتذہ، اسکالرز، ادبا، شعرا اور طلبہ بڑی تعداد میں ان تمام تقریبات کا حصہ بنتے ہیں۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سمینار بہ عنوان 'اردو ادب میں وقت کا تصور' کے دوسرے دن ملک و بیرون ملک کے نامور ادیبوں و دانشوروں نے شرکت کی۔ پہلے اجلاس کی صدارت کے فرائض ممتاز ادیب و دانشور پروفیسر انیس الرحمٰن نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں 3 مقالے پڑھے گئے۔ سمینار کے دوسرے اجلاس میں چار مقالے پیش کیے گئے اور صدارت کے فرائض سید شاہد مہدی سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے انجام دیے۔ اپنی صدارتی تقریر میں سید شاہد مہدی نے کہا کہ چاروں مقالے مختلف جہتوں میں موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ رام چرتر مانس کے تعلق سے آج میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ تیسرے اجلاس میں دو مقالے پڑھے گئے اور صدارت کے فرائض ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے انجام دیے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ سمینار کا عنوان نہایت اہم ہے۔ ہم ادب کو بہت محدود کینوس میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ کسی بھی تخلیق میں لکھنے والے کا وقت کس طرح نمایاں ہوسکا ہے۔ دوسرے دن کے چوتھے اور آخری اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی۔ خواجہ محمد اکرام نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ وقت ہماری زندگی کا نہایت اہم عنصر ہے۔ اجلاس کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے تمام شرکا اور مقالہ نگار حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا اس پر مختلف پہلوؤں سے بڑی فکرانگیز گفتگو ہورہی ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام سہ روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں وقت کا تصور' کے تیسرے اور آخری دن ملک و بیرون ملک کے مشہور دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پہلے اجلاس میں 4 مقالے پڑھے گئے اور صدارت کے فرائض پروفیسر اصغر وجاہت نے انجام دیے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر اصغر وجاہت نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے اس سے ایک نئی روایت شروع ہوگی۔ اس اجلاس میں جو مقالے پیش کیے گئے ان میں وقت کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش بہت مستحسن ہے۔ دوسرے اجلاس میں چار مقالے پیش کیے گئے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بے حد مسرت ہے کہ جو موضوع منتخب کیا گیا تھا اس پر بڑی معنی خیز گفتگو ہوئی۔ تیسرے اجلاس میں 3 مقالے پڑھے گئے۔ جس کی صدارت ڈاکٹر علی جاوید نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات

ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اس اجلاس میں مختلف شعبوں سے وابستہ افراد نے بڑی معنی خیز گفتگو کی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی و پروفیسر انیس اشفاق نے اختتامی اجلاس میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اختتامی اجلاس کے مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ سمینار کے موضوعات نے جس طرح عہد حاضر کے تقاضوں سے خود کو جوڑا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ سمینار کے مقالے سنتے ہوئے مجھے کئی بار احساس ہوا کہ علوم کی مفروضہ تفریق ختم ہو رہی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24-22 دسمبر 2018

جشن شارب ردولوی

لکھنؤ: پروفیسر شارب ردولوی تہذیب کی ایک روشن علامت ہیں، وہ موجودہ عہد میں اردو ادب کا ایک معتبر دستخط ہیں، ان کی زندگی ہی میں اتنے شاندار اور باوقار جشن کا انعقاد خود ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے اور انھیں سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ریاستی گورنر رام نائک نے کیا۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں

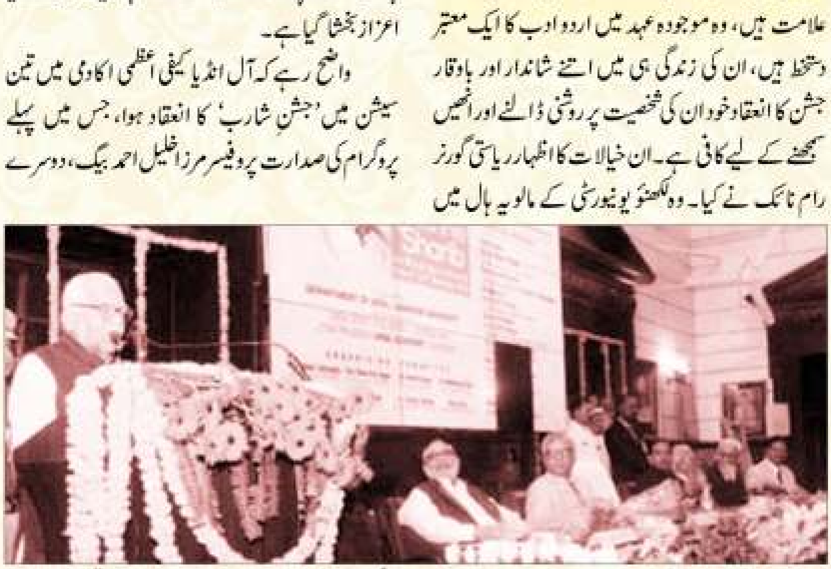

پروفیسر شارب ردولوی کی خدمات پر منعقدہ 'جشن شارب' میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ پروگرام کی صدارت جسٹس سید شبیہ الحسنین اور نظامت پروفیسر عباس رضا نیر نے کی۔ گورنر رام نائک نے کہا کہ ایک شخص جہاں سے پڑھ کے نکلا ہو وہیں اس کی خدمات کا اعتراف اسی کی موجودگی میں کیا جائے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے جسٹس سید شبیہ الحسنین نے کہا کہ پروفیسر شارب ردولوی نے اردو تنقید میں جتنا کام کیا ہے اگر وہ مغرب میں ہوتے تو ان کا شمار ٹی ایس ایلیٹ جیسے نقادوں کے ساتھ کیا جاتا، لیکن یہ اردو کی زبوں حالی اور بدنصیبی ہے کہ پروفیسر شارب ردولوی کے قد کو صحیح طور پر پہچانا نہیں گیا۔ میں اگر کہوں کہ وہ موجودہ عہد میں ترقی پسند تنقید کی آخری شمع ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس پی سنگھ نے کہا کہ پروفیسر شارب ردولوی ایک بڑے آدمی ہونے کے باوجود نہایت سادگی پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ ایک ادیب ہیں، نقاد ہیں، شاعر ہیں۔ اس موقعے پر سینئر صحافی حسن کمال، عارف نقوی (جرمنی)، پروفیسر عباس رضا نیر نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پروفیسر ظفر الدین نے اپنے خطاب میں پروگرام کے محرکات کی تفصیل بیان کی اور ڈاکٹر ریشما پروین نے کلمات خیر مقدم ادا کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے شاگردوں اور جشن شارب کے انعقاد میں شریک تنظیموں کے ذمے داروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، میں آپ سب کی محبتوں کا شکریہ ادا کر سکوں لیکن میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ جس ہال میں اور جس مائک پر میں نے اپنے اساتذہ کو بولتے سنا ہے وہیں آج مجھے یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔

واضح رہے کہ آل انڈیا کیفی اعظمی اکادمی میں تین سیشن میں 'جشنِ شارب' کا انعقاد ہوا، جس میں پہلے پروگرام کی صدارت پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، دوسرے پروگرام کی صدارت ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی اور تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر فضل امام نے کی، جبکہ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر ندیم اور ڈاکٹر محمد کاظم نے بالترتیب ادا کی۔ پہلے سیشن میں مہمان ذی وقار پروفیسر رمیش دیکشت نے شارب ردولوی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شارب ردولوی اردو کے صف اول کے ناقدوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر محمد شکیل، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، ڈاکٹر ارشاد نیازی وغیرہ نے پر مغز گفتگو کی۔ پروفیسر مرزا خلیل بیگ نے کہا کہ تنقید شارب کے مزاج میں شروع سے تھی اسی لیے انھوں نے اچھی خاصی شاعری ترک کر دی اور تنقید کے حوالے سے نہ صرف اپنے قصبے کا بلکہ اپنے اساتذہ اور اپنی مادر علمی کا بھی نام روشن کیا۔ دوسرے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی نے کہا کہ شارب ردولوی اردو تنقید میں کیا رویہ رکھتے ہیں یہ مجھے علم نہیں لیکن میں انھیں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ سائنٹفک فکر کے حامل ہیں۔ تیسرے اور آخری سیشن میں بھی کئی پر مغز مقالے پڑھے گئے۔ آخر میں پروفیسر فضل امام نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ پروفیسر شارب ردولوی کے یہاں شرافت علمی بھی ہے اور شرافت نفسی بھی، جب یہ دونوں خصوصیات کسی میں جمع ہوتی ہیں تو حلم پیدا ہوتا ہے۔ تنقید کے لیے تخلیقی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے اور پروفیسر شارب ردولوی ایک نقاد نہیں ایک فنکار بھی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5-4 دسمبر 2018

جشن ریختہ

نئی دہلی: جشن ریختہ کے عنوان سے ساکنان دہلی کے لیے خوبصورت ادبی تحفہ کے طور پر دہلی کے میجر دھیان چند نیشنل اسٹیڈیم میں پانچویں جشن ریختہ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ جشن دہلی والوں کے لیے اردو زبان، ادب اور تہذیب کو قریب سے جاننے اور اس کے مختلف ذائقوں کو محسوس کرنے کا سبب بنا۔ 14 دسمبر شام چھ بجے معروف روحانی شخصیت مراری باپو نے جشن کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد انتہائی مقبول صوفی موسیقی کار اور قوال وڈالی صاحبان نے اپنے نغموں سے رونق بخشی۔ 15 اور 16 دسمبر کو ادبی مذاکرے، داستان گوئی، چہار بیت، ڈراما، قوالی، غزل سرائی، نوجوان شاعروں کی محفل، خواتین کا مشاعرہ، تمثیلی مشاعرہ، خطاطی، فلم اسکریننگ اور بہت سی دلچسپ تقریبات کے ذریعے اردو زبان اور اس کے تہذیبی رنگوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ جشن ریختہ کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے ریختہ فاؤنڈیشن کے بانی سنجیو صراف نے کہا کہ ہماری کوشش ہر ممکن ذریعے سے اردو زبان و تہذیب کو فروغ دینا ہے۔ ریختہ ویب سائٹ کے ساتھ جشن ریختہ کی تقریبات بھی ہماری انھی کوششوں کا حصہ ہیں۔ گذشتہ چار برس میں جشن ریختہ کو ملی بے پناہ کامیابی اور ہر طبقے و عمر کے لوگوں میں اس کی مقبولیت نے ہمارے ارادوں کو مضبوط کیا ہے۔

پانچویں 'جشن ریختہ' کا سہ روزہ جشن تزک و احتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔ جشن ریختہ کے تیسرے دن کی شروعات دلی گھرانے کے استاد اقبال احمد خاں کے صوفی کلام سے ہوئی۔ اسی کے ساتھ فارسی اور سنسکرت کے رشتوں پر اہم علمی و ادبی شخصیات آشوتوش دیال ماتھر، بلرام شکلا اور ستیہ نارائن ہیڈے نے گفتگو کی جس کے بعد ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے محمود فاروقی کے ساتھ

انتظار حسین کی کہانیوں پر بات کی۔ صوفی موسیقی کے شائقین نوراں بہنوں کے نغموں سے خوب محظوظ ہوئے۔ اس کے علاوہ معروف فلم اداکار اور موسیقی کار انو کپور مجروح سلطان پوری کی زندگی، شاعری اور ان کے نغموں پر مشتمل ایک بہترین پروگرام پیش کیا۔ عسکری نقوی کی سوزخوانی اور مالنی اوستھی کے لوک نغمے اور موسیقی بھی سامعین کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ان سب کے علاوہ متعدد علمی و ادبی شخصیات نے اس سہ روزہ جشن کے آخری دن جشن کی رونق میں اضافہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13، 16، 17 دسمبر 2018

دھلی:

ایران میں اردو زبان و ادب کا منظر نامہ

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام اکادمی کے قمر رئیس سلور جبلی ہال میں توسیعی خطبہ بعنوان 'ایران میں

اردو زبان و ادب کا منظر نامہ' منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی کے بہت سے اہم پروگراموں میں سے ایک سلسلہ توسیعی خطبات کا بھی ہے۔ آج کے توسیعی خطبے کی خطیب ڈاکٹر وفا یزداں منش نے کہا کہ مجھے اردو کے لیے کام کرکے دلی تسکین ملتی ہے، لاشعوری طور پر اردو میری قسمت بن چکی ہے، میں کہیں بھی جاتی ہوں تو میرے ذہن میں ہمیشہ اردو آتی ہے کہ جہاں میں جارہی ہوں وہاں اردو کے ادارے اور افراد سے ملوں۔ ایران میں پہلی بار اصفہان یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہوا، تقریباً پچیس برس قبل تہران یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم ہوا۔ ظاہر ہے اُس وقت ایران میں کوئی اردو نہیں جانتا تھا اس وقت پاکستان کے لوگوں نے شعبۂ اردو کو چلایا، پھر آہستہ آہستہ پاکستان اور ہندوستان آکر ایرانیوں نے اردو سیکھی، آج بہت سے ایرانی پاکستانی اور ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایران میں اس وقت مسلسل اردو کے لیے کام ہو رہا ہے، ایران میں تقابلی مطالعہ، افسانے، شاعری اور تنقید ہر صنف پر کام ہو رہا ہے، ایران میں ادارۃ المعارف ایسا ادارہ ہے، جہاں باضابطہ اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، ایران کے طلبہ کئی بار مجبوراً اردو پڑھنا شروع کرتے ہیں لیکن بعد میں اردو ان کی دلچسپیوں کا حصہ بن جاتی ہے۔ ایران میں انسائیکلو پیڈیا کا کام بھی بہت تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ایران میں بہت سے ماہرین اقبالیات و غالبیات ہیں مگر انھوں نے ان کے اردو کلام کو نہیں پڑھا ہے۔ ایران میں اردو ادب کا ترجمہ نسبتاً کم ہوا ہے۔ اردو میں فارسی کا ایک اہم سرمایہ پوشیدہ ہے مگر میں کہتی ہوں کہ اردو کے احسانات ایران پر زیادہ ہیں۔ اردو نے ہمیں ہندوستان میں بہت عام کیا ہے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ میں نے ایران جاکر دیکھا کہ وہاں اردو کے تئیں تشنگی ہے، وہاں لوگوں میں اردو کے لیے بے چینی اور بے قراری بھی ہے۔ میں نے تہران یونیورسٹی کو پانچ سو کتابیں بھیجی تھیں۔ اس موقعے پر نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ ڈاکٹر وفا یزداں منش کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اردو میں کتابیں اور مقالے لکھے ہیں بلکہ اردو سمیناروں اور سمپوزیموں کو بھی مسلسل خطاب کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے خالص اردو موضوعات پر ایرانیوں کو پی ایچ ڈی بھی کرائی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2018

بیگم عابدہ احمد میموریل لکچر

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ثقافتی تنظیم ہم سب ڈرامہ گروپ کے زیر اہتمام بیگم عابدہ احمد میموریل لکچر کے موقعے پر ممتاز مورخ پروفیسر ہربنس کھیانے 'توحید کے بدلتے معنی کبیر سے غالب تک' کے موضوع پر نہایت عالمانہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ توحید کی تاریخ اسلام سے پرانی ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور ہندو مذہب میں بھی توحید کا تصور ہے۔ اسلام میں توحید کے علاوہ کوئی دوسری دھارا نہیں ہے لیکن ہندو مذہب میں بہت سے دیوی دیوتا کا تصور بھی ہے بلکہ وہاں دہریت کا بھی ایک دھارا ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے بارے میں کچھ تصورات قائم کر لیتے ہیں کہ جو شخص خاص طرح کے اعمال بجالائے اور خاص طرح کے افعال سے باز رہے وہ ہندو یا مسلمان، عیسائی یا سکھ ہے لیکن کبیر کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے اسلام اور ہندوازم کے تضاد کو مٹا کر یونیورسل گاڈ کا تصور دیا۔ غالب کے یہاں بھی اسی خدا کی بات ہوتی ہے جو دیر و حرم میں قید نہیں۔ پروفیسر کھیانے غالب کے مشہور شعر

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

کی روشنی میں کہا کہ یہ غالب کا سب سے خوب صورت شعر ہے۔ اگر دیوان غالب میں سے صرف ایک شعر منتخب کرنے کے لیے کہا جائے تو میں اسی شعر کا انتخاب کروں گا۔ اس شعر میں ہندوستانیت بہت زیادہ ہے اور توحید کی وہی تعریف ملتی ہے جو کبیر کے یہاں نظر آتی ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس بدر دریز احمد نے کہا کہ پروفیسر ہربنس کھیا کا شمار ہندوستان کے ممتاز مورخوں میں ہوتا ہے، انھوں نے ہندی اردو ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ یہ عالمانہ خطبہ اسی کی ایک مثال ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ ہربنس کھیانے کبیر سے لے کر غالب تک تصور توحید کو موضوع بنایا چونکہ وہ ایک مورخ ہیں اور ان کے مطالعے کا دائرہ بہت وسیع ہے

لہٰذا ان کا زاویہ ہی مختلف ہوگا۔ 'ہم سب' ڈرامہ گروپ کی چیئرمین ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے کہا کہ پروفیسر ہربنس مکھیا کے خطبے میں دو باتوں نے مجھے بطور خاص متاثر کیا۔ اوّل انھوں نے مذہب اور مذہبیت کا خوبصورت تصور پیش کیا۔ دوسرے انھوں نے جن مثبت خیالات و افکار کا ذکر کیا ہمیں ان مثبت خیالات و افکار پر منفی اثرات کو حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سید رضا حیدر نے نظامت کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 دسمبر 2018

غالب کا 221 واں یوم پیدائش

نئی دھلی: اردو کے سب سے مقبول شاعر نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، مرزا اسداللہ خان غالب کے

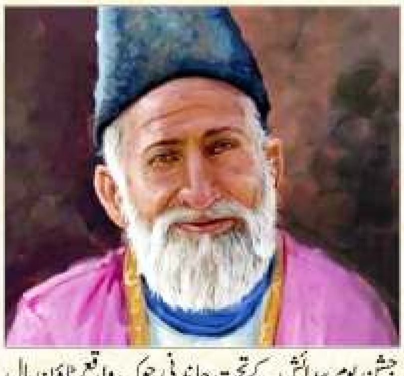

جشن یوم پیدائش کے تحت چاندنی چوک واقع ٹاؤن ہال سے لے کر غالب کی حویلی تک کینڈل مارچ نکالا گیا، جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر سابق ممبر پارلیمنٹ شاہد صدیقی، ڈاکٹر فیروز بخت احمد، اوما شرما، اقبال احمد خان، سریش گوئل، ونے اور بھرت رام نے شرکت کی، مارچ میں شامل اردو ادب سے محبت رکھنے والوں نے غالب کی حویلی پہنچ کر غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ غالب کی عظمت پر شاہد صدیقی نے کہا کہ ہم خوش نصیب ہیں جو آج غالب کی حویلی کو دیکھ رہے ہیں اور اس گلی کو دیکھ رہے ہیں، جہاں غالب نے زندگی بسر کی ہے۔ جو اپنے بزرگوں کی عزت نہیں کرتا وہ اپنی تہذیب کا قدردان نہیں ہوسکتا۔ شاہد صدیقی نے مزید کہا کہ غالب کے یوم وفات پر ہم عرس بھی کریں گے۔ وہیں موجود سریش گوئل نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غالب ایک خیال ہے، ایک جذبہ ہے اور یہ خیال پرانی دہلی والوں پر ایسا ہونا چاہیے کہ غالب دوبارہ زندہ ہوجائے۔ پرانی دہلی ہندوستان کا دل ہے۔ یہاں گنگا جمنی تہذیب موجود ہے، سب بھائی چارے سے رہتے ہیں اور یہی تہذیب مرزا غالب میں بخوبی نظر آتی ہے۔ وہ ہر ایک مذہب کے ماننے والوں سے محبت کرتے تھے۔ غالب کی تحریریں و کتابیں نہ صرف اردو بلکہ ہندی اور انگریزی میں بھی ان کی حویلی میں دستیاب ہونی چاہئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم جنوری 2019

غزل کی ایک شام

نئی دھلی: انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں انڈیا ہیریٹیج سینٹر کی جانب سے غزل کی ایک شام بزم سخن کے عنوان سے آراستہ کی گئی جس میں عالمگیر شہرت کی حامل محترمہ انیتا سنگھوی نے شعرائے غزل کا کلام نہایت خوبصورت آواز اور سنجیدہ انداز میں پیش کیا۔ جسٹس، مہاراجہ کرن سنگھ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے شمع روشن کرکے اس تقریب کا افتتاح کیا، غزل آرٹسٹ انیتا سنگھوی کا استقبال منتظم اعلیٰ پدم شری ڈاکٹر محسن ولی و نواب سید نقوی نے گلدستہ پیش کرکے کیا۔ ناظم محفل ڈاکٹر منصور عثمانی نے عصر حاضر میں اردو زبان کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ محترمہ انیتا سنگھوی کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ محترمہ اب تک ملک و بیرون ملک میں کئی سو شوز کا حصہ بن کر اردو غزل کو رونق بخش رہی ہیں اور خاص طور سے اس طبقے تک اردو زبان پہنچا رہی ہیں جو اردو لکھنا اور پڑھنا تو نہیں جانتے لیکن بولنا پسند کرتے ہیں۔ اس دوران انیتا سنگھوی نے مرزا غالب، فیض احمد فیض، جگر مرادآبادی، داغ دہلوی، نظیر اکبرآبادی کی غزلیں پیش کیں جن کو سامعین نے بہت پسند کیا بعد میں شرکاء بزم کی فرمائش پر صوفیانہ کلام بھی پیش کیا۔ خطبہ اظہار تشکر میں پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے کہا کہ اس کامیاب جشن کے بعد اب ہم جلد ہی محفل صوفیانہ کا انعقاد کرنے جا رہے ہیں۔ اس تقریب میں ڈاکٹر منصور عثمانی و سلیم امروہوی نے مشترکہ طور پر نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 دسمبر 2018

غالب کی رعنائی خیال

نئی دھلی: معروف استاد پروفیسر صادق نے کہا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب نے دہلی جہاں وہ رہتے تھے اور جہاں عمر گزار دی، آگرہ جہاں کے وہ رہنے والے تھے، پر نظم نہیں لکھی مگر بنارس جہاں وہ کچھ عرصے ہی رہے اس پر ایک پوری مثنوی کہہ ڈالی اور وہ بھی 108 اشعار پر مشتمل تھی۔ اس کے دو ترجمے سنسکرت میں اور ایک انگلش میں ہوئے ہیں جو ایم اے انگلش کے کورس میں شامل ہیں۔ وہ عالمی اردو ٹرسٹ رجسٹر دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار اور مباحثہ بعنوان 'غالب کی رعنائی خیال' میں خطبۂ صدارت پیش کررہے تھے۔ پروفیسر صادق نے غالب کی زندگی اور ان کے شہر در شہر سفر سے وابستہ چند واقعات بھی پیش کیے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ دیوان غالب مختصر ہے مگر یہ مختصر کلام اردو شاعری پر غالب آگیا۔ غالب نے عام روش سے ہٹ کر کلام کہا ہے اور بلاشبہ اردو شاعری میں جدت کا آغاز اگر کسی نے کیا ہے تو وہ غالب ہی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ غالب کی شاعری میں قومی یکجہتی کی جو مثالیں موجود ہیں، ان پر غور کرنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری میں موجود فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر (شمالی ہند) شکیل حسن شمسی نے مقالہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے خاص طور پر خاتون مقالہ نگار مہر فاطمہ کے تعلق سے کہا کہ ایک خاتون ہونے کے بعد بھی یوں انھوں نے بڑی بے باکی سے مقالہ پیش کیا۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمٰن نے پڑھے گئے مقالوں پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی مقالے کو پیش کرتے وقت حسب ضرورت اشعار کا کوٹ کرنا اور موضوع کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 دسمبر 2018

اترپردیش:

محمد حسن میموریل سمینار

مراد آباد: ایم ایچ پی جی کالج میں شعبہ اردو سیکشن کی جانب سے محمد حسن میموریل سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح مہمان خصوصی کالج کے سرپرست ڈاکٹر وی اے بیگمنی، منیجر کاویہ سوربھ رستوگی، مقرر خصوصی جے این یو سے آئے پروفیسر شاہد حسین، کالج کی پرنسپل ڈاکٹر مینا کول، شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر اسما عزیز و ڈاکٹر عبدالرب نے شمع روشن کرکے کیا۔ پروگرام کا آغاز طالبہ فوزیہ کی نعت رسولؐ سے ہوا۔ منیجر کاویہ سوربھ رستوگی نے شعبہ اردو کی طرف سے منعقد اس سمینار کی تعریف کرتے ہوئے مستقبل میں بھی اس طرح کے سمینار انعقاد کرائے جانے کی یقین دہانی کرائی۔ اردو ڈرامہ اور ہندوستانی عناصر موضوع پر منعقد اس سمینار کا تعارف ڈاکٹر عبدالرب نے پیش کیا۔ محمد حسن کے شاگرد پروفیسر شاہد حسین نے موضوع پر طویل مقالہ پیش کیا اور ڈرامے کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالرب اور ڈاکٹر اسما عزیز نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 دسمبر 2018

’مجاز لکھنوی کی شاعری‘ پر ایک روزہ سیمینار کا منظر

’حسرت موہانی کی ہمہ جہت شخصیت‘ پر ایک روزہ مذاکرہ

مجاز لکھنوی کی شاعری

لکھنؤ: اپنے دور کے عظیم شاعروں میں شمار اسرار الحق مجاز کو محض رومانی اور انقلابی شاعری تک محدود کر دینا صحیح نہیں کیونکہ ان کی شاعری کو بغور پڑھا جائے اور تجزیہ کیا جائے تو سبھی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے مجاز کی شاعری پر منعقد یک روزہ سیمینار میں کیا۔ راجدھانی کے گومتی نگر واقع اردو اکادمی کے آڈیٹوریم میں ہفتہ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، لکھنؤ اور ’کاروانِ ادب‘ کے زیر اہتمام منعقد اس سیمینار میں شہر کے محبان اردو اور دیگر دانشوروں کی بھی ایک اچھی تعداد نے شرکت کی۔ اس سیمینار کی صدارت مشہور ڈرامہ نگار ولایت جعفری، سابق ڈائرکٹر دوردرشن نے کی۔ مہمان اعزازی کے طور پر معروف صحافی احمد ابراہیم علوی اور معروف اسکالر پروفیسر علی خان محمود آباد شامل ہوئے۔ ڈاکٹر علی خان محمود آباد نے اپنے خطاب میں مجاز کی شاعری سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں رومانیت اور انقلاب کا غلبہ تو ہے مگر ان کے کلام میں کئی اور خوبصورتی بھی ہے جن پر بحث کی ضرورت ہے۔ معروف صحافی احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ مجاز جیسا شاعر اس دور میں ناپید ہے۔ مہمان خصوصی و صدر جلسہ ولایت جعفری نے مجاز لکھنوی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا ذکر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ان کی شاعری کی نشو و نما پر خصوصی طور سے گفتگو کی۔ پروگرام میں ایسوسی ایشن کی سرگرم رکن شازیہ فاروقی نے مجاز کی نظم ’نوجوان خاتون سے خطاب‘ پر ’تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا‘ پر گفتگو کی اور سامعین کی داد حاصل کی جبکہ اس معروف نظم کی تضمین پر ڈاکٹر رخسانہ لاری نے اپنی ایک نظم پیش کی جسے خوب پسند کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت احمد عرفان علیگ نے کی۔ پروگرام کی نظامت احمد عرفان علیگ نے کی۔ پروگرام کے اختتام پر یونیورسٹی کا ترانہ اور قومی ترانہ پیش کیا گیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ لکھنؤ، دہلی، 16 دسمبر 2018

حسرت موہانی کی ہمہ جہت شخصیت پر مذاکرہ

لکھنؤ: حسرت موہانی کی شخصیت اردو ادب کا ایک عہد ہے۔ وہ ملک کی آزادی کے سرفروش سپاہی تھے۔ اگر ان کی شخصیت کا احاطہ کیا جائے تو بیک وقت وہ محقق بھی تھے، مصنف بھی تھے، صحافی بھی تھے، شاعر بھی تھے اور محرک بھی تھے۔ ان کی شخصیت کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالنا ناممکن ہے۔ ہمیں حسرت موہانی کی شاعری کو نئے انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر شارب ردولوی نے کیا۔ راجدھانی کے تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج جگت نارائن روڈ کے آڈیٹوریم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور بزم اردو کے باہمی اشتراک سے ممتاز علیگ، مجاہد آزادی، صحافی و شاعر مولانا حسرت موہانی کی ہمہ جہت شخصیت پر ایک مذاکرہ بعنوان ’داستان حسرت‘ منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے مشہور ادیبہ و مصنفہ عائشہ صدیقی نے شرکت کی۔ ایسوسی ایشن کے لکھنؤ چیپٹر کے صدر جناب طارق صدیقی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں اس پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

پروگرام کے کنوینر احمد عرفان علیگ نے داستان حسرت کے نام سے ایک خاکہ پیش کیا جس میں مولانا حسرت موہانی کے کردار اور افکار کو بہت خوبصورت سے بیان کیا گیا۔ مہمان خصوصی مشہور و معروف مصنفہ عائشہ صدیقی نے حسرت موہانی کی حیات کے دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ کلمات تشکر تبسم قدوائی پرنسپل تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج و سکریٹری بزم اردو نے ادا کیے۔ پروگرام کا آغاز انور حبیب علوی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نظامت کے فرائض عاطف حنیف نے انجام دیے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 2 جنوری 2019

تلنگانہ

فن ترجمہ نگاری: اہمیت و مسائل

حیدر آباد: گلوبلائزیشن کے عہد میں ترجمے کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ترجمہ لوگوں کے درمیان پل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ ترجمے کی بدولت ہم دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ملکوں، قوموں اور زبانوں تک رسائی کا سب سے بہتر ذریعہ ترجمہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو، پروفیسر یعقوب یاور نے کیا۔ پروفیسر موصوف مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالرز اور دیگر حاضرین سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے لیکن اگر ترجمہ نگار اپنے فن سے ذہنی مناسبت رکھتا ہے تو ترجمہ تخلیق کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ پروگرام کے آغاز میں شعبۂ اردو کے پروفیسر فاروق بخشی نے پروفیسر یعقوب یاور کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر یاور ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک مشہور ناول نگار کی حیثیت سے اردو ناول کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ فن ترجمہ نگاری ان کی شخصیت کی ایک منفرد جہت ہے۔ انھوں نے دنیا کے معروف ادبی شاہکاروں کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ کر کے اردو کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ فن ترجمہ نگاری اہمیت اور مسائل کے موضوع پر ان کا یہ توسیعی خطبہ یقیناً ہمارے طلبہ کے لیے فن ترجمہ سے متعلق نئے زاویے کھولے گا۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر ظفر الدین نے بھی شرکت کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر نسیم الدین فریس نے شعبہ اردو میں پروفیسر یعقوب یاور کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور ان کی شال پوشی بھی کی۔ تقریب کی نظامت کے فرائض شعبہ کے ریسرچ اسکالر مستقیم رضا نے بہت خوش اسلوبی سے ادا کیے۔ تقریب کے آخر میں سینئر ریسرچ اسکالر محمد جابر حمزہ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 15 دسمبر 2018

جشنِ خسرو

حیدرآباد: کل ہند مرکز مجلس چشتیہ کے زیر اہتمام چھٹا جشن خسرو شاندار پیمانے پر ہوٹل تاج دکن حیدرآباد میں انعقاد عمل میں آیا۔ صدر مجلس چشتیہ مولانا مظفر علی صوفی چشتی ابوالعلائی نے اس موقعے پر کہا کہ امن کے پیغام کو عام کرنے کے لیے صوفی ازم کا فروغ وقت کی اہم ضرورت بن گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ صوفی سنگیت سماج کے ہر طبقے کا پسندیدہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مجلس چشتیہ کے زیر اہتمام منعقد کیے جانے والے بسنت اور جشن خسرو کے شرکا میں اکثریت غیر مسلم اصحاب کی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بسنت اور جشن خسرو کے انعقاد کا مقصد ہی صوفیائے کرام کی خدمات کو عوام تک پہنچانا ہے۔ مولانا مظفر علی صوفی نے مزید کہا کہ اولیاء اللہ کے تمام آستانوں پر حاضری دینے والے عقیدت مندوں میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم برادران وطن بھی شامل ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ مذہبی رواداری اور آپسی تال میل کو فروغ دینے کے لیے صوفی ازم ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ ممتاز صوفی غزل سنگر انیتا سنگھوی نے حضرت امیر خسرو کے کلام پر دھن پر پیش کرتے ہوئے سماں باندھ دیا۔ اس موقعے پر حضرت امیر خسرو ایکسلینس ایوارڈ برائے صوفی موسیقی انیتا سنگھوی کو دیا گیا۔ مولانا مظفر علی صوفی چشتی ابوالعلائی نے صدارت کی۔ اسلم فرشوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر جاوید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 26 دسمبر 2018

مدھیہ پردیش:

عالمی یوم عربی زبان کی تقریب

بھوپال: عالمی یوم عربی زبان کے موقعے پر وائس چانسلر آر جے راؤ نے شعبۂ عربی میں اپنی صدارتی گفتگو کے دوران زبانوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عربی اور اردو بڑی شیریں زبان کے سیکھنے اور پڑھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر نعمان خان نے اپنے خطاب میں ہندوستان میں عربی زبان کے ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان اور ہندوستان کا رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ عربی زبان ہندوستان میں علمی اور تحقیقی زبان کی حیثیت سے ہمیشہ جانی گئی ہے اور تمام مذاہب اور فرقوں کے لوگوں نے اس کے ارتقا اور خدمت میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ تعجب کی بات یہ ہے کہ عربی زبان و ادب اور قرآن و تفسیر کی خدمت کرنے والے غیر مسلم اسکالرس کی تعداد اس قدر ہے کہ مستقل کئی تصانیف اس موضوع پر آچکی ہیں۔ کناڈا سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر اقبال مسعود ندوی نے اپنے خطاب کے دوران عربی زبان کی اہمیت اور اس کے آفاقی اور عالمی ہونے پر روشنی ڈالی۔ شعبے کے سابق صدر مولانا حسان خان نے عالمی عربی دن کے موقعے پر شعبہ عربی کی مزید ترقی کے منصوبے بنانے پر زور دیا اور یہ امید جتائی کہ وائس چانسلر اپنے مادری علمی کی ترقی میں فعال اور موثر رول ادا کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2018

مہاراشٹر:

ادبی سیمینار کا انعقاد

پونے: ادارۂ بال بھارتی پونے کے شیواجی ہال میں

دوسری جماعت کی درسی کتاب کے لیے منعقد ورکشاپ کے موقع پر بتاریخ 23 دسمبر 2018 رات آٹھ بجے ایک شان دار ادبی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس ادبی سیمینار میں ریاست بھر سے آئے ہوئے منتخب تخلیق کاروں نے افسانے، انشائیے، مزاحیہ مضامین اور خاکوں پر مشتمل اپنی تخلیقات پیش کیں۔ اس کامیاب ادبی سیمینار کی صدارت اردو لسانی کمیٹی کے رکن اور معروف نقاد سلیم شہزاد نے کی جب کہ معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق، مشہور نقاد ڈاکٹر سید صفدر، رکن کمیٹی احمد اقبال اور اردو اسپیشل افسر خان نوید الحق بہ طور مہمانِ خصوصی موجود رہے۔

ادبی سیمینار کا آغاز ڈاکٹر مشاہد رضوی نے تلاوت قرآن سے کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ناصر الدین انصار نے اپنے افتتاحی کلمات میں اس ادبی سیمینار کی غرض و غایت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

اس نشست میں سب سے پہلے مالیگاؤں کے افسانہ نگار شہروز خاور نے اپنا افسانہ 'معتوب' پیش کیا۔ اس کے بعد کامٹی سے تشریف لائے ریحان کوثر نے '100 لفظوں' پر مشتمل تین کہانیاں پیش کیں۔

بعد ازاں ڈاکٹر اشفاق احمد (ناگ پور) نے اپنی منی کہانیاں پیش کیں جب کہ ممبئی سے تشریف لائے عقیل وسیم شاہ نے نہایت مؤثر انداز میں اپنا افسانہ 'آشواسن' پیش کیا۔ اس کے بعد احمد اقبال صاحب (اورنگ آباد) نے اپنا انشائیہ 'شریکِ حیات' پیش کرکے محفل کو شگفتگی عطا کی۔ اس کے بعد بال بھارتی اردو کے اسپیشل افسر خان نوید الحق نے 'ظہیر قدسی' کا دلچسپ خاکہ پیش کرکے سامعین سے بھرپور داد و تحسین حاصل کی۔ اس موقع پر معروف نقاد ڈاکٹر صفدر نے نہایت دلچسپ انداز میں اپنا مزاحیہ مضمون 'عظیم شاعر' پیش کرکے محفل کو کشتِ زعفران بنادیا۔ اس کے بعد برصغیر کے صف اول کے افسانہ نگار سلام بن رزاق نے اپنا معرکہ آرا افسانہ 'معبر' نہایت خوب صورت انداز میں پیش کرکے سامعین کے دل جیت لیے۔ آخر میں نشست کے صدر جناب سلیم شہزاد نے پیش کی گئی تمام تخلیقات پر مفصل تبصرہ کیا۔

رپورٹ: ظفر عابد محمد مصطفیٰ، مہاراشٹر، 26 دسمبر 2018

اردو کارواں

ممبئی: سال نو کی پہلی تاریخ کے پہلے دن، اردو کارواں کے عشرہ اردو کا افتتاحی پروگرام شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی کے اشتراک سے سر فیروز شاہ مہتا آڈیٹوریم میں اردو کلچرل پریڈ کے ساتھ ہوا۔ پریڈ میں امیر خسرو سے لے کر منور رانا تک اور شبلی نعمانی تا رفیعہ شبنم عابدی کو کردار کی شکل میں پیش کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات پاور پوائنٹ پرزینٹیشن کے ذریعے کی گئی جس میں گذشتہ برس کی اردو کاروان کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا اور ان سے منسلک تصاویر بھی دکھائی گئیں۔ اس پیشکش میں خاص بات یہ محسوس کی گئی۔ فرید احمد خان کنوینر اردو کارواں نے اس موقعے پر اردو زبان و ادب کا فروغ ہی نہیں بلکہ نوجوان نسل میں زبان و تہذیب کو لے کر بیداری پیدا کرنا ہے اور صرف اردو زبان کو ہی نہیں بلکہ انگریزی زبان کے غلبے کی وجہ سے ہر زبان کو اپنی بقا کی خاطر چیلنج کا سامنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کاروان نے شہر کے بڑے بڑے آڈیٹوریم میں لاکھوں

کی مالیت سے ایک دن کا پروگرام نہ کرکے اپنا شریک اپنے بچوں یعنی طلبا اور کالجوں کو بنایا ہے۔ ان میں انجمن اسلام کے تمام کالج ایس این ڈی ٹی کالج ماپ خان جونیئر کالج آر سی ڈی ایڈ کالج امام باڑہ مہاراشٹر کالج سرفہرست ہیں۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر مقصود احمد خان سی ای او حج کمیٹی آف انڈیا نے کہا کہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان سے فہم بھی ضروری ہے۔ مادری زبان ہمیشہ علم حاصل کرنا چاہیے۔ آمین پٹیل ایم پی ممبا دیوی نے کہا کہ ہمارے طلبا کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ اردو ذریعہ تعلیم سے ہندوستان جیسے ملک میں بہت وسیع امکانات ہیں۔ پروفیسر شبانہ خان، نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ سوال صرف زبان کا نہیں ایک تہذیب کا ہے۔ ایک قوم کے مستقبل کا ہے نوجوان نسل کا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 جنوری 2018

ہریانہ:

ہریانہ اردو اکادمی میں اردو ورک شاپ

ہریانہ: ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے چلائے جا رہے اردو خط و کتابت کورس سے متعلق ہریانہ اردو اکادمی آئی پی۔ 16، سیکٹر 14، اکادمی بھون کے آڈیٹوریم ہال میں اردو ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں تقریباً پچاس محبانِ اردو نے حصہ لیا۔ اس ورک شاپ میں ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے اردو ٹریز کے روپ میں ڈاکٹر محمد مستمر نے تقریباً اس ورکشاپ میں چار گھنٹے تک اردو زبان کے تعلق سے جانکاریاں فراہم کرائیں۔ اس ورکشاپ کی سب سے خاص بات یہ رہی کہ ڈاکٹر محمد مستمر نے اردو زبان سے متعلق اس طرح جانکاریاں دیں کہ جو عام فہم تھیں یعنی انھوں نے تکنیکی اور سائنٹفک روپ سے اردو لکھنے پڑھنے سے متعلق مسائل کا حل پیش کیا۔ اس ورکشاپ میں تقریباً 50 لوگوں نے حصہ لیا جو لگ بھگ سبھی محکموں سے وابستہ تھے جن میں ٹیچر، وکیل، قانون گو، پٹواری، انجینئر، پرنٹنگ اور الیکٹرانک میڈیا و دیگر محکموں سے وابستہ لوگ موجود رہے۔ اردو سیکھنے والوں میں 20 سال کی عمر سے لے کر 70 سال کی عمر تک کے لوگ شامل تھے۔ اس موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی کے ڈپٹی چیئرمین و ڈائرکٹر ڈاکٹر چندر ترکھا ورکشاپ میں موجود رہے۔ انھوں نے اس موقعے پر اردو خط و کتابت کورس کے تمام طلبہ و طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی اردو کی ترقی و ترویج اور نشر و اشاعت کے لیے آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ اردو خط و کتابت کورس کو مزید کامیاب بنانے کے لیے آپ لوگوں کے مشوروں کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم جنوری 2019

اعزاز و اکرام:

ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہندوستانی زبانوں کا اعلیٰ ادبی ایوارڈ

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون میں منعقد کانفرنس میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں 24 ہندستانی زبانوں کے لیے اعلیٰ ادبی ایوارڈز کا اعلان کرتے ہوئے اردو زبان کے لیے اردو کے معروف ناول نگار رحمٰن عباس کو ان کی تخلیق 'روحزن' کے لیے ادبی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔

رواں سال سات شعری مجموعے، چھ ناول، چھ افسانوی مجموعے، تین ادبی تنقید اور دو مضامین کے مجموعوں کو انعامات کے لیے منتخب کیا گیا ہے، جس میں رحمٰن عباس کے علاوہ ہندی زبان کے لیے چترا مدگل، کشمیری زبان کے لیے مشتاق احمد مشتاق، انگریزی زبان کے لیے انیس سلیم اور بینا ٹھاکر کو میتھلی زبان کے لیے ادبی ایوارڈز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ 'روحزن' رحمٰن عباس کا چوتھا ناول ہے، جس میں انھوں نے ممبئی کی ہمہ جہت زندگی کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی میں محبت کی معنویت اور سنجیدگی کو فلسفیانہ سطح پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ روحزن کا ہندی کے علاوہ جرمن زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے، رحمٰن عباس کی اب تک 7 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں چار ناول 'نخلستان کی تلاش'، 'خدا کے سائے میں'، 'آنکھ مچولی'، 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' اور 'روحزن' شامل ہیں۔ اردو ایوارڈ کا فیصلہ جیوری کی میٹنگ میں ہوا جس کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر شین کاف نظام نے کی اور جیوری ممبران میں پروفیسر بیگ احساس، جناب جینت پرمار اور نصرت ظہیر احمد شامل تھے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 دسمبر 2018

نواز دیوبندی کو گوپال داس نیرج ایوارڈ

دیوبند: 'اتاوہ ہندی سیوا ندھی' کے زیرِ اہتمام منعقدہ 26 ویں سرسوتی پروگرام میں مہمانِ خصوصی اتراکھنڈ کی

گورنر محترمہ بے بی رانی اور پروگرام کے صدر الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس گوند ماتھر کے ہاتھوں عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی کو ان کی ادبی و تعلیمی خدمات کے اعتراف میں پہلے 'گوپال داس نیرج اعزاز 2018' سے نوازا گیا۔ اس دوران بطور خاص اترپردیش اسمبلی کے اسپیکر ہردیہ نارائن دکشت، الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سدھیر اگروال، ایس سی ایس ٹی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر رام شنکر کٹھیریا بھی موجود رہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی اتراکھنڈ کی گورنر محترمہ بے بی رانی نے کہا کہ شعرا اور کویوں نے ہمیشہ سماج کو سیدھا راستہ دکھانے کا کام کیا ہے، شاعروں کی حوصلہ افزائی کیا جانا ایک بہتر اور مثبت قدم ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس گووند ماتھر نے کہا کہ ادب سماج میں بیداری پیدا کرنے کا ایک مضبوط اور بہترین ذریعہ ہے، انھوں نے کہا کہ ادیبوں کی حوصلہ افزائی کیا جانا نہایت اہم اور قابل ستائش قدم ہے۔ ایوارڈ ملنے پر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ گوپال داس نیرج جیسی شخصیت کے نام سے منسوب پہلا ایوارڈ انھیں دیا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 دسمبر 2018

پروفیسر سید محمد عزیز الدین احمد کو ہسٹوریکل ریسرچ فیلوشپ

نئی دہلی: تاریخ داں پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین کو انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، وزارت فروغ انسانی وسائل کی سینئر اکیڈمک فیلوشپ سے نوازا گیا ہے۔ یہ فیلوشپ انھیں دو سال کے لیے عطا کی گئی ہے جس کا موضوع 'ہندوستان کے صوفیائے کرام کی سوانح: تیرہویں

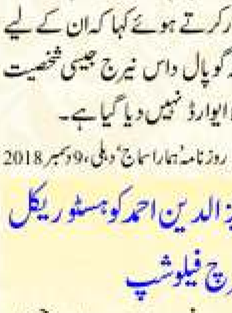

صدی سے اٹھارہویں صدی تک' ہے۔ واضح ہو کہ پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین کی تاریخ کے موضوع پر انگریزی اور اردو میں کئی علمی و تحقیقی کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں جن کی علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ پروفیسر عزیز الدین حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین کے عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں نیز انھوں نے رامپور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر کے عہدے کی بھی کئی برس تک ذمے داری سنبھالی ہے۔ پروفیسر عزیز الدین حسین شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ رہ کر اس تحقیقی کام کو مکمل کریں گے جس کا آغاز انھوں نے دسمبر 2018 سے کر دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 دسمبر 2018

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو ایوارڈ

علی گڑھ: برصغیر ہندوستان و پاکستان کے مشہور افسانہ نگار، محقق و نقاد، تانیثی ادب کے ماہر اور شعبۂ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں و کشمیر) کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کی جانب سے سال 2018 کا دوسرا امتیاز محقق ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو یہ اعزاز یونیورسٹی کے پندرہویں یوم تاسیس کے موقعے پر پروفیسر جاوید مسرت وائس چانسلر کے ہاتھوں دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک شریف، محنتی، دیانت دار اور باصلاحیت شخص ہیں جس نے اپنی محنت اور قابلیت کی بنیاد پر یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک طویل مدت سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے آرہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 دسمبر 2018

پروین شیر کو استقبالیہ

پٹنہ: شاعری زندگی کے پھول کی بکھری ہوئی پنکھڑیاں ہیں۔ کانٹوں کی چبھن محسوس کرتے کرتے دفعتاً تخلی

پنکھڑیوں کا لمس پالینا ہی شاعری ہے۔ یہ کسی درسگاہ سے حاصل شدہ تجربہ نہیں۔ یہ تو زندگی کی رگوں میں پانی کی جگہ تازہ خون ہے۔ یہ باتیں معروف شاعرہ، مصنف، مصور و موسیقار پروین شیر نے کہیں۔ بہار اردو اکادمی کے سمینار ہال میں منعقد تقریب سے خطاب کر رہی تھیں۔ یہ تقریب بہار اردو ڈائرکٹوریٹ نے ان کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ایک شاعر پانی سے علیحدہ کی گئی وہ مچھلی ہے جو تپتی ریت پر تڑپتی ہوئی آسمان کے سمندر کو تکتی رہتی ہے۔ خاموشی کی خشک رگوں کو نغمگی کا تازہ خون شاعری ہی عطا کرتی ہے۔ سچی شاعری آگہی کا تاؤ عطا کرتی ہے۔ شاعر وہ کوزہ گر ہے جو کچی مٹی کی لوئی سے بغیر کسی چاک کے صرف اپنے ہاتھوں سے شاہکار تخلیق کر دیتا ہے۔ شاعری کے بطن سے زندگی کا سچ پیدا ہوتا ہے۔ تقریب کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ استقبالیہ و تعارفی گفتگو کرتے ہوئے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں اعزازی محفل کے انعقاد کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ان کے کارناموں اور خدمات کا اعتراف ان کی ہی زندگی میں کیا جانا اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ احتشام کٹونوی نے کہا کہ پروین شیر ایک کمپلٹ آرٹسٹ ہیں، وہ ایک شاعرہ ہیں، ایک مصور ہیں اور ایک موسیقار ہیں۔ انھوں نے نظمیں، غزلیں، افسانے اور سفرنامے لکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پروین شیر کی ہر نظم زخمی پرندے کی چیخ کے مانند ہے۔ اس موقعے پر پروین شیر کی نئی کتاب 'بکھرانیاں' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 دسمبر 2018

رسم اجرا:

ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ کا افتتاح

نئی دہلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی میں ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ www.worldurduassociation.com کا اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر اساتذہ اور طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کا قیام دو سال قبل عمل میں آیا تھا۔ عالمی سطح پر اردو احباب کو یکجا کرنے کے لیے کافی دنوں سے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کے بینر تلے پوری دنیا کے اردو ادبا و دانشور ایک ساتھ جمع ہو سکیں۔ اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ورلڈ اردو ایسوسی ایشن جیسے عالمی فورم کی داغ بیل ڈالی۔ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کا مقصد پوری دنیا میں موجود اردو کے اساتذہ، قلم کاروں، ادیبوں اور طلبہ و طالبات کے درمیان رابطہ اور اشتراک ہے۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ اردو زبان کا دائرہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ اردو زبان کی شیرینی اور ہندوستانی تہذیب سے آشنائی کی غرض سے لوگ اردو زبان تیزی سے سیکھ رہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 دسمبر 2018

پیاسے لمحے

نئی دہلی: ماتا سندری روڈ واقع ایوانِ غالب میں منعقد ایک پروقار تقریب میں ہندی اور اردو کی شاعرہ کرشنا کمار دامنی

کے شعری مجموعے 'پیاسے لمحے' کی رسم اجرا اردو اور ہندی سے وابستہ اہم ترین شخصیت کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ آل انڈیا ہندی اردو ایکتا فرنٹ کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب میں مہمانانِ خصوصی کے طور پر گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار اور معروف شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول، لکشمی نگر سے رکن اسمبلی نتین تیاگی اور ڈاکٹر عفت زریں نے شرکت کی، جبکہ مہمانانِ ذی وقار کے طور پر آل انڈیا ریڈیو کے سابق ڈائرکٹر جنرل لکشمی شنکر واجپئی کے علاوہ دیگر حضرات نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔ تقریب میں نظامت ریشما فاروقی نے کی۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے روفیسر شہپر رسول نے کہا کہ کرشنا کمار دامنی نے نثری نظم کی شکل میں اپنے شعری مجموعہ 'پیاسے لمحے' میں جو شاعری پیش کی ہے اس میں ایک پیغام، جذبہ خیال پیش کیا گیا ہے اور اس میں یقیناً ایسے خیالات ہیں، جو زندگی کو فروغ دیتے ہوں۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کرشنا کمار دامنی نے کہا کہ میری شروع سے ہی ہندی اور اردو کو قریب لانے کی خواہش تھی اور اپنی اس خواہش کو منظر عام پر لانے کے لیے آل انڈیا ہندی اردو ایکتا فرنٹ کا قیام کیا،

جوار و اور ہندی کے فروغ اور ان دونوں زبانوں کو قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ کرشنا کمار دامنی نے یہ بھی کہا کہ آل انڈیا ہندی اردو ایکتا فرنٹ ایسے 51 ادیب، مصنف اور شاعر جو اپنی مالی حالت کی وجہ سے اپنی تخلیقات شائع نہیں کروا پا رہے ہیں ان کی تخلیقات کو شائع کرانے کے لیے اپنا بھرپور تعاون دے گا۔ کتاب کی رسم اجرا کے بعد محفل شعر و سخن کا انعقاد کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2018

خیالاتِ ارشد

مراد آباد: نیشنل سوشل آرگنائزیشن کے صدر و سماجی رکن مرزا ارشد بیگ کی قلمی کاوش خیالات ارشد کی رسم اجرا کسرول خواجہ نگری میں ان کی رہائش گاہ پر حکیم عتیق اہل کی سرپرستی میں مولانا افضال الرحمٰن رکن جامعہ ملیہ اسلامیہ و حاجی محمد عثمان منیجر ہیوٹ مسلم انٹر کالج کے دست مبارک سے ہوا۔ اس پروگرام کی صدارت جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے استاذ حدیث و نائب صدر جمعیۃ علما یوپی مولانا خورشید انور نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر ایم رحمٰن مقامی امیر جماعت اسلامی سابق میئر ہمایوں قدیر مولانا محمد فاروق احمد نظامی ایڈوکیٹ تھے۔ ان سبھی نے ارشد بیگ کی سماجی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں ایک اچھا صحافی بہتر سماجی رکن اور اردو کا محسن قرار دیتے ہوئے خیالات ارد کی بہتر ادبی کاوش قرار دیا اور مرزا ارشد بیگ کو دلی مبارک باد اور نیک خواہشات سے نوازا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی حاجی محمد عثمان منیجر ہیوٹ مسلم انٹر کالج نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی سب سے پیاری اور سب سے پرانی زبان ہے ہمیں اس زبان کے تحفظ کے لیے اپنے بچوں کو پڑھانے کی ضرورت ہے۔ پروگرام کے اخیر میں پروگرام کے کنوینر مرزا ارشد بیگ نے تمام معزز مہمانان کا تہہ دل سے استقبال و خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 دسمبر 2018

حرف حرف زندگی

نئی دھلی: دارالعلوم دیوبند نے صرف علوم اسلامیہ کے محققین، مفسرین ہی نہیں پیدا کیے بلکہ اردو زبان و ادب کی زلف خمیدہ کو سجانے سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات آل انڈیا تنظیم علمائے ہند کے قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی کی کتاب 'حرف حرف زندگی' کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔

ضیاء قادری کے مجموعۂ غزلیات 'رعنائی ضیاء' کے اجرا کا منظر

قومی یکجہتی کے لیے کام کرنے والی تنظیم 'تہذیب' کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب میں انھوں نے کہا کہ دارالعلوم کے فیض یافتگان نے جہاں مذہبی میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، وہیں ادبی میدان میں بھی اپنی نمایاں شناخت قائم کی ہے اور ان کے کارنامے سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، آجکل کے سابق ایڈیٹر شہباز حسین نے بھی خطاب کیا۔ قبل ازیں تنظیم 'تہذیب' کے سربراہ اور سابق سرکاری افسر سید ضیاء الرحمٰن غوثی نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور انھوں نے مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور ادبی میدان میں نمایاں کام کیا ہے۔ کتاب کے مصنف امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے نائب ناظم مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے کہا کہ اس کتاب میں سب کچھ ہے۔ دنیاوی مسائل کا بھی ذکر ہے اور دینی ضروریات کا بھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 دسمبر 2018

امروز عالم کی غزل کا مجموعہ

افضل گڑھ: امروز عالم کا غزلوں کے مجموعے کا اجرا معروف فلم اسٹار جانی لیور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ امروز کی اس کامیابی پر اہل خانہ و دوست احباب میں خوشی کا ماحول ہے۔ نزدیکی موضع سیر باسو چند میں نانی کے گھر رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے امروز کا گھریلو نام سرفراز احمد ہے۔ امروز کے استاذ ماسٹر ایس ایم اسلم نے بتایا کہ امروز کو ابتدا میں تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی جبکہ بلند مقام حاصل کرنے کی تمنا دل میں ضرور تھی اور اسی تمنا کو لے کر امروز نے ممبئی کا رخ کیا جہاں پر امروز عالم نے غزلیں، قطعات، نظمیں اور گیت لکھنا شروع کر دیے ان کے مجموعہ کا اجرا ممبئی کے ایک عالیشان ہوٹل میں معروف فلم اداکار جانی لیور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 دسمبر 2018

رعنائی ضیاء

لکھنؤ: سہارا انڈیا پریوار کے سرپرست اعلیٰ جناب سہارا شری سبرت رائے سہارا چیئرمین نے کہا کہ ضیاء قادری سے میری ملاقات 1982 میں ہوئی۔ میں ان کے شعر سنتا رہا ہوں اور ان کی شاعری کا مداح رہا ہوں۔ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ان کے مجموعۂ غزلیات کا اجرا میرے ہاتھوں ہو رہا ہے، اس کے لیے ضیا قادری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ وہ سہارا شہر میں کرکٹ گراؤنڈ کلب میں واقع سہارا انڈیا پریوار کے ڈپٹی ڈائرکٹر ورکر، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے پرنٹر پبلشر اور معروف شاعر ضیا قادری اجمیری کے مجموعہ غزلیات 'رعنائی ضیا' کا اجرا کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سہارا انڈیا پریوار کے ڈپٹی مینجنگ ورکر جناب او پی شریواستو جی نے کہا کہ ہر شخص سماج میں اپنے ہنر سے اپنا مقام بناتا ہے۔ صاحب کتاب ضیا قادری اجمیری نے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے عزت مآب سہارا شری جی کی رہبری، خلوص، ہمدردی اور کرم فرمائیاں ملی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میرا نام ضیا ہے اور میری اہلیہ کا نام رعنا اور انھیں ملا کر اس کتاب کا نام 'رعنائی ضیاء' رکھا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 دسمبر 2018

زبان من و خلق

حیدرآباد: ہمارے عہد کی ایک بڑی ادبی شخصیت کا نام مضطر مجاز تھا جو شاعر اور مترجم ہونے کے ساتھ ایک صاحب بصیرت ادیب بھی تھے۔ ان کی تحریروں پر بھی ان کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر بیگ احساس سابق صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ وہ مضطر مجاز کی تازہ ترین کتاب کی رسم رونمائی تقریب سے مخاطب تھے جو میڈیا پلس آڈیٹوریم حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔ ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکادمی نے محفل اقبال شناسی کے

فن خطاطی کے ذریعے بیگم محمد جہاں کے تحریر کردہ قرآن مجید کی رسم رونمائی

حوالے سے کہا کہ مضطر مجاز مرحوم نے اپنے کمال فن اپنے افکار اور اپنی تخلیقی قوت سے ایسی نثر اور شاعری تخلیق کی جو ادب میں قیمتی سرمائے کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال مدیر 'شگوفہ' نے کہا کہ جن میں کثرت معنی اور ثروت فکر کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی سابق صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے مضطر مجاز کے ساتھ گزرے لمحوں کو یاد کیا اور کہا کہ مضطر مجاز نے شاعری کے ساتھ اپنی نثر سے بھی اپنے ہمعصروں کو متاثر کیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 دسمبر 2018

رودولی کے تاریخی مقامات: ہماری تہذیب ہماری وراثت

پورے ڈلئی، بارہ بنکی: لائنس کلب کے زیر اہتمام یوم اتحاد کے موقعے پر تاریخی قصبہ رودولی کو صاف ستھرا بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی وراثت کو سنبھالنے و اس سے عوام کو متعارف کرانے کی غرض سے 'ہیریٹیج واک' (تاریخی مقامات کا دورہ) کا انعقاد کیا گیا۔ معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر شارب رودولوی نے رودولی کی تاریخی عمارت 'دودھا دھاری' سے جھنڈا دکھا کر اس ہیریٹیج واک کی شروعات کی اور اس کی قیادت بھی کی۔ دودھاری ہندو مسلم اتحاد کی مثال ہے، اس کی تعمیر 1901 میں کاشی رام جیسوال نے کی تھی اس میں تین مسجدیں، چار امام باڑے، ایک پری گھر اور ایک جنات گھر ہے۔ اس کے بعد رودولی کے مشہور صوفی مخدوم عبدالحق رودولی کی 603 سال قدیم درگاہ، بعد ازاں امام باڑہ حسینیہ ارشادیہ جو کہ چودھری ارشاد حسین نے بنوایا تھا۔ آخر میں دیوکالی کے قدیم مندر پر ہیریٹیج واک کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر جے این یو کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شارب رودولوی نے کہا کہ قصبہ رودولی گنگا جمنی تہذیب کی نہ صرف ایک مثال ہے بلکہ یہ اتحاد اور بھائی چارہ کا علمبردار بھی ہے۔ اس موقعے پر معروف مورخ ڈاکٹر یوگیش پروین لکھنوی، شوبھت اگروال، نواب میر جعفر عبداللہ، آشیش شرما نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر ایک کتابچہ 'رودولی کے تاریخی مقامات: ہماری تہذیب ہماری وراثت' کی رسم اجرا بھی ہوئی۔

پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر نہال رضا نے مہمانوں کا استقبال کیا اور شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2018

فن خطاطی کے ذریعے بیگم محمد جہاں کے تحریر کردہ قرآن مجید کی رسم رونمائی

نئی دهلی: راجدھانی کے کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا کے ڈپٹی اسپیکر ہال میں منعقد ایک پر وقار تقریب میں مشہور استاد اور مصنف بیگم محمد جہاں کے ہاتھوں سے تحریر کردہ قرآن مجید کی رسم اجرا اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن دہلی اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری فاؤنڈیشن کے اشتراک سے منعقدہ خصوصی پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شاہجہانی مسجد فتح پوری کے امام و خطیب ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نقشبندی، افغانستان کے سفیر خیر اللہ آزاد، لیبیا کے سفیر خالد اے ازول اور پروفیسر نزہت قاسمی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نقشبندی نے بیگم محمد جہاں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ اچھی لکھائی کیا ہوتی ہے لیکن بیگم جہاں نے جو کتابت قرآن مجید میں پیش کی ہے، وہ بے نظیر ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ فن خطاطی کا شوق رکھتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ قرآن کریم جیسی مقدس کتاب کو اپنی خطاطی میں پیش کریں۔ ڈاکٹر ناصر حسین نے کہا کہ بیگم جہاں نے موجودہ دور بالخصوص جدید ٹکنالوجی اور کمپیوٹر کے زمانے میں فن خطاطی کو پیش کر کے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تقریب کا آغاز مولانا عبدالرحمٰن کی تلاوت کلام پاک اور خدیجہ اور علوینہ قریشی کے نعتیہ کلام سے ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے مہمانان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ بیگم محمد جہاں نے قرآن شریف کا ایک قلمی نسخہ تیار کر کے روایتی فن خطاطی کی ہندوستان میں ایک مثال قائم کی ہے، جو مستقبل میں خواتین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ تقریب کا اختتام مفتی مکرم احمد کی دعا پر ہوا۔ اس موقعے پر سیاسی، سماجی اور ملی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2018

وفیات:

ڈاکٹر سلیم اختر

نئی دهلی / لاهور: ممتاز مصنف، محقق، شاعر اور کالم نگار ڈاکٹر سلیم اختر کا 84 برس کی عمر میں 30 دسمبر کو لاہور میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر 100 سے زائد کتابیں تحریر کیں، وہ ایک عرصے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر 11 مارچ 1934 کو لاہور میں

پیدا ہوئے، انھوں نے میٹرک فیض الاسلام ہائی اسکول راولپنڈی سے 1951 میں کیا، ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی اور ڈپلومہ آف لائبریری سائنس، ایم اے، اور پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین تخلیق کار بھی تھے۔ ان کی کتاب 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' اردو ادب کی اب تک لکھی گئی تاریخ میں ایک اہم حوالہ تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی نماز جنازہ صبح ان کی رہائش گاہ جہاں زیب بلاک اقبال ٹاؤن میں ادا کی گئی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹا اور 2 بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 دسمبر 2018

حامدی کاشمیری

سری نگر: کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور کہنہ مشق شاعر و ادیب حامدی کاشمیری 12 دسمبر 2018 کو رحلت کر گئے۔ مرحوم کی عمر 86 برس کی تھی۔ حامدی کاشمیری اردو اور کشمیری زبان کے نابغۂ روزگار شاعر و ادیب تھے۔ آپ نے دونوں زبانوں کی خدمت اور

ترویج کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مرحوم حامدی کاشمیری نے کم و بیش 50 کتابیں تصنیف و تالیف

کی ہیں جن میں معاصر تنقید، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، شیخ العالم اور شاعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حامدی کاشمیری کو اردو اور کشمیری زبان و ادب کی خدمات کے تئیں غالب ایوارڈ اور 2005 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر حامدی نے ملک میں بحیثیت اردو ادیب اور شاعر اپنی بڑی پہچان بنائی تھی اور وہ کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر حامدی نے اردو اور کشمیری ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں جس کے لیے ان کو کافی دیر تک یاد کیا جائے گا۔ ڈاکٹر حامدی نے کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دی تھیں۔ مرحوم نے بحیثیت وائس چانسلر بھی یونیورسٹی کے لیے بہت ہی مشکل حالات میں اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ ان خدمات کے لیے ان کو یاد کیا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2018

خالدہ حسین

نئی دھلی: پاکستان کی معروف افسانہ نگار خالدہ حسین کا 11 جنوری 2019 کو 81 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ 18 جولائی 1938 کو لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان

کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں پہچان، دروازہ، مصروف عورت، جینے کی پابندیاں، خواب میں ہنوز اور میں یہاں ہوں شامل ہیں۔ انھوں نے ایک ناول 'کاغذی گھاٹ' بھی تصنیف کیا تھا۔ حکومت پاکستان نے انھیں 14 اگست 2005 کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے سرفراز کیا تھا۔ ان کی تدفین اسلام آباد میں عمل میں آئی۔ ان کے انتقال پر ہندوستان میں بھی اہم ادبی و سماجی شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 جنوری 2019

مشیر الحسن

نئی دھلی: معروف دانشور، مورخ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پدم شری پروفیسر مشیر الحسن کا 10 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ انھیں ہزاروں سوگواران کی موجودگی

میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا، اس موقعے پر سابق نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر شاہد اشرف، مسجل اے پی صدیقی (آئی پی ایس)، سابق وائس چانسلر نجیب جنگ اور شاہد مہدی سمیت بڑی تعداد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبہ اور کارکنان نے شرکت کی۔ پروفیسر شاہد اشرف نے ان کے انتقال کو ایک عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے جامعہ برادری کے علاوہ ملک کے لیے ایک عظیم نقصان قرار دیا۔ انھوں نے تحقیق و تدوین اور علم کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں انھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر مشیر الحسن 69 سال کے تھے۔ ان کی پیدائش 15 اگست 1949 میں ہوئی تھی۔ انھیں پدم شری سمیت متعدد اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ انھوں نے 50 سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم و تعلم کے علاوہ پروفیسر مشیر الحسن 1992 سے 1996 کے درمیان جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرو وائس چانسلر اور 2004 سے 2009 کے درمیان جامعہ کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ کو ایک نئی شناخت دلانے، تعمیر و ترقی اور علمی ماحول پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ وہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔ تقسیم ہند اور جنوبی ایشیا میں اسلام کی تاریخ پر انھوں نے قابل قدر کام کیا جسے تادیر یاد رکھا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 دسمبر 2018

رئیس احمد وسیم

ھاپوڑ: ایک ایسا شاعر جو سادہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی شریف النفس بھی تھا، ان کی شاعری میں سماج کا درد اور کرب موجود تھا۔ رئیس احمد وسیم ہاپوڑی، جس نے تقریباً چالیس سالہ زندگی میں اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ گذشتہ کچھ عرصے سے دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ اسی مرض میں وہ ادبی دنیا کو 16 جنوری 2019 داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کی شناخت علاقہ میں خاصی اچھی تھی۔ ان کی شاعری بہت پسند کی جاتی تھی۔ تحت اللفظ میں پڑھنے کا ان کا لب و لہجہ جداگانہ تھا جو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ان کی تدفین قبرستان برادر سلمانی ہاپوڑ میں ہوئی۔ جنازہ میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد شاعری کی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس موقعے پر استاد شاعر الیاس جالب نے گہرے غم کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ فروغ اردو زبان ٹرسٹ ہاپوڑ کے زیر اہتمام ماہانہ شعری نشست میں کئی بار شرکت کی اور اچھی شاعری سے نوازا۔ غم کی گھڑی میں فروغ اردو زبان ٹرسٹ ان کے اقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2019

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

لکھنؤ: دار العلوم ندوۃ العلما کے معتمد تعلیمات مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا 16 جنوری کی صبح فجر کی نماز سے قبل انتقال ہوگیا۔ خبر پاکر راجدھانی لکھنؤ کے علمی،

سماجی، سیاسی سمیت دیگر لوگ جوق در جوق ندوۃ العلما پہنچے اور تعزیت پیش کی۔ مولانا کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر ندوۃ العلما کے گراؤنڈ میں ڈاکٹر مولانا سعید الرحمن اعظمی نے پڑھائی، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی مولانا علی میاں ندوی مرحوم کے بھانجے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید رابع حسنی ندوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا کی عمر تقریباً 83 برس تھی۔ پسماندگان میں ایک صاحبزادے مولانا سید محمد جعفر حسنی ندوی ہیں۔ مولانا واضح ندوی عربی زبان و ادب اور برصغیر میں جدید عربی صحافت کا بڑا نام ہے۔ مولانا کی خدمات کے پیش نظر انھیں صدر جمہوریہ سمیت دیگر بہت سے ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ مولانا ایک بے لوث داعی، خاموش مجاہد، باکمال مصنف، مفکر، عظیم دانشور، ماہر تعلیمات اور فکر کار تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن رائے بریلی سے حاصل کی۔ عالیہ درجات کی تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ 1951 میں ندوۃ العلما کے شعبہ تخصص عربی ادب سے فارغ ہوئے، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں پوسٹ گریجویشن کیا۔

مولانا کی عملی زندگی کی ابتدا آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت مترجم واناؤنسر کے ذریعے ہوئی، جہاں انھوں نے 1953 سے 1973 تک کام کیا۔ مولانا کے متعدد علمی و ادبی مقالات ومضامین، کہانیاں اور تمثیلی ڈرامے دہلی اور دیگر مقامات کے ریڈیو اسٹیشنوں سے عربی زبان میں نشر ہوئے۔ 1973 میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں بحیثیت استاذ مقرر ہوئے اور پندرہ روزہ 'الرائد' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2019

مولانا صادق علی بستوی

سنت کبیر نگر: ہندوستان کے معروف عالم دین، دانشور، شاعر، صحافی، ادیب، مصنف اور ماہنامہ 'نقوش حیات' کے مدیر مولانا صادق علی قاسمی بستوی کا 15 دسمبر کو مختصر علالت کے بعد ان کے آبائی وطن میں انتقال ہوگیا۔

ان کی عمر 82 سال تھی۔ مولانا صادق بستوی 15 اپریل 1936 کو اترپردیش کے ضلع سنت کبیر نگر (سابق بستی) کے موضع دریاباد کے ایک غریب کنبے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں سے 1955 میں فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے وہیں سے دورہ تفسیر کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی، علامہ ابراہیم بلیاوی اور ملا بہاری وغیرہ جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل، یوپی بورڈ الہ آباد سے فاضل معقولات، لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل تفسیر اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا صادق علی قاسمی بستوی نے شروع میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ 1966 میں خالد کمال اشاعت گھر کی بنیاد رکھی اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ یہاں سے صادق بستوی نے اپنا مجموعہ کلام 'نقوش زندگی'، بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'گلدستہ'، دوسرا مجموعہ کلام 'تب وتاب' کہانی 'مظلوم شہزادہ' کے علاوہ کتابیں شائع کیں۔ مولانا نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ انھوں نے روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، روزنامہ 'مشرقی آواز' گورکھپوری، روزنامہ 'قومی آواز' لکھنؤ کے نامہ نگار کی حیثیت سے صحافتی خدمات انجام دیں۔ گورکھپور سے روزنامہ 'راپتی' نکلا تو اس کے ایڈیٹر بنائے گئے۔ انھوں نے اپنا ایک رسالہ 'نقوش حیات' کے نام سے نکالا جو عوام میں کافی مقبول ہوا۔ گذشتہ 32 سال سے یہ رسالہ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ مولانا بستوی کو ان کے آبائی وطن دریاباد میں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 دسمبر 2018

ایم اے امروہوی

سہارنپور: استاذ الشعرا حضرت سید مرغوب الامین کاظمی ایم اے امروہوی نبیرہ حضرت مولانا سید محمد خلیل کاظمی بہ تخلص خاکی علامہ امروہی قادری چشتی صابری کا 17 دسمبر کو 85 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ واضح رہے کہ عرصۂ دراز سے وہ سہارنپور میں ہی سکونت اختیار کیے ہوئے تھے اور جامعہ غوثیہ رضویہ میں انھوں نے باقی زندگی گزاری اور آخری سانس بھی یہیں لی ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ

امروہہ کے علاوہ سہارنپور میں بھی ہے۔ انھوں نے اپنے دو مجموعے چھوڑے ہیں۔ 'وجہ کن فکاں' اور 'روح مناقب'۔ علاوہ ازیں علامہ خاکی کی سوانح حیات قطب درخشاں کے نام سے ہیں۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم شرافت اور قدیم وضع قطع کی شخصیت تھے۔ انتہائی نیک اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ ان کی تدفین غوث نگر کے تکیہ سادات میں کی گئی۔ جنازے اور تدفین میں تمام مکاتب فکر کی شخصیات اور ادیب وشاعر موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 دسمبر 2018

پروفیسر رافق زماں

بھاگلپور: خانقاہ شہبازیہ کی معروف علمی شخصیت پروفیسر ڈاکٹر سید رافق زماں کا 24 سمبر کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم طویل عرصے سے بیمار تھے۔ ان کے انتقال پر ادبی اور سماجی حلقہ سوگوار ہے۔ ان کی عمر 74 سال کے قریب تھی۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ انھیں شاہجہانی مسجد میں سپرد خاک کیا گیا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علمی کارناموں میں شہباز عرش پرواز جو خانقاہ میں سب سے پہلی اور مولانا شہباز محمد بھاگلپوری کی سیرت پر لکھی گئی ہے۔ سجادگان کی کئی کتابوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ، جس میں سب سے مشہور مولانا اشرف عالم کی کتاب رسالہ اشرف کا ترجمہ شامل ہے۔ انگریزی میں مولانا شہباز کی سیرت پر 'گلوریس شہبازیہ ٹریڈیشن' نامی کتاب لکھی، ہندی میں 'شہبازیہ جیوتی' لکھی۔ اس کے علاوہ مرحوم کا شعری مجموعہ 'آبشار' بہار اردو اکادمی کے تعاون سے شائع ہوا تھا۔ پروفیسر رافق زماں کے فزکس کے استاد رہتے ہوئے اردو اور فارسی کی بڑی خدمات انجام دیں۔ مولانا فائق کی کتاب ارمغان فائق کو بھی جمع کیا جو مولانا فائق کا شعری مجموعہ ہے۔ مرحوم فزکس کے ماہر تھے لیکن اردو فارسی میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اردو ادب کے فروغ کے لیے شہبازیہ ادبی کاؤنسل قائم کیا تھا جو برسوں چلتا رہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2018

ظفر جنگ پوری

نئی دھلی: نیو فرینڈس کالونی کی جامع مسجد میں تقریباً 40 سال تک منصب امامت پر فائز رہنے والے معروف شاعر مولانا سید عبدالعزیز ظفر جنگ پوری تقریباً 14 ماہ کی علالت کے بعد 107 سال کی عمر میں 31 دسمبر 2019 کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں وفات پاگئے۔ مولانا مرحوم جہاں ایک اچھے عالم دین تھے وہیں کہنہ مشق اور صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ یوں تو انھوں نے تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن نعت گوئی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ تدفین قبرستان حضرت نظام الدین میں ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم جنوری 2019

قادر خان

ممبئی: ہندی فلمی دنیا کے عظیم اداکار اور اسکرپٹ رائٹر

اور ڈائیلاگ لکھنے والے قادر خان کا یکم جنوری 2019 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 81 سال تھی۔ مسٹر

خان کے ایک رشتہ دار نے منگل کو یو این آئی کو بتایا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ اداکار طویل عرصے سے بیمار تھے اور تقریباً 16-17 ہفتوں سے ٹورنٹو کے ہسپتال میں داخل تھے۔ ان کے خاندان میں اہلیہ ہاجرہ، بیٹا سرفراز، بہو اور پوتے پوتیاں ہیں۔ مسٹر خان 22 اکتوبر، 1937 کو کابل (افغانستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے 43 سال کے فلمی کیریئر میں انھوں نے 300 سے زائد فلموں میں کام کیا اور تقریباً 250 فلموں کے ڈائیلاگ لکھے۔ وہ معاون اداکار، ویلن، کامیڈین اور کریکٹر ایکٹر ہر قسم کے کردار میں خود کو مکمل طور پر ڈھال لیتے تھے۔ انھوں نے 1970 اور 1980 کی دہائی میں کئی فلموں کے اسکرپٹ اور ڈائیلاگ لکھے تھے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ سال 1974 میں آنے والی فلم 'سگینا' سے انھوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے دل دیوانہ، بے نام، عمر قید، اناڑی، بیراگ، خون پسینہ، پرورش، مقدر کا سکندر، مسٹر نٹور لال، سہاگ، عبداللہ، دو اور دو پانچ، قربانی، یارانہ، بلندی اور نصیب جیسی بہت سی فلمیں کیں۔ وہ فلموں میں کیریئر بنانے سے پہلے سول انجینئرنگ کے طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ 300 سے زائد فلموں میں کام کر چکے ہیں، لیکن مرحوم قادر خان کے بارے میں اکثریت اس بات سے لاعلم ہے کہ وہ تقریباً 25 سال سے اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے اور دین کی ترویج و تبلیغ میں سرگرم تھے۔ قادر خان اپنے اہل خانہ کے ہمراہ کابل سے ممبئی پہنچے اور جنوبی ممبئی کے کماٹی پورہ اور پھر تاڑ دیو علاقے میں قیام کیا۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 جنوری 2018

خراج عقیدت:

مولانا مظہر الحق کو خراج عقیدت

پٹنہ: عظیم مجاہد آزادی اور ماہر تعلیم مولانا مظہر الحق کے یوم وفات 2 جنوری کو مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ کے کانفرنس ہال میں مولانا مرحوم کے لیے ایصال ثواب اور انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک مخصوص نشست کا انعقاد کیا گیا جس کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خالد مرزا نے کہا کہ مولانا مظہر الحق کا شمار ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے ملک و قوم کی آزادی اور تعمیر کے لیے جو خدمات اور قربانیاں پیش کیں وہ تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کی ولادت 22 دسمبر کی مناسبت سے گذشتہ 22 دسمبر 2018 کو اس یونیورسٹی کا چوتھا اجلاس تقسیم اسناد اور جشن سالانہ منعقد ہوا جس کی صدارت عزت مآب گورنر بہار اور چانسلر شری لال جی ٹنڈن نے کی۔ اس موقعے پر مولانا مرحوم کی حیات و خدمات اور یونیورسٹی کی کارکردگی پر مبنی ایک یادگاری مجلے کی اشاعت کی گئی جس کا اجرا عزت مآب گورنر کے ہاتھوں ہوا۔ 2 جنوری کو مولانا کا یوم وفات ہے اور اسی مناسبت سے ان کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کے ایصال ثواب کے لیے اس اہم نشست کا انعقاد کیا گیا ہے۔

روز نامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 3 جنوری 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

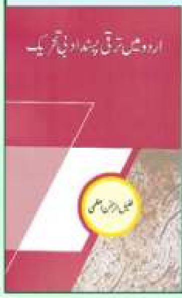

مصنف: خلیل الرحمن اعظمی

صفحات: 410

قیمت: 185 روپے

نو آبادیات اور علاحدگی پسندی کی مزاحمت مظفر پور کے مسلمان 1857 کے بعد

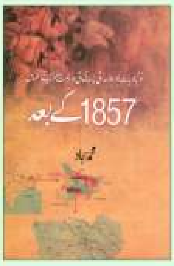

مصنف: محمد سجاد، مترجم: نریش ندیم

صفحات: 333

قیمت: 160 روپے

متوازن غذا اور صحت

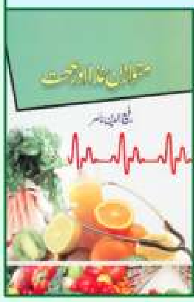

مصنف: رفیع الدین ناصر

صفحات: 194

قیمت: 115 روپے

ملا رموزی

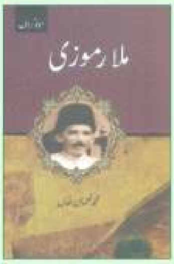

مصنف: محمد نعمان خاں

صفحات: 128

قیمت: 80 روپے

سید امتیاز علی تاج

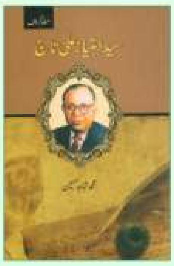

مصنف: محمد شاہد حسین

صفحات: 136

قیمت: 80 روپے

عصمت جاوید

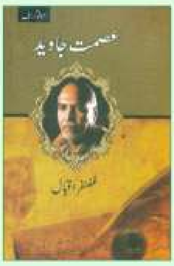

مصنف: غضنفر اقبال

صفحات: 102

قیمت: 68 روپے

غواصی

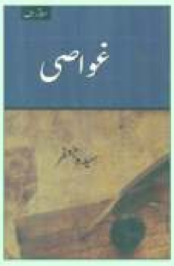

مصنف: سیدہ جعفر

صفحات: 140

قیمت: 82 روپے

ریاض خیر آبادی

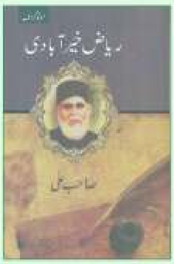

مصنف: صاحب علی

صفحات: 115

قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، sales@ncpul.in, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

URDU DUNIYA Monthly, February-2019, Vol.21, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2019
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025